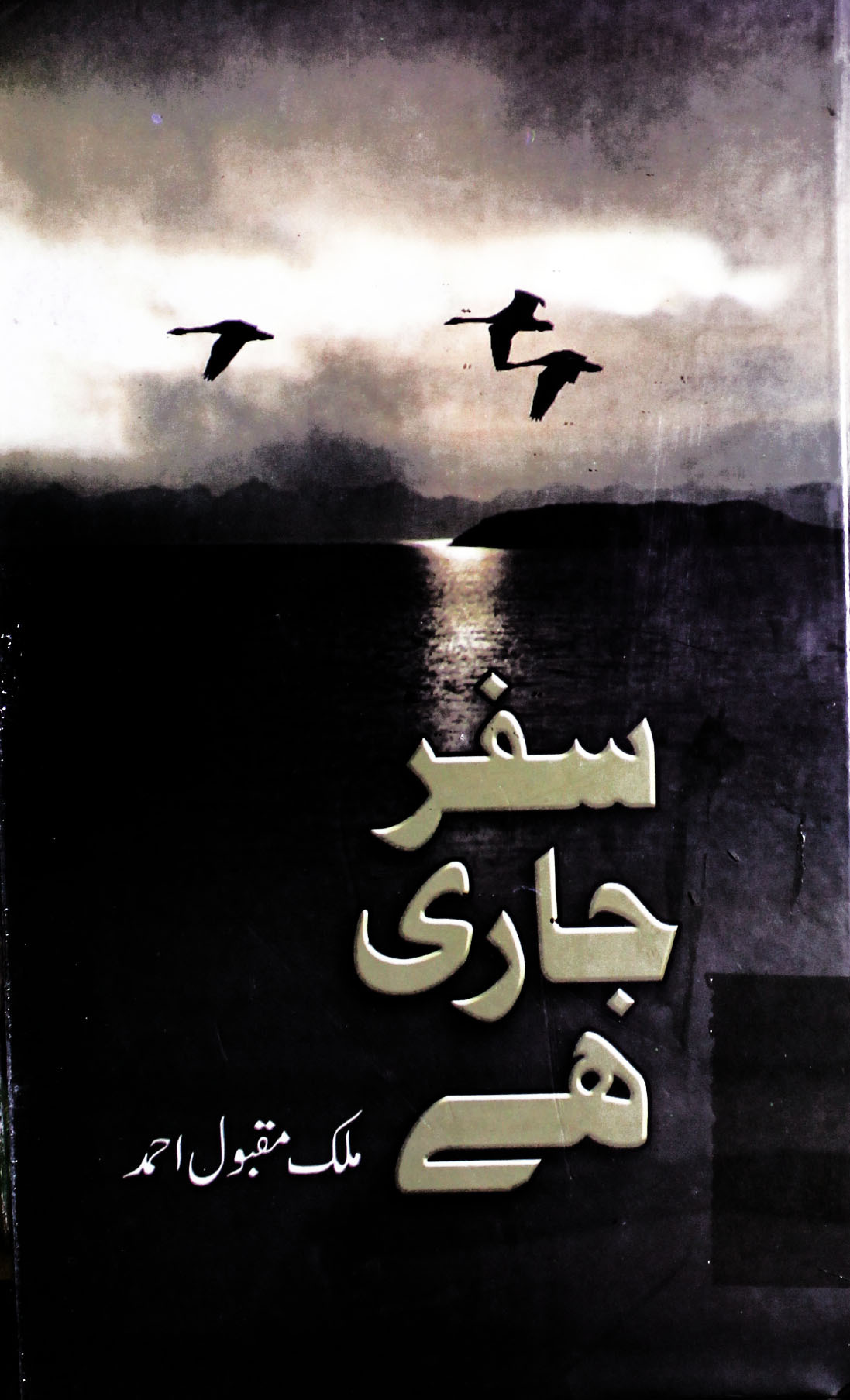

سفر جاری ھے
ملک مقبول احمد

Marfat.com

سفر جاری ہے

خود نوشت

ملک مقبول احمد

مقبول اکیڈمی

Marfat.com

102367

© جملہ حقوق محفوظ

اشاعتِ اوّل ـــ جنوری 2007ء
اشاعت دوم ـــ جنوری 2008ء
اشاعت سوم ـــ مارچ 2011ء
اہتمام ـــ ڈاکٹر ارشد مقبول
ناشر ـــ مقبول اکیڈمی
مطبع ـــ خورشید مقبول پریس
قیمت ـــ چھ سو روپے
ISBN-969-510-307-3

SHOWROOMS

MAQBOOL ACADEMY

- Chowk Urdu Bazar, Circular Road, Lahore.
- 10-Dayal Singh Mansion, The Mall, Lahore.

MAQBOOL BOOKS

- Link Road, Model Town, Lahore.
- 14-Pak Block, Main Road, Allama Iqbal Town, Lahore.
- Siddique Trade Centre, Gulberg, Lahore.

Marfat.com

اپنی "بے جی" کے نام

جن کی دُعاؤں سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بے حد
فضل وکرم اور لطف وعنایت سے مجھے وہ مقام اور
کامرانی عطا کی جس کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں
کیا تھا۔

اور

اپنے "اباجی" کے نام

جن کی محبت اور پیار نے ہر مشکل
وقت میں مجھے سہارا دیا

Marfat.com

Marfat.com

شہرہ آفاق فلسفی

ژاں ژاک روسو نے اپنی آپ بیتی میں کہا

''میں نے ایک ایسے کام کا آغاز کیا ہے جو اس سے قبل کسی نے نہیں کیا۔ اور اس کام کی تکمیل کے بعد اس کی تقلید کرنا ممکن نہ ہوگا۔ میں اس دنیائے فانی کے سامنے ایک ایسے انسان کو پیش کرنا چاہتا ہوں جو فطرت خلقی کا مظہر ہو اور وہ انسان میں خود ہوں............

میں نے ہر وہ بات جو کہ قابل تعریف یا قابلِ اعتراض تھی پوری آزادی اور سچائی سے بیان کی ہے۔ نہ میں نے کوئی جرم چھپایا ہے اور نہ ہی اپنے آپ میں کسی خوبی کا اضافہ کیا ہے...... میں جیسا تھا خود کو دوسروں پر ویسا ہی ظاہر کیا۔ کبھی حقیر، ذلیل اور کبھی بہت نیک، فیاض اور (ان سے) برتر۔ اگر چہ لافانی طاقت میرے پوشیدہ رازوں سے واقف ہے۔''

(''اعترافات'' مترجمہ امجد علی بھٹی سے اقتباس)

Marfat.com

Marfat.com

ترتیب

پیش لفظ		11
دیباچہ		15
ایک ادبی دستاویز	ڈاکٹر صفدر محمود	17
ایک دلچسپ خودنوشت	علی سفیان آفاقی	19
عرض سدید	ڈاکٹر انور سدید	23
سادگی و پُرکاری	ڈاکٹر طارق عزیز	29
ایک رومان پرور ادیب	اے حمید	33
شعیب نامہ	شعیب بن عزیز	35
ایک بڑا معتبر ادارہ	طارق اسمٰعیل ساگر	37
تقریظ	سید واجد رضوی	39
ایک مقبول بارگاہ شخصیت	ابوالامتیاز ع س مسلم	41
ادب کی شمع فروزاں	قاضی ذوالفقار احمد	45
خلوص کا روشن چراغ	قمر نقوی	47
ایک تاثر	ڈاکٹر اللہ بخش	49
کتاب اور اس کا تعارف		51
میری زندگی حقیقت		57
بچپن اور لڑکپن		61
وہ سنہرا زمانہ		71
تعلیمی سرگرمیاں		81
میں اُستاد بن گیا		91

Marfat.com

ازدواجی زندگی	99
لاہور آمد	107
کاروباری تجربے	119
ارادوں کی بلندی	127
درِ رحمت کھلا	137
نظرِ بد دور	149
سفر سعادت	159
دربارِ نبیؐ میں حاضری	167
چند حادثے زندگی کے	173
چند مصنفین کا تذکرہ	187
خواتین قلمی معاونین	221
وکھری ٹائپ کے لوگ	236
ناشرین اور الزامات	245
ذکر کچھ افسران کا	249
مشاہیر اور اعلیٰ حکام کے خطوط	257
تندرستی ہزار نعمت ہے	271
حرفِ آخر	280
تبصرے	283
انٹرویوز	357
مشاہیر کی آراء	383

☆☆☆

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

پیش لفظ

دادا کو پوتا اپنے بیٹے سے پیارا ہوتا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ پوتا پوتی ماں باپ سے پٹنے یا ڈانٹ کھانے کے بعد دادا دادی کی طرف ہی لپکتے ہیں۔ دادا دادی عمر رسیدگی کی وجہ سے جب اپنی اولاد کو کھلونے سمجھ کر ان سے کھیل نہیں سکتے یا جب ان کی اولاد اپنی زندگی کی مصروفیات کی وجہ سے ماں باپ کو وقت نہیں دے سکتی تو اُن کی توجہ کا ارتکاز پوتے پوتیوں کی طرف ہو جاتا ہے۔ یعنی ان کی دوستی اور محبت کا مرکز اپنے بچوں کی اولاد ہو جاتا ہے۔ وہ انہیں اٹھائے اٹھائے یا انگلی لگائے لگائے ہر جگہ پھرتے نظر آتے ہیں۔

ایک انسان ہونے کے ناتے سے میرا بھی یہی حال ہے لیکن محاورے کے برعکس میں پوتے پوتیوں کے ساتھ نواسیوں کی محبت کا بھی اسیر ہوں۔ میری اہلیہ کا بھی یہی حال ہے لیکن میں یہاں بات صرف اپنی کر رہا ہوں۔ میرا پوتا بابر مقبول میرا بہت اچھا دوست ہے۔ جب بھی میری اور اس کی ملاقات ہوتی ہے تو سب سے پہلے پوچھتا ہے: ''دادا ابو! آپ اَپ سیٹ ہیں''؟ خدا اسے خوش رکھے وہ میری زندگی سے خاصی دلچسپی رکھتا ہے۔ اور اکثر مجھ سے مختلف النوع جستجو یانہ سوالات بھی کرتا رہتا ہے۔ وہ کتابوں کے کاروبار سے بھی متاثر ہے اور پوچھتا ہے کہ میں نے کتابیں شائع کرنے کا کام کب شروع کیا؟ یہ کام کرنے کا خیال میرے ذہن میں کیسے آیا؟۔ اسلامی سن ہجری ''چودھویں صدی'' کے نام سے میگزین نکالنے کا خیال کس طرح آیا؟ آپ پیدا دیہات میں ہوئے اور پلے بڑھے دیہات میں پھر شہری زندگی کیوں اختیار کی؟ وغیرہ وغیرہ۔

Marfat.com

میں اس کے سوالات کے جوابات دیتا ہوں۔ تو وہ حیرت زدہ رہ جاتا ہے اور مجھے کہتا ہے: آپ اپنی زندگی کی ساری کہانی ایک کتاب کی صورت میں لکھیں۔ میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں ''یار! میں کوئی ادیب یا قلم کار نہیں ہوں۔ مجھے لکھنے کا فن بھی نہیں آتا''۔ وہ بھولپن سے کہتا ہے: '' آپ لکھنے کا فن سیکھ لیں''۔ میں ہنستا ہوں تو بتاتا ہے: دادا ابو! انسان ساری عمر طالب علم رہتا ہے۔ ہمارے نبی پاک ﷺ کا فرمان بھی ہے۔ ''گود سے گور تک علم کے طالب رہو۔'' میرا پوتا جو کچھ کہتا ہے، وہی مجھے کچھ دوستوں نے بھی کہا ہے کہ میں اپنی زندگی کے حالات لکھوں اپنے دوستوں کے ارشاد کی تعمیل اور اپنے بچوں کو خوش کرنے کے لئے میں نے بھی اپنی زندگی کی عبارت پڑھنے اور اسے کاغذ پر لکھنے کی کوشش کی ہے لیکن اب یہ خواہش بھی میرے پیش نظر معلوم ہوتی ہے

ہمارا نام بھی رکھے فسانہ خوابوں میں
کہ ہم بھی اپنے سوانح نگار گزرے ہیں

اس بات کا ذکر میں نے گھر میں دوسرے افراد سے کیا تو میری نواسی ماریہ کو بے حد خوشی ہوئی۔ اس نے مطالبہ کیا کہ میں اپنی کہانی اپنی زبانی لکھنے میں دیر نہ کروں۔ پھر یوں ہوا کہ ہر دوسرے تیسرے روز میرے پوتے پوتیاں اور نواسیاں حیرت کا اظہار کرنے لگیں..... ''دادا جان! ابھی تک آپ کی کہانی مکمل نہیں ہوئی؟'' میری نواسی بینا بھارتی فلم ''باغبان'' سے متاثر ہے۔ وہ پوچھتی ''دادا ابا آپ کی کتاب ''باغبان'' کا کیا بنا؟

ایک ناشر ہونے کے ناتے اپنی زندگی میں بے شمار مصنفین سے واسطہ پڑتا رہا۔ دراصل یہ سب میری زندگی کی کہانی میں شامل ہیں یا یوں کہیے کہ میری زندگی ان سب دوستوں کے ساتھ گزرے ہوئے وقت سے عبارت ہے۔ اس کتاب میں بھی ان کے ساتھ ہی مجلس آرائی کر رہا ہوں۔ میں نے جن محترم شاعروں، ادیبوں اور مصنفین کا ذکر کیا ہے ان کے متعلق پوری دیانتداری سے لکھا ہے۔ تاہم عجز بیان کی بنا پر اگر کسی دوست کو میرے محتاط الفاظ کے پس منظر میں

Marfat.com

اپنا کوئی اور رُخ نظر آئے تو میں اُن سے معذرت خواہ ہوں۔ مجھے اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں جو کچھ بھی معلوم تھا میں نے اسے بلا کم و کاست لکھنے کی کوشش کی ہے۔ اپنی کاروباری زندگی میں مجھے جو مراحل پیش آئے اور ان مراحل میں میرے ساتھ جو سلوک میرے کاروباری دوستوں، رشتہ داروں، دوستوں اور متعلقہ افسروں نے کیا ان کا ذکر میں نے ''خیال خاطرِ احباب'' کے تحت نہیں کیا' میں نے آبگینوں کو حتی المقدور ٹھیس نہیں لگنے دی اور میر انیس کا یہ شعر پیش نظر رکھا:

خیالِ خاطر احباب چاہیے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

اب میں اپنی زندگی کا ''اعمال نامہ'' آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

ملک مقبول احمد

☆☆..........☆..........☆☆

Marfat.com

Marfat.com

دیباچہ

میں نے ''سفر جاری ہے'' اپنے بچوں کے اصرار اور ان کی خوشی کے لئے لکھی تو اس کی تکمیل کے دوران اپنے کئی کرم فرماؤں جن میں ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر طارق عزیز، اظہر جاوید اور محترم علی سفیان آفاقی خاص طور پر قابل ذکر ہیں سے مشورہ بھی کیا اور ان کی تجاویز کو عملی جامہ پہنایا تو یہ خودنوشت جو صرف دو سو صفحات پر مشتمل تھی، پھیل کر ایک ضخیم کتاب بن گئی اور اس کتاب کی پذیرائی وسیع پیمانے پر ہوئی اور بیشتر نامور مصنفین اور دانشوروں سے مجھے تعارف حاصل ہوا۔

ایک ناشر کی یہ آپ بیتی شاید لوگوں کو اس لئے حیران کر گئی کہ اس ملک کے قلمکاروں نے ناشر کی دیانت پر کبھی اعتبار نہیں کیا اور اسے ہمیشہ شکوک وشبہات کی نظر سے دیکھا۔ مجھے اس وقت بے حد خوشی نصیب ہوئی جب ڈاکٹر صفدر محمود، علی سفیان آفاقی، اے حمید، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر طارق عزیز، شعیب بن عزیز، طارق اسماعیل ساگر، سید واجد رضوی، ابوالامتیاز ع۔س مسلم، قاضی ذوالفقار احمد، قمر نقوی نقشبند اور ڈاکٹر اللہ بخش ملک نے اس کتاب کے پیش الفاظ لکھے اور میری محنت و دیانت کی شہادت عطا فرمائی۔

''سفر جاری ہے'' جنوری ۲۰۰۷ء میں شائع ہوئی اور اس نے قبول عام حاصل کیا تو یہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور میرے والدین کی دعاؤں کا نتیجہ ہے اور اس میں ان دانشوروں کا حصہ بھی شامل ہے جن کی کتابیں میں نے مقبول اکیڈمی سے شائع کیں۔ اس کتاب نے پاکستان اور بیرون ملک کے متعدد ادیبوں کو متاثر کیا اور ان کے قیمتی تبصروں پر

Marfat.com

مشتمل ایک نئی کتاب ''پذیرائی'' معرضِ وجود میں آ گئی۔ پروفیسر جمیل آذر نے اس میں اپنی آپ بیتی کے نقوش دیکھے اور ایک کتاب ''راہ نوردِ شوق'' تالیف کی ''سفر جاری ہے'' پر دوستوں اور کرم فرماؤں کی حوصلہ افزا آرا اور اخبارات و رسائل کے خوبصورت تبصروں پر مشتمل مزید دو کتابیں ''شناسائی'' اور ''اہل قلم کے خطوط'' کے نام سے الگ پیش کی جا رہی ہیں۔

باعث افتخار یہ بات بھی ہے کہ مصنفین اور کتابوں کی لمبی معیت نے میرے دل میں بھی ادب کی ایک چھوٹی سی قندیل جلا دی ہے، جسے میں روشن رکھنے کا آرزومند ہوں۔ میری خودنوشت ''سفر جاری ہے'' پر بیش قیمت علمی ادبی تاثرات کے ساتھ بے شمار اہل علم اور اہل ادب نے میرا حوصلہ بڑھایا اس مقبول نوازی کے لئے میں آپ سب کا ممنون احسان ہوں۔

''سفر جاری ہے'' کا یہ نیا ایڈیشن ترمیم و اضافہ کے ساتھ پیش خدمت ہے، مجھے توقع ہے کہ اس کتاب کی نئی صورت کو بھی آپ شرفِ پذیرائی عنایت کریں گے اور اسے قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ شکریہ

آپ کا نیازمند

ملک مقبول احمد

Marfat.com

ڈاکٹر صفدر محمود

ایک ادبی دستاویز

میں تو ملک مقبول احمد صاحب کو صرف ایک شریف النفس انسان اور ایک معروف اشاعتی ادارے کے مالک کی حیثیت سے ہی جانتا تھا لیکن اُن کی خودنوشت سوانح عمری کے مسودے کی ورق گردانی کی تو یہ راز کھلا کہ ملک صاحب صرف کتابیں چھاپتے ہی نہیں بلکہ کتابیں اُن کے اندر بھی بستی ہیں اور وہ پبلشر ہونے کے باوجود کتابوں سے محبت کرتے ہیں۔ دراصل اسی محبت کی ایک اہم کڑی اُن کی یہ کتابِ زیست ہے جو گوناگوں تجربات، حوادث اور مشاہدات سے بجی ہوئی ہے۔ اُن کا اسلوب نہایت دلچسپ ہے، اُن کے زبان و بیان اور طرزِ تحریر پر ادبی رنگ غالب ہے جو اُن کے اعلیٰ ادبی ذوق کی عکاسی کرتا ہے۔ اس حوالے سے یہ کتاب سوانح عمریوں میں ایک اہم اضافہ ہے۔ ''سفر جاری ہے'' ملک صاحب کی زندگی کے سفر کی کہانی ہے۔ اُن کے اس سفر کا اولین حصہ دیہات میں گزرا جہاں ہر طرف محبت و اخلاص اور ''بےفکری'' کے سدابہار پھول کھلتے ہیں۔ اسی سفر کے دوران ملک مقبول احمد صاحب کو زندگی کی سنگلاخ وادیوں اور چٹیل میدانوں سے بھی گزرنا پڑا۔ لیکن اللہ کے فضل و کرم اپنی محنت لگن اور حسن سلوک سے وہ جلد ہی اپنا مقام پیدا کرنے اور بطور پبلشر اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانے میں کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جہاں اُن کو مادی دولت سے نوازا، وہاں نیک نامی کی دولت سے بھی مالا مال کر دیا ورنہ پبلشنگ کے میدان میں ایسا خال خال ہی ہوتا ہے۔ خود ملک صاحب نے بھی اپنی خودنوشت میں ایسے تجربات کا ذکر کیا ہے جو مصنف اور ناشر کے تعلقات میں بدگمانیوں کو جنم دیتے ہیں۔

Marfat.com

زندگی کے اس سفر کے دوران ملک صاحب کو بہت سے معروف اور ممتاز لکھاریوں، شاعروں اور ادیبوں سے ملنے اور اُن کی کتابیں چھاپنے کا اتفاق ہوا جن کا ذکر ملک صاحب نے بڑی محبت سے اس کتاب میں کیا ہے۔ کچھ نامور ادیب ملک صاحب کے "حلقہ یاراں" میں شامل ہو گئے جن کے خطوط اس کتاب کا اہم حصہ ہیں اور انہوں نے "سفر جاری ہے" کو ایک غیر معمولی ادبی دستاویز کی حیثیت دے دی ہے۔

ملک مقبول احمد صاحب نے کتابیں چھاپنے کے ساتھ ساتھ کتاب لکھنے کی ایک نئی روایت کی بنا رکھی ہے جو نہایت حوصلہ افزا ہے۔ اسے جاری و ساری رہنا چاہیے۔

صفدر محمود

Marfat.com

علی سفیان آفاقی

ایک دلچسپ خودنوشت

ملک مقبول احمد کو ہم ایک بہت اچھے ناشر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔اپنی خودنوشت تحریر کر کے انہوں نے ہمیں اپنی زندگی کے دلچسپ اور معلومات آفرین واقعات سے روشناس کرایا ہے۔ایک اچھا ناشر وہی کہلاتا ہے جس کا مطالعہ اور مشاہدہ بہت گہرا ہو اور وہ انسانی نفسیات پر بھی عبور رکھتا ہو۔ایک اچھی کتاب مصنف کی مرہون منت ہوتی ہے جسے قاری تک پہنچانے میں دیگر افراد بھی حصہ لیتے ہیں لیکن ان کا سرخیل پبلشر ہوتا ہے۔ وہی کتاب کے موضوع اور مصنف کا انتخاب کرتا ہے،اس کے کاروباری پہلوؤں کا جائزہ لیتا ہے اور پھر اپنی بساط کے مطابق اسے بہترین انداز میں قاری تک پہنچاتا ہے۔

ملک مقبول احمد مُلک کے ایک ممتاز اور معروف ناشر ہیں۔ان کا ادارہ مقبول اکیڈمی اپنی کتب کے حوالے سے سارے ملک میں شہرت رکھتا ہے۔اس کامیابی اور مقبولیت کے پیچھے صرف ایک شخصیت کا ہاتھ ہے اور وہ ہے ملک مقبول احمد۔انہوں نے اپنے پیش لفظ میں بھی اور کتاب میں بھی جابجا یہ اعتراف کیا ہے کہ ناساعد حالات کے باعث وہ اعلیٰ نصابی تعلیم سے محروم رہے لیکن کتاب کے مطالعے کے بعد ان کا یہ عذر محض انکسار ہی معلوم ہوتا ہے۔ان کی تحریر سلجھی ہوئی، شستہ اور رواں ہے۔ جابجا ان کے گہرے مطالعے اور مشاہدے کے ثبوت نظر آتے ہیں۔ انہوں نے نصابی تعلیم کی کمی کو اپنی راہ میں حائل نہیں ہونے دیا۔اس شعبے اور پیشے میں کامیابی اور شہرت حاصل کی جس کا تعلق علم وادب سے ہے۔دنیا بھر میں اور خود اُردو کے ادیبوں اور شاعروں

Marfat.com

میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ ایک باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کرنے والا شخص اپنی خداداد صلاحیت، محنت، شوق اور مطالعے کی وجہ سے نامور ادیب یا شاعر ٹھہرا اور اُردو ادب کی تاریخ میں اپنا نام درج کر کے دنیا سے رخصت ہوا۔ جناب احسان دانش کی مثال اس بارے میں ہمارے سامنے ہے۔ ایک گمنام مقام پر غربت وافلاس میں پیدا ہونے والے اس شخص کی رسائی سکول اور کالج تک نہ ہو سکی لیکن اس کے شوقِ مطالعہ اور لگن نے اسے راتوں کو سڑکوں پر نصب بجلی کے کھمبے کے نیچے بیٹھ کر مطالعہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ وہ دن میں محنت مزدوری کرتے لیکن فارغ وقت مطالعے کی نذر کر دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شخص جس نے پنجاب یونیورسٹی کی عمارت میں اینٹیں ڈھونے کی مزدوری کی تھی ایک وقت ایک دانشور اور معروف و ممتاز شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوا۔ جس یونیورسٹی کی عمارت کی تعمیر کے لئے وہ اینٹیں ڈھونے کی مزدوری کرتا رہا تھا آج اسی یونیورسٹی میں اسکی تحریر کردہ تصانیف اعلیٰ درجوں کے نصاب میں شامل ہیں۔ احسان دانش نے کبھی ''پدرم سلطان بود'' کا نعرہ نہیں بلند کیا اور نہ ہی اپنی زندگی کے ناخوشگوار پیریڈ کی پردہ پوشی کی۔ وہ بہت فخر کے ساتھ اپنی غربت، مجبوری اور تعلیم سے محرومی کا ذکر کرتے رہے اور یہ ہے بھی باعث فخر بات۔

ملک مقبول احمد صاحب اور مرحوم احسان دانش میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں۔ ملک صاحب نے محنت مزدوری تو نہیں کی لیکن ابتدائی زندگی میں بہت کٹھن مراحل سے گذرے۔ باقاعدہ تعلیم سے محروم رہے لیکن ان کے اندر کا تخلیق کار انہیں ہر مرحلے پر سہارا دیتا رہا۔ اپنی زندگی کی جدوجہد اور کشمکش کی روداد انہوں نے بلا کم وکاست بڑے دھڑلے سے بیان کی ہے۔ کسی جگہ بھی انہیں احساس کمتری نہ ہوا، نہ ہی کوئی رکاوٹ ان کی راہ میں حائل ہوئی۔ وہ زندگی کے سفر میں اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت قدم بقدم آگے بڑھتے رہے۔ اس دوران میں پیش آنے والی ذاتی مشکلات اور ان سے عہدہ براہ ہونے کی داستان بھی انہوں نے بہت دلچسپ انداز میں بیان کی ہے۔ یہ ایک شخص کے پتھر سے ہیرا بننے کی کہانی ہے جو خدا کی مہربانی کا ہر سانس کے ساتھ شکر ادا کرتا ہے اور آج ایک کامیاب مطمئن اور خوش باش انسان کی طرح زندگی بسر کر رہا ہے۔ نئے

Marfat.com

نئے تجربات کرنے کا جذبہ آج بھی اس شدت کے ساتھ موجود ہے اور وہ اللہ کے بھروسے پر نئے نئے منصوبے بنانے میں مصروف ہے۔

اس خودنوشت کا ہر صفحہ ملک صاحب کے شوقِ جستجو، محنت و لگن اور سادگی کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ انہوں نے اپنی شخصیت کا کوئی بھی پہلو چھپا کر نہیں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ خودنوشت کے خاتمے پر قاری اپنے تجربے اور مشاہدے میں بہت کچھ اضافہ کر کے کتاب بند کرتا ہے۔ انہوں نے زندگی کے اہم واقعات اور زندگی میں داخل ہونے والی شخصیات کا تفصیلی خاکہ پیش کر دیا ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد ایک محنتی، ان تھک، خدا ترس اور انسان دوست شخص کی تصویر اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ جا بجا انہوں نے اپنی تحریر کو برمحل اُردو اور فارسی اشعار سے سجایا ہے، جو اس کے لطف میں مزید اضافہ کرنے کا باعث ہے۔ اپنی زندگی میں پیش آنے والے چھوٹے بڑے تمام واقعات انہوں نے سادگی سے بیان کر دیئے ہیں۔ انہوں نے جن مصنفین کے ساتھ کام کیا، ان کی جملہ خوبیوں اور کمزوریوں کو بھی بلا جھجک بیان کر دیا ہے۔ مختلف نامور شخصیات کے بارے میں ان کے مشاہدات اور تاثرات دلچسپ اور معلومات آفرین ہیں۔ خودنوشت کا ہر صفحہ ان کے کثرت مطالعہ و مشاہدہ کا آئینہ دار ہے۔ کوئی اہم اور قابل ذکر واقعہ، وہ خوشگوار ہو یا ناخوشگوار، انہوں نے پوشیدہ نہیں رکھا اور یہی اس خودنوشت کا حسن ہے۔ انہوں نے اپنی کم علمی اور محرومیوں کا آغاز ہی میں تذکرہ کر دیا ہے لیکن قاری کو ان صفحات میں ایک صاحب علم و مشاہدہ شخص جلوہ گر نظر آتا ہے۔

ملک صاحب ایک منکسر المزاج، سادہ دل، خدا ترس اور محبت کرنے والے انسان ہیں۔ انہوں نے اپنی والدہ محترمہ، بچوں، نواسیوں، پوتے پوتیوں، رشتے داروں اور واقف کاروں سے ٹوٹ کر محبت کی ہے جس کا اظہار انہوں نے بلا تکلف کر دیا ہے۔ یہ سادگی پرکاری ہی اس خودنوشت کی خوبی ہے۔

انہوں نے اپنے تجربات کے ساتھ ساتھ کاروباری گُر بھی بیان کئے ہیں۔ اپنی زندگی کے تمام اہم واقعات کو بیان کرنا ضروری سمجھا ہے۔ یہاں تک کہ صحت و تندرستی کے بارے میں بھی

Marfat.com

اپنے ذاتی تجربات کا حوالہ دیا ہے۔ایک زمانے میں ان کا جسم فربہ تھا، بیسیوں بیماریوں کا شکار تھے لیکن پھر انہوں نے اپنی بیماریوں کا علاج خود ہی پانی کے ذریعے کیا، نتیجہ یہ ہے کہ سالہا سال گزر جانے کے بعد آج بھی وہ دبلے پتلے، مستعد، اور چاق و چوبند انسان ہیں جنہیں سالہا سال سے نزلہ زکام جیسی معمولی اور عام بیماری بھی نہیں ہوئی۔اپنے دیگر تجربات کے علاوہ اپنے دوستوں اور ملاقاتیوں کو بلا تامل اس علاج کا مشورہ دیتے ہیں لیکن اس سلسلے میں کئی سخت مقام بھی آتے ہیں جس کی وجہ سے لوگ ہمت ہار دیتے ہیں۔

چند ابتدائی ملاقاتوں کے بعد انہوں نے مجھے اور میری بیگم کو بھی اس طریقہ علاج کو اپنانے کا مشورہ دیا لیکن اس کے لئے جس باقاعدگی، پابندی اور تحمل و برداشت کی ضرورت ہے اس سے محروم ہونے کی وجہ سے ہم استفادہ نہ کر سکے اور نہ ہی بیماریوں سے نجات حاصل کر سکے۔

ملک صاحب نے اپنے گاؤں کی سادہ اور بےفکر زندگی، بچپن اور لڑکپن کی دلچسپیوں کا بھی تذکرہ کیا ہے جس سے اس دور کی ایک رنگین تصویر قاری کے سامنے آجاتی ہے اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ واقعات اسکی زندگی میں کیوں پیش نہیں آئے؟ یہ ملک صاحب کے قلم اور انداز تحریر کا اعجاز ہے۔

ملک صاحب کو اپنی والدہ سے نہایت محبت اور عقیدت ہے۔بچوں اور ان کے بچوں سے بھی ان کی وابستگی پوشیدہ نہیں رہتی۔ دراصل یہ خودنوشت انہوں نے اپنے پوتے، پوتیوں اور نواسیوں کی فرمائش بلکہ ''پرزور اصرار'' پر ہی سپرد قلم کی ہے جن کی فرمائش تھی کہ وہ اپنی زندگی کی داستان لکھیں اور وہ مسلسل تقاضے کرتے رہتے تھے کہ ''کیا ابھی تک آپ کی سٹوری مکمل نہیں ہوئی؟''

اس دلچسپ اور معلومات انگیز خودنوشت کے لئے قارئین کو ان کے پوتے پوتیوں اور نواسیوں کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ ورنہ شاید ملک صاحب پرانے زمانے کے حکماء کی طرح اس داستان کو بھی ایک راز کی طرح اپنے ساتھ ہی لے جاتے اور ہم اس دلچسپ خودنوشت کے مطالعے سے محروم ہی رہ جاتے۔

علی سفیان آفاقی

102367

Marfat.com

ڈاکٹر انور سدید

عرضِ سدید

میرے خیال میں ہر شخص کی زندگی ایک افسانہ ہوتی ہے۔ جس کی داخلی کیفیات کو وہی شخص جانتا ہے جس نے وہ زندگی بسر کی ہے۔ تاہم بعض لوگ اپنے گزرے ہوئے دنوں کو تنہائی میں یاد کرتے ہیں تو اپنے عزیز و اقربا اور دوستوں کے علاوہ بعض اوقات عام لوگوں کو بھی اپنی زندگی کے واقعات سنانے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے "آپ بیتی" اپنی زندگی کے گزرے ہوئے لمحات کو بازیافت کرنے اور حالات و واقعات کی تجدید کے لئے ماضی کے نقوشِ پا پر دوبارہ سفر کرنے کا نام ہے۔ اور موضوع چونکہ اپنی ذات ہوتا ہے اس لئے حقیقی کمزوریوں اور ناکامیوں کو چھپانے اور سچے واقعات کی اپنی مرضی کے مطابق صورت گری کرنے اور لفظی تصویر کو مرغوبِ نظر بنانے کی کوشش بھی بعید از قیاس نہیں۔ اُردو ادب کے بزرگ دانشور ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے:۔

> "ایک سوانح نگار اپنے ہیرو کا جج بن سکتا ہے اس کی کمزوریوں کا شمار بھی کر سکتا ہے لیکن آپ بیتی میں اپنی محبت اور دوسروں کا خوف ہر وقت دامن گیر رہتا ہے۔ وہ نہ اپنے گناہوں کی صحیح تصویر پیش کر سکتا ہے اور نہ اپنا صحیح جج بن سکتا ہے۔ "آپ بیتی" میں "اگر گویم زبان سوزد" کی عقوبت ہر ہر گام پر زنجیر پا بن جاتی ہے۔ تو سچ کہنا بھی مشکل ہے مگر اپنے متعلق سچ کہنا دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔"

متعدد آپ بیتیوں کا مطالعہ کرنے اور ان پر تحقیقی و تنقیدی مقالہ لکھنے کے بعد ممتاز محقق

Marfat.com

مشفق خواجہ (مرحوم) نے کہا:

''آپ بیتی کو یادوں اور یادداشتوں کا مجموعہ کہا جاتا ہے لیکن آپ بیتی میں یادوں اور یادداشتوں کی ترمیم شدہ یا حسب منشا صورت ہی نظر آتی ہے۔ حافظہ اوّل تو کام نہیں کرتا اور اگر کرتا ہے تو مصنف کی مرضی کے مطابق مواد فراہم کرتا ہے۔ اس لیے آپ بیتیوں میں ایسے واقعات بھی شامل ہو جاتے ہیں جن کے وقوع پذیر ہونے کا امکان ماضی میں تو کیا مستقبل میں بھی نہیں ہوتا..........

آپ بیتی اس لیے نہیں لکھی جاتی کہ لکھنے والے کو کچھ کہنا ہوتا ہے بلکہ اس لیے لکھی جاتی ہے کہ لکھنے والا بہت کچھ چھپانا چاہتا ہے اور بہت سے حقائق پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے۔''

اُردو اور انگریزی کتابوں کے مشہور ناشر اور مقبول اکیڈمی کے بانی ملک مقبول احمد نے مجھے بتایا کہ انہوں نے اپنی زندگی کے گزرے ہوئے واقعات کو اپنے قلم سے لکھ لیا ہے تو مجھے بڑی حیرت ہوئی وجہ یہ کہ ملک صاحب کتابیں چھاپنے کا اعلیٰ معیار قائم کر چکے ہیں، ان کی شائع کردہ کتابیں ان کے جمالیاتی ذوق کی آئینہ دار ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ پیشہ ور مصنف نہیں، اپنی زندگی کے واقعات کو یاد کرنا تو شاید مشکل نہیں لیکن انہیں اس طرح قلم بند کرنا کہ ان واقعات میں دوسروں کی دلچسپی کا سامان بھی پیدا ہو جائے، آسان کام نہیں بلکہ ایک اعلیٰ پائے کی معیاری کتاب لکھنے کے لیے لمبے اور مسلسل ریاض کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے اس وقت حمیدہ اختر حسین رائے پوری کی آپ بیتی ''ہم سفر'' یاد آئی جو مصنفہ نے اس حقیقت کے باوجود کہ وہ ایک بڑے ادیب کی خانہ دار شریکِ حیات تھیں اور کبھی ایک ادبی سطر لکھنے کی کوشش تک نہیں کی تھی، ڈاکٹر جمیل جالبی کی فرمائش پر آپ بیتی لکھنے پر آمادہ ہو گئیں اور اُردو ادب کو ایک ایسی آپ بیتی عطا کر دی جس کی سادگی میں رعنائی تھی۔ جس کے واقعات سچ بولتے تھے اور جس کے حالات اپنے زمانے کا آئینہ تھے۔ اب مجھے احساس ہوا کہ ملک مقبول احمد پیشہ ور مصنف نہیں ہیں لیکن انہوں نے اپنی

Marfat.com

زندگی کا فعال حصہ ادیبوں اور کتابوں کی معیت میں گزارا ہے۔ ان گنت کتابوں کو مسودے، پروف اور طبع شدہ صورت میں پڑھا ہے۔ مصنفین کے ساتھ تبادلۂ خیالات کیا ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے ساتھ کتابوں کے اشاعتی معاملات جو خالصتاً دنیاداری کے معاملات ہیں طے کیے ہیں۔ اس لیے ان کے تجربات حکمرانوں، سیاستدانوں، اور ادیبوں کی بہ نسبت الگ قسم کے ہوں گے اور ان میں دلچسپی کا عنصر بھی ضرور ہوگا۔ چنانچہ میں نے ان کی ''آپ بیتی'' میں دلچسپی ظاہر کی تو انہوں نے مجھ پر اعتماد کیا اور طباعت و اشاعت سے پہلے مجھے پڑھنے کے لیے دے دی۔

آگے بڑھنے سے قبل یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ ملک مقبول احمد سے میرا قاری کا تعلق اس وقت پیدا ہوا تھا، جب انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب ''انڈیا ونز فریڈم'' کا ترجمہ رئیس احمد جعفری کے تجزیے کے ساتھ شائع کیا تھا، ماہنامہ ''قومی ڈائجسٹ'' کی ادارت کے زمانے میں وہ مجیب الرحمان شامی صاحب کو اپنے ادارے کی چھپی ہوئی کتابیں بھیجتے تو مجھے ان پر تبصرے کا اعزاز حاصل ہوتا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دن اظہر جاوید مدیر ماہنامہ ''تخلیق'' میری ''ادبی جھوک'' میں تشریف لائے تو ان کے ساتھ ملک مقبول احمد بھی تھے جو صورت نا آشنا تو تھے لیکن اپنی کتابوں کے حوالے سے میرے لیے اجنبی نہیں تھے۔ یہ میری محرومی تھی کہ ان سے پہلے کبھی ملاقات نہ ہوئی لیکن اب ملاقات ہوئی تو خوشی ہوئی کہ انہیں میرا نام اور میری سب کتابوں کا اچھی طرح علم تھا۔ اعتراف کے طور پر عرض ہے کہ میں پیشہ ور مصنف نہیں ہوں۔ مطالعہ میرا عشق ہے اور لکھنا میرا شوق ہے جو کتاب کی تفہیم میں میری معاونت کرتا ہے۔ کسی ناشر نے پہلی دفعہ میری کتاب چھاپنے میں دلچسپی لی تو اس میں داخلی مسرت کا زاویہ موجود تھا، یہ خوبی ملک مقبول احمد کی ہے کہ انہوں نے ایک خالص کاروباری تعلق کو دوستی کا درجہ دیا اور گزشتہ بیس سال سے اس میں رخنہ نہیں پڑنے دیا۔ انہوں نے جو معاملات پہلے روز اپنے اشاعتی اخلاقیات کے تحت طے کیے، ان کو ہمیشہ قائم رکھا اور حد یہ ہے کہ کسی کتاب کی اشاعت کے لیے مجھے بھی یاددہانی کرانے کی ضرورت

Marfat.com

نہیں پڑی اور طے شدہ رائلٹی ادا کرنے میں انہوں نے کبھی تاخیر سے کام نہیں لیا۔

مجھے یاد ہے کہ ہندوستان کے ممتاز افسانہ نگار جوگندر پال اپنا نیا ناول ''خواب رو'' لے کر پاکستان آئے تو ملک مقبول صاحب نے یہ کتاب میری استدعا پر اشاعت کے لیے قبول کر لی اور ان کی پاکستان میں موجودگی کے دوران نہ صرف چھاپ دی۔ بلکہ جوگندر پال صاحب کو اس کی رائلٹی بھی ادا کر دی۔ اب دہلی سے ان کا خط آتا ہے تو وہ مقبول صاحب کو خیر سگالی کے لیے ضرور لکھتے ہیں۔ میری ضعیفی نے میرے لکھنے کی رفتار مدھم کر دی ہے لیکن مقبول صاحب ایک سال میں کم از کم ایک کتاب شائع کرنے کی پابندی قائم رکھے ہوئے ہیں کہتے ہیں کہ جب تک زندہ ہوں یہ سلسلہ قائم رہے گا میں کبھی تاخیر کر دوں تو ایک ''لفافہ'' میز پر رکھ کر اٹھ جاتے ہیں (سجاد نقوی صاحب نے اس کا ذکر اپنے ایک خاکے ''نرم دمِ گفتگو'' میں بھی کیا ہے اور یہ مجھے کتاب مکمل کرنے کی یاد دہانی کراتا رہتا ہے۔ میں نے کسی اور ناشر کو اس معمول پر باقاعدگی سے عمل کرتے نہیں دیکھا۔

مقبول صاحب کی سوانح عمری میں میری دلچسپی یہ تھی کہ وہ ادیبوں کے بارے میں اپنے تجربات کا اظہار کس طرح کرتے ہیں۔ یہ آپ بیتی میں نے پڑھ لی ہے۔ میرے خیال میں اُردو کے کسی ادبی ناشر کی یہ پہلی آپ بیتی ہے جس میں انہوں نے اپنی زندگی کو انکسار اور صداقت سے پیش کر دیا ہے۔ وہ سکول میں چل نہ سکے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ ان کے والد صاحب انہیں پٹواری بنانا چاہتے تھے۔ لیکن وہ معلّم بن گئے، اور دلچسپ بات یہ ہے کہ سکول بھاگ جانے والے اس طالب علم کے باطن میں ایک رسالے کا مدیر بھی موجود تھا جس نے سکول کی معلّمی کو خیر باد کہا اور لاہور منتقل ہو کر رسالہ ''چودہویں صدی'' جاری کر دیا۔ ناکامی ہوئی تو اشاعتی میدان میں آ گئے۔ اس شعبے کا بھی انہیں تجربہ نہیں تھا لیکن دوسروں کے کام کا مشاہدہ کیا اور اپنی کامیاب راہیں خود ہموار کیں، اب وہ لاہور کے چند بڑے ناشرین میں شمار ہوتے ہیں بلکہ ان کے بچوں نے مقبول بکس کے نام سے لاہور میں کئی ادارے قائم کر لیے ہیں جنہیں ''پبلشنگ ایمپائر'' کا نام

Marfat.com

بھی دیا جا سکتا ہے۔

لمبے عرصے تک میں سمجھتا رہا کہ مقبول صاحب کا جو تعلق میرے ساتھ ہے وہ شاید کسی اور ادیب کے ساتھ نہیں لیکن یہ ''آپ بیتی'' پڑھ کر معلوم ہوا کہ ملک کے بیشتر بڑے بڑے ادیب ملک صاحب کی محبت کے تار سے بندھے ہوئے ہیں، اور جس کو کوئی نفع خور ناشر چھاپنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا اس کی کتاب مقبول اکیڈمی چھاپنے پر تیار نظر آتی ہے۔ یہ کتاب پڑھ کر مجھے محسوس ہوا کہ مقبول صاحب کی زندگی بھی افسانے سے کم نہیں۔ انہیں مشکلات اور حادثات کا سامنا کرنا پڑا لیکن انہوں نے صداقت، دیانت اور امانت کے اصولوں کو قائم رکھا، خود محنت کی اور نتائج خدا پر چھوڑ دیے۔ اس کتاب کا باب ''دوسری ٹائپ کے لوگ'' معاشرے کا حقیقی روپ ہمارے سامنے لاتا ہے لیکن یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مقبول صاحب نے اس قسم کے لوگوں سے روابط کا سلسلہ کس طرح قائم رکھا اور آبگینوں کو ٹھیس لگنے سے کس طرح بچایا۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ''زیب داستان'' سے کام نہیں لیا گیا۔ مقبول صاحب نے اپنے ابتدائی حالات کو سچائی سے پیش کیا ہے۔ اپنی کم علمی کو کمزوری نہیں سمجھا بلکہ مجھے اس کتاب میں یہ کم علمی ان کی شہ زوری نظر آتی ہے اور وہ احساس کمتری میں مبتلا ہونے کی بجائے عزم راسخ اور جستجوئے پیہم کا ثبوت دیتے ہیں ہر جگہ کامیابی ان کا خیر مقدم کرتی ہے۔ اور وہ خدا کے سامنے سربسجود ہو جاتے ہیں۔ اس آپ بیتی سے میری ملاقات ایک ایسے اسلام پسند ناشر سے ہوئی جس نے کتاب کی اشاعت کو ایک مقدس فریضے کے طور پر قبول کر رکھا ہے۔ چنانچہ میرا خیال راسخ ہے کہ

ایں سعادت بزور بازو نیست

انور سدید

☆☆..........☆..........☆☆

Marfat.com

Marfat.com

ڈاکٹر طارق عزیز

سادگی و پُرکاری

عظیم شعراء کا کمال یہ ہے کہ اُن کے اشعار اپنی پہلوداری کی بنا پر متنوع صورتِ احوال، رویوں، نفسیات اور شخصیات پر منطبق ہوتے ہیں۔ اِسی طرح بڑے ادیب کی نشانی یہ ہے کہ اُس کی تحریریں اپنے موضوعات یا فلسفۂ حیات کے اعتبار سے بڑے شعراء سے لگا کھاتی ہیں۔ مثال کے طور پر ملک مقبول احمد کی زیرِ نظر کتاب ''سفر جاری ہے'' ہی کو لے لیجئے احوالِ ذاتی کا بیان اتنا سادہ اور مؤثر ہے کہ بے اختیار غالب کا یہ مصرع یاد آ جاتا ہے۔

سادگی و پُرکاری ، بے خودی و ہشیاری

''سفر جاری ہے'' ملک مقبول احمد کی آپ بیتی ہے۔ ویواز ڈکشنری آف لٹریری ٹرمز میں آپ بیتی کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

> "An account of all or a part of a person's life written by that person usually with publication in mind. Typically, an autobiography takes the form of a continuous NARRATIVE of significant events, in which memory and introspection and even IMAGINATION are blended.
> Although often unrealiable as a record of facts, an autobiography offers unique insight into its author's personality, attitudes and impressions."

Marfat.com

اس پیمانے پر جانچیں تو ''سفر جاری ہے'' آپ بیتی کی مسلمہ تعریف پر پورا اترتی ہے ''سفر جاری ہے'' ملک مقبول احمد کے بچپن سے لے کر موجودہ عمر (اللہ تعالیٰ انہیں صحت وتندرستی کے ساتھ طویل عمر عطا کرے، آمین) تک کی زندگی کے احوال، یاد آفریں واقعات اور تلخ وشیریں تجربات کے بیان پر مشتمل ہے۔ کتاب کا اہم ترین حصہ اُس عرصے پر محیط ہے جس کا تعلق ملک صاحب کے بچپن، جوانی اور عملی زندگی کے آغاز پر مشتمل ہے۔ یہ عرصۂ حیات اُن کے گاؤں ''دیّہ وال'' سے جڑا ہوا ہے جس کے بیان میں ملک مقبول احمد نے دیہی زندگی کی منظر کشی اس مہارت سے کی ہے کہ پریم چند اور سدرشن کے افسانوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ کتاب کا یہ حصہ مصنّف ہی کو نہیں، قاری کو بھی اُس کے بچپن کی طرف لوٹا دیتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے گاؤں کی پگڈنڈیوں پر پھوٹنے والی وہ معصومیت جو شہر کی سڑکوں پر آ کر کھو گئی تھی، ہمیں پھر سے بچپن کی طرف بُلا رہی ہے۔ ملک مقبول احمد نے تمام رُوداد کو چھوٹے چھوٹے واقعات میں تسبیح کے دانوں کی طرح پرو دیا ہے لیکن جس طرح تسبیح کے دانے پرونے کے لیے ایک مضبوط دھاگہ درکار ہوتا ہے، اِسی طرح اِن واقعات کو ''بے جی'' کی مضبوط شخصیت نے اپنی ذات کے حصار میں پرو لیا ہے۔ مصنّف کی اپنی والدہ سے محبت، عشق کا درجہ اختیار کر گئی ہے اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ والدین سے محبت قربِ الٰہی کا بہترین ذریعہ ہے۔

واقعات کا یہ بیان رفتہ رفتہ آپ بیتی کے قریب ہوتا جاتا ہے لیکن اس میں اُس وقت اچانک ''جگ بیتی'' کی چاشنی پیدا ہو جاتی ہے جب ملک مقبول احمد بعض دوستوں اور بعض ''وکھری ٹائپ'' کے لوگوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اور ہم اُن کے باطن میں آباد بعض دیگر لوگوں کے ''احوال'' سے بھی واقف ہو جاتے ہیں۔ لیکن ملک مقبول احمد چونکہ طبعاً شریف اور وضع دار شخصیت کے مالک ہیں لہٰذا یہ باب اُن کی وضعداری کی نذر ہو گیا ہے۔ جن احباب سے اُن کا تعلقِ خاطر ہے، اُن کا ذکر تو اُنہوں نے نام لے کر بانگِ دُہل کیا ہے لیکن جن سے معاملہ شکر رنجی اور ملال کا ہے وہاں صرف گزند کا ذکر کیا ہے، گزند پہنچانے والے کا نام نہیں لیا۔ سچ ہے۔

Marfat.com

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

ملک صاحب نے تین مرتبہ حج اور کئی عمرے ادا کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ ''سفر جاری ہے'' کا ایک اہم باب انہی لمحات کی روداد پر مشتمل ہے۔ حج کا سفر دراصل محبت کا سفر ہوتا ہے۔ وفورِ شوق کے بغیر یہ سفر شروع ہی نہیں ہو سکتا۔ حج کا سفر اختیار کرنے والا مناظر اور مناسکِ حج کو چشمِ شوق سے دیکھتا ہے اور انہیں اپنے قلب میں اتار لیتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہر زائرِ حج جن مقامات و مناسک کا ذکر کرتا ہے وہ سب کے دیکھے یا سنے ہوئے ہوتے ہیں لیکن چونکہ ہر زائر کی وارداتِ قلبی اور مشاہداتِ باطن جدا ہوتے ہیں لہٰذا اُس کا بیانِ شوق بھی جداگانہ کیفیات لیے ہوتا ہے۔ ملک مقبول احمد کے ہاں بھی اسفارِ حج کا بیان ایک نئے تجربے کا انکشاف بن گیا ہے۔ اس تجربے کے نقوش اُن کے باطن پر ثبت ہو کر اُن کی زندگی کا ایک ایسا حصہ بن گئے ہیں جسے سرمایۂ حیات قرار دیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک اس آپ بیتی کی ادبی قدر و قیمت کا تعلق ہے، اس کا تعین کرنے سے پہلے اُردو کی اہم آپ بیتیوں کو حافظے میں لانا چاہیے۔

سید ہمایوں مرزا کی کتاب ''میری کہانی میری زبانی'' سر رضا علی کا ''اعمال نامہ'' دیوان سنگھ مفتون کی ''ناقابلِ فراموش'' عبدالمجید سالک کی ''سرگزشت'' مولانا حسین احمد مدنی کی ''نقشِ حیات'' تقی محمد خاں کی ''عمرِ رفتہ'' جوش ملیح آبادی کی ''یادوں کی برات'' احسان دانش کی ''جہانِ دانش'' اور مرزا ادیب کی ''مٹی کا دیا'' اُردو کی نمایاں آپ بیتیوں میں شمار ہوتی ہیں۔ اور اب اسلوبِ بیان کی بے ساختگی، واقعات کی صداقت اور جدوجہدِ حیات کے حوالے سے ملک مقبول احمد کی ''سفر جاری ہے'' اُردو کی متذکرہ بالا آپ بیتیوں میں ایک اہم اور وقیع اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر طارق عزیز

Marfat.com

Marfat.com

اے حمید

ایک رومان پرور ادیب

ملک مقبول احمد صاحب پاکستان کے اُن چند گنے چُنے ناشرین ادب میں نمایاں حیثیت کے مالک ہیں جنہوں نے پاکستان کے ابتدائی ایام میں ہی اُردو ادب کی معیاری طباعت واشاعت کی بنیادیں استوار کیں اور اس بے سروسامانی کے عہد میں فن تشہیر واشاعت کی راہ نمائی کی۔

ملک صاحب نے سن 1958ء میں لاہور میں مقبول اکیڈمی کے نام سے دینی، تاریخی اور ادبی کتابوں کے اشاعتی ادارے کا سنگ بنیاد رکھا۔ یہ پاکستان کی نوزائیدہ اسلامی مملکت کے آغاز کا زمانہ تھا۔ جب کتابوں کی معیاری لکھائی چھپائی اور تشہیر کی سہولتیں تقریباً نہ ہونے کے برابر تھیں۔ لیکن ملک صاحب نے اس عدم سہولیات اور بے سروسامانی کے زمانے میں اللہ تعالیٰ پر یقین محکم رکھتے ہوئے ہمت سے قدم آگے بڑھایا اور لیتھو پرنٹنگ میں جو کتابیں چھاپیں وہ اپنی خوش نمائی، اور اعلیٰ معیار طباعت کے اعتبار سے آج بھی کمپیوٹر پرنٹنگ کا مقابلہ کرتی ہیں۔

یہ پاکستان کی تعمیر نو کا زمانہ تھا۔ زندگی کے ہر شعبے میں ایک نئے دور کا آغاز ہو رہا تھا۔ کاروباری امکانات محدود تھے۔ خاص طور پر ادبی کتابوں کی معیاری طباعت و اشاعت کے حالات بڑے نازک دور میں سے گذر رہے تھے۔ لیکن ملک صاحب نے اُن نامساعد حالات میں بھی مقبول اکیڈمی کی جانب سے عبرت نامہ اندلس، تمدن عرب اور تمدن ہند ایسی نایاب کلاسیکل کتابوں کو چھاپ کر نہ صرف انہیں گوشۂ گمنامی میں گم ہونے سے بچا لیا بلکہ قوم کے اس قیمتی علمی

Marfat.com

ادبی ورثے کو پاکستان کی آنے والی نسلوں کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے محفوظ کرلیا۔

مقبول اکیڈمی کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ اس ادارے نے سیرت ابن ہشام کا اُردو ترجمہ شائع کیا۔ اور یوں پاکستان میں سیرت نگاری کے پاکیزہ عمل کو آگے بڑھایا۔ مقبول اکیڈمی سے بطور مصنف کے میرا ادبی رشتہ پینتیس چالیس سال سے قائم و دائم ہے۔ مجھے یہ اعزاز بھی حاصل ہے۔ میرے ادبی کیریئر کی اولین تصنیفات حُسنِ طباعت کے اعلیٰ معیار کے ساتھ مقبول اکیڈمی نے ہی چھاپیں اور شائع کیں۔ بلاشبہ میرے لئے یہ امر باعثِ فخر ہے کہ مقبول اکیڈمی سے میری محبت اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ آج تک قائم ہے اور انشاء اللہ ہمیشہ قائم رہے گا۔

ملک مقبول احمد صاحب بڑے اعلیٰ اور بے عیب ادبی ذوق کے مالک ہیں۔ کاروباری اعتبار سے بھی ان کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ انہوں نے اس زمانے میں بھی جب مشہور ادیبوں کی کتابیں بھی اونے پونے داموں خریدی جاتی ہیں مجھے میری ہر کتاب جو انہوں نے شائع کی اس کا معاوضہ میری توقعات سے بڑھ کر دیا اور وعدے کے مطابق عین وقت پر دیا۔ نشر و اشاعت کے شعبے میں بھی ملک صاحب کی دیانت داری کی مثال قابل فخر ہے۔

میں ملک صاحب کی ادبی اور زیادہ تر رومانوی افتادِ طبع کو دیکھتے ہوئے یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گا کہ ان کے اندر ایک رومان پرور ادیب چھپا ہوا ہے۔ جس کو ملک صاحب تو ظاہر نہیں کرتے لیکن وہ ان کے کسبِ حال میں پوری طرح سے ظاہر ہو رہا ہے۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُردو ادب پر ان کا بابرکت سایہ قائم و دائم رکھے۔ آمین!

اے حمید

Marfat.com

شعیب بن عزیز

شعیب نامہ

ملک مقبول احمد اردو کی علمی و ادبی کتابیں شائع کرنے والے کسی تاجر کی پہلی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ وہ اوائل عمری میں رسالہ ''چودھویں صدی'' چھاپنے کیلئے سیالکوٹ سے لاہور آئے اور ادبی صحافت کے اس تجربے میں کامیاب نہ ہوئے۔ لیکن انہوں نے حوصلہ نہ ہارا اور کمر ہمت باندھ کر کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس کاروبار کے پہلے مرحلے پر ان کی دست گیری رئیس احمد جعفری اور احسان دانش نے کی وہ زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھے لیکن ان میں اکتسابی قوت بے پناہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے لاہور کی ''کتابی منڈی'' میں موجود کامیاب ناشرین کی کامیابی کے راز معلوم کیے۔ اور ان پر محنت و دیانت سے شبانہ روز عمل کیا اور اب وہ ''مقبول بکس'' کے نام سے لاہور میں کتابیں چھاپنے کی ایک ''ایمپائر'' قائم کر چکے ہیں۔ اور اس مقام پر پہنچ کر وہ اپنے تجربات اور حالات حیات پر مشتمل یہ کتاب پیش کر رہے ہیں۔ جو اس شعبے میں شامل ہونے والوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگی۔

میرا ذاتی مشاہدہ یہ ہے کہ ملک مقبول احمد ''گرم دم جستجو اور نرم دم گفتگو'' رہنے والے انسان ہیں، ان کا رابطہ ہر قسم کے ادیبوں سے پڑا جن کا تذکرہ اس کتاب میں موجود ہے۔ لیکن فطرتاً وہ ''خیالِ خاطرِ احباب'' رکھنے والے انسان ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے متوسط طبقے سے اٹھ کر اپنی زندگی خود بنائی ہے۔ زندگی کی راہ کے کانٹے اپنی پلکوں سے چنے ہیں۔ اور انسانیت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔ وہ بڑے بلکہ بہت بڑے ناشرین

Marfat.com

بن کر بھی اپنے مزاج میں "جھوٹی انا" کی پرورش کرنے پر مائل نہ ہوئے اور ایک عالی مزاج درویش کی طرح گردن جھکاتے چلے گئے۔

انہوں نے معاشرے کے ہر شخص سے تعلقات استوار کرنے کی کوشش کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی محنت کو قبول کیا اور اجر عظیم یہ دیا کہ انہیں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں کئی مرتبہ حاضر ہونے کیلئے بلاوا بھیجا۔ کتابوں کے تاجر تو وہ اب بھی ہیں لیکن اب بالکل بدلے ہوئے انسان نظر آتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ ملک مقبول احمد مجھے اپنے دوستوں میں شمار کرتے ہیں۔ اور میری محرومی ہے کہ ان کے تقاضے کے باوجود میں انہیں اپنی کوئی کتاب اشاعت کیلئے پیش نہیں کر سکا۔ ان کا اشاعتی کاروبار ان کی اگلی نسل نے سنبھال لیا ہے۔ تو میں اس ادبی اشاعتی ادارے کے مزید کامیابی کی دعا کرتا ہوں۔

Marfat.com

طارق اسمٰعیل ساگر

ایک بڑا معتبر ادارہ

ملک مقبول صاحب کو میں ایک پبلشر سے زیادہ ایک معاملات کے کھرے انسان کی حیثیت سے کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ جن دنوں میں بطور مصنف اُن سے منسلک ہوا مجھے مقبول اکیڈمی کے حوالے سے صرف اس بات کا علم تھا کہ یہ ایک بڑا معتبر ادارہ ہے۔ ادارے کے روح رواں ملک مقبول احمد سے ملاقات کے بعد مجھے احساس ہوا کہ ہر ادارے کو بڑا بنانے میں افراد کا کردار سب سے اہم ہوتا ہے۔ مصنف کو اس عالم قحط الرجال میں جس عزت اور محبت سے مقبول صاحب نوازتے ہیں وہ کچھ ان ہی کا حصہ ہے۔ میرے علم میں کوئی ایسا واقعہ نہیں کہ حسابات اور لین دین پر کسی کو ان سے شکایت پیدا ہوئی ہو۔

میرے علم میں ہے انہوں نے مقبول اکیڈمی کا آغاز کن حالات میں اور کیسے کیا تھا آج اگر ان کا ادارہ پبلشنگ کی دنیا میں ایک اہم مقام کا حامل ہے تو اس کے پس منظر میں اُن کی محنت، ایمانداری اور سب سے بڑھ کر اپنے مصنفین کے لیے وہ پر خلوص محبت ہے جس کا شکار ہونے والا ہر شخص پھر ان کے حلقہ احباب میں شامل ہو جاتا ہے۔ میں اُن کی مزید کامرانیوں کے لئے دعا گو ہوں۔

طارق اسمٰعیل ساگر

Marfat.com

Marfat.com

سید واجد رضوی

تقریظ

جناب الحاج ملک مقبول احمد صاحب سے میری نیاز مندی کوئی تیس سال پر محیط ہے۔ آپ سچے مسلمان ہیں، فقیر منش، دیانت اور صداقت کے پیکر ہیں۔ اچھے اور نیک نام پبلشر ہیں عام پبلشروں سے جو محض نفع کیلئے کام کرتے ہیں، آپ بالکل مختلف ہیں۔ آپ کے پیش نظر دولت نہیں بلکہ خدمت ہے۔ علم و ادب اور مؤلف کی بے لوث خدمت ہے۔ کتابیں شائع کرتے ہیں، کتابت اور اشاعت میں کتاب کی اہمیت اور مؤلف کی شخصیت کو پیش نظر رکھتے ہیں۔

جناب ملک ''مقبول'' احمد اسم بامسمّٰی ہیں۔ آپ کو اسلام اور رسول مقبول ﷺ کی ذات اقدس سے بے پناہ محبت اور گہری عقیدت ہے۔ اسلام پر مختصر اور جامع کتابیں لکھتے ہیں شائع کرتے ہیں اور مفت تقسیم کرتے ہیں۔ آپ نے میری کوئی دس کتابیں شائع کی ہیں جن میں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تین اُردو اور تین انگریزی زبان میں ہیں۔ آپ نے عشق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سرشار ہو کر ان کتابوں کی اشاعت کا اہتمام فرمایا ہے۔ ان میں سے دو کتابوں پر مجھے گولڈ میڈل ملے ہیں۔ ان کتابوں کے اندازِ طباعت میں آپ کے ضمیر کے جوہر کی چمک صاف دکھائی دیتی ہے۔

محترم ملک مقبول احمد صاحب کی سوانح حیات آپ کے سامنے ہے پڑھیے اور کسی مقام پر دل کی دھڑکن تیز ہو جائے تو تھوڑی دیر کیلئے کتاب بند کر دیجئے!

عاصی سید واجد رضوی

Marfat.com

Marfat.com

ابوالامتیاز، ع،س، مسلم

ایک مقبولِ بارگاہ شخصیت

کتابوں کی دنیا میں ملک مقبول احمد کے نام سے کون آشنا نہیں۔ وہ ادباء و مصنفین اور نشرواشاعت کے حلقوں میں عین اسم بامُسمّٰی ہیں۔

میرا اُن سے تعارف کوئی 23 سال پیشتر اُس وقت ہوا جب مجھے تحمید باری تعالیٰ اور مدحت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق اپنے اوّلین مجموعہ کلام ''حمد ونعت'' کے لیے ایک اچھے ناشر کی تلاش ہوئی جو طباعت واشاعت میں صاحبِ ذوق اور معاملے میں کھرا ہو۔

''مکتبہ نیاراہی'' بند کئے ہوئے 22-23 سال گزر چکے تھے نیز جیسا میں اپنی کہانی (لمحہ بہ لمحہ زندگی) میں لکھ چکا ہوں، بوجوہ ایک خود اختیاری ادبی جلاوطنی کا عالم بھی اوڑھ رکھا تھا، اس لیے شعبۂ نشرواشاعت میں ازسرِ نو ایک اجنبی وارد کی حیثیت تھی۔ اِدھر اُدھر معلوم کیا تو میرے محترم دوست قمر نقوی نے، جواب نقش بندی کہلاتے ہیں، اور ایک عرصے سے امریکا منتقل ہو چکے ہیں، ملک صاحب کی مقبول اکیڈمی کا پتا دیا۔ ان کی کتابیں بالعموم ''مقبول اکیڈمی'' ہی سے شائع ہوتی تھیں۔

میں نے شارجہ سے انہیں خط اور اپنے پس منظر اور ''حمد ونعت'' کی اشاعت کی خواہش سے آگاہ کیا اور انہوں نے کمالِ محبت سے اُس کی حامی بھر لی۔

باہمی تعاون اور خلوص ومحبت کے ایسے مراسم قائم ہوئے جو اللہ کے فضل سے اب تک قائم ہیں۔ وہ اب تک میری نو کتابیں شائع کر چکے ہیں اور سوائے ''کاروانِ حرم'' کے جدید ایڈیشن

Marfat.com

کے مجھے کبھی شکایت نہیں ہوئی۔ اس میں بھی شاید اُن کی مجبوری کو دخل تھا کہ اشاعت کے دنوں میں بازار میں معیاری کاغذ دستیاب نہیں تھا، جبکہ میری طرف سے طباعت واشاعت کی عجلت تھی۔ باہمی معاملات میں وہ ہمیشہ سونے کی طرح کھرے ثابت ہوئے۔

میں نے انہیں کبھی خشمگیں ہوتے نہیں دیکھا، جب بھی بات کی ہمیشہ دھیمے لہجے میں ہنس کر بات کرتے ہیں، گویا قولوا قولاً سدیداً کی عملی تصویر ہیں۔

دین سے وابستگی اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کا یہ عالم ہے کہ اکثر جب میں نے رابطے کی کوشش کی، معلوم ہوا کہ عمرے کو یا حج کو تشریف لے گئے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ اُس کا کبھی چرچا نہیں کرتے۔ کسی نے مبارک باد کہا تو شکریہ ادا کر کے جلدی سے گفتگو کا رخ پھیر دیتے ہیں، کہ خدانخواستہ نمائش وریاکاری کا کوئی پہلو نہ نکل آئے۔ یہ ایسی مومنانہ خاصیت ہے کہ صرف اُسے نصیب ہوتی ہے جس پر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاص نظرِ عنایت اور قلب خشیتِ الٰہی، تقوٰے اور فروتنی سے معمور ہو۔

بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اُن کے دستِ کرم سے بے شمار ضرورت مند ادارے اور افراد ایسی خاموشی سے فیض یاب ہوتے ہیں کہ دوسرے ہاتھ کو خبر تک نہیں ہوتی۔ حقوق العباد کو باری تعالیٰ نے اتنی اہمیت دی ہے کہ شرک کے سوا اپنے حقوق تو معاف کر دیتا ہے، مگر حقوق العباد کی معافی نہیں ہے۔ اس کا اختیار اُس نے متاثرہ بندے کے ہاتھ میں رکھا ہے اور آخرت میں کون اتنا غنی ہوگا کہ اپنے حق سے دست بردار ہو جائے۔

اسی لئے انفاق فی سبیل اللہ، نہ صرف حقوق العباد کی ادائیگی سے عہدہ برآ ہونے کا موثر ذریعہ ہے، بلکہ اللہ کی شکر گزاری کا بھی بہترین طریقہ ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

وَاِذْتَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ

''اور یاد رکھو تمہارے رب نے خبردار کیا ہے، کہ اگر شکر گزار بنو گے۔ اور ہماری نعمتوں کا اعتراف کرو گے، میں تم کو اور زیادہ نوازوں گا۔'' (14 ابراہیم۔ 7)

Marfat.com

اُن کے اخلاق و کردار کی یہ خوبیاں ان کے مذاقِ اَشاعت میں بدرجہ اَتم نمایاں ہیں۔

تفسیر اور سیرتِ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لے کر تاریخ، شعر و ادب، تحقیق و تنقید اور جملہ موضوعات تک وہ اپنے انتخاب میں بہت محتاط ہیں۔ محض کاروباری مفاد انہیں اس پر آمادہ نہیں کر سکتا کہ وہ ہر ایسے عنوان پر کتاب قبول کر لیں جو دین، تہذیب و ثقافت یا ادب کے اعلیٰ معیار پر پوری نہ اُترے۔ نمونہ مُشتے از خروار کے طور پر چند عنوانات سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے:

ترجمان القرآن۔ تفسیر ابنِ کثیر۔ زاد المعاد۔ سیرت ﷺ ابن اسحاق۔ سیرت ﷺ ابن ہشام۔ تمدنِ عرب۔ تمدنِ انسانی پر انبیاء کے اثرات۔ تفسیرِ اقبال۔ شعر العجم۔ میر انیس کی قلمرو۔ جدیدیت کی تلاش میں۔ زبانِ داغ۔ شعلۂ چنار۔ حمد و نعت۔ کاروانِ حرم۔ حمد باری تعالیٰ۔ زبورِ نعت وغیرہ

چند مصنفین کے ناموں سے اُن کے معیارِ انتخاب کی یوں تصویر کشی ہو سکتی ہے:

محمد بن اسحٰق مطلبی۔ ابو محمد عبدالملک بن ہشام۔ حافظ ابن القیم۔ محمد ابوالنصر۔ سرسید احمد خان۔ مولانا شبلی نعمانی۔ مولانا محمد حسین آزاد۔ داغ دہلوی۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ ڈاکٹر وحید قریشی۔ ڈاکٹر انور سدید۔ پروفیسر رفیع اللہ شہاب۔ میرزا ادیب۔ عشرت رحمانی۔ عبدالعزیز خالد۔ ابوالامتیاز ع س مسلم۔ سید علی بلگرامی۔ ڈاکٹر ریاض محمود۔ رشید امجد وغیرہ

اللہ تعالیٰ نے انہیں جی بھر کر نوازا ہے، اور وہ صحیح معنی میں نہ صرف مقبول بارگاہِ حق ہیں بلکہ مقبولِ احمد بھی ہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ ہمیشہ انہیں اپنی رحمتوں اور نعمتوں کی فراوانی بخشے اور وہ اپنا دستِ فیض اس کے بندوں کے لیے کشادہ رکھیں۔

ابوالامتیاز ع، س، مسلم

☆☆..........☆..........☆☆

Marfat.com

Marfat.com

قاضی ذوالفقار احمد

ادب کی شمع فروزاں

ملک مقبول احمد نے اپنے سنِ شعور سے ہی اپنی زندگی کا روزنامچہ لکھا ہوتا۔ یہ بہتر بلکہ بہترین ہوتا۔ بہر کیف انہوں نے اپنی یادداشت کے سہارے اپنی سوانح حیات لکھ کر اپنے اعلیٰ اخلاق و کردار کے نمایاں خدوخال پیش کر دیئے ہیں جو ان کے دل کی گہرائیوں سے نکلے ہیں۔ قاری ان کی جسمانی اور ذہنی بالیدگی کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا ہے اور وہ اس کی توجہ کو اپنی زندگی کے واقعات اور کردار کے علاوہ ادھر اُدھر بھٹکنے نہیں دیتے۔ جب وہ اپنے والدین، اپنے اہل خانہ اور قرابت داروں کا ذکر کرتے ہیں تو اس وقت بھی وہ اپنی شخصیت کے پرت ہی اتار رہے ہوتے ہیں اور ان کی بصیرت نمایاں ہوتی چلی جاتی ہے۔

انہوں نے اس کتاب میں اپنی زندگی میں پیش آنے والے جن کرداروں، مصنفین، ادیبوں، بزرگوں، افسروں، دوستوں، عالموں اور محسنوں کا ذکر کیا ہے وہ خالصتاً اپنے اپنے دائرہ کار اور اخلاقی پیرہن میں قابلِ تحسین ہیں۔ ملک صاحب ان سے متاثر ہوئے ہیں تو یہ ان کے اپنے باطن کا حُسن اور اپنے کردار کی بلندی ہے۔ مثال کے طور پر وہ آج تک اللہ ماہی اور دسوندھی خاں کو نہیں بھول سکے۔ اپنی بے جی، ان کو قدم قدم پر اب بھی نظر آتی ہیں۔ وہ تمام افراد جن کا انہوں نے اس کتاب میں ذکر کیا ہے ہمیں انسانیت کے زندۂ جاوید پیکر نظر آتے ہیں۔

ملک صاحب اپنے طرزِ عمل اور فکر کے لحاظ سے اعلیٰ کردار کے روایات پرست بزرگوں کا پرتو ہیں۔ اپنی سوانح حیات میں وہ بار بار اس کا اظہار آزادی اور جرأت مندی سے کرتے ہیں کہ

Marfat.com

ان کی رسمی تعلیم زیادہ نہیں ہے۔غور کیجئے تو ہمارے بیشتر قائدین، راہنما اور مبلغین کون سی برطانوی یونیورسٹیوں کے سند یافتہ تھے۔شورش کاشمیری مڈل پاس تھے لیکن ابلاغیات پر پنجاب یونیورسٹی کے ایم۔اے، کے طالب علموں کو اپنے خطابات سے نوازتے تھے۔ملک صاحب نے پبلشنگ میں جو کچھ کیا ہے وہ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔یہ ان کی اخلاقی بلندی ہے کہ وہ اپنی سب کوششوں، جدو جہد کے عمل اور کامیابیوں کو عطیۂ خداوندی سمجھتے ہیں۔سچے مسلمان ایسا ہی کرتے ہیں۔خدا تعالیٰ خود تو بندے سے ملاقات کر کے اس کے عمل کا معاون نہیں ہوتا۔وہ تو بس اپنی قدرت سے بندے کے ذہن میں ایک خیال تخلیق کرتا اور پھر بندے کو اس کی حقیقت سمجھنے کی توفیق دیتا ہے۔الہام، القاء، وجدان اور ادراک سے ہی شعور جاگتا ہے۔اور عمل کے راستے ہموار ہوتے ہیں۔

ملک مقبول احمد کی سوانح حیات ان کی ذاتی زندگی کے واقعات، حادثات، محرکات اور تصورات پر مبنی ہے یہ آپ بیتی ہر نوجوان کے لئے شمع فروزاں ہے۔اس کتاب کو پڑھ کر آپ یقیناً آج کے دور کے کامیاب انسانی کرداروں اور عملی اور مینجمنٹ کے ماہرین کی جدو جہد کو بھول جائیں گے اور اس حقیقت کو تسلیم کریں گے۔اللہ پر بھروسہ اور دیانتدارانہ عمل کامیابی کا زینہ ہے۔

ملک مقبول احمد پیچیدہ شخصیت کے انسان نہیں وہ سیدھے سادے، صاف گو اور اپنی شخصیت کو نمایاں نہ کرنے والے انسان ہیں۔ان کی کتاب ''سفر جاری ہے'' غیر رسمی تعلیم میں ان کے نابغۂ عصر ہونے کی دلیل ہے۔ان کے عمل کی بالیدگی روحانیت سے عبارت ہے، ان کے کاروبار پر بھی اس بالیدگی کا سایہ ہے۔میری دعا ہے کہ وہ بھی جئیں اور ان کا کاروبار بھی ترقی کرے۔ان کے ذہن میں جو منصوبے ہیں پروردگار ان کو حقیقت میں ڈھالنے کی توفیق عطا فرمائے۔یہ سب منصوبے خدا کی مخلوق کی بھلائی کے لیے ہی ہیں۔

قاضی ذوالفقار احمد

☆☆..........☆..........☆☆

Marfat.com

نقشبند قمر نقوی

خلوص کا روشن چراغ

الحاج ملک مقبول احمد صاحب سے تقریباً نصف صدی قبل ان دنوں ملاقات ہوئی جب میں اپنی دوسری ناول کے لیے کسی ناشر کی فکر میں تھا، کسی نے مجھے ملک صاحب کے بارے میں بتایا اور اصرار کیا کہ میں ضرور ان سے بات کروں۔

ان دنوں لوگوں کے اخلاق وعادات میں انحطاط شروع نہیں ہوا تھا، لوگ عموماً وضعدار، بامروت، اور بااخلاق ہوا کرتے تھے ملک صاحب بھی ان صفات کے حامل تھے۔

ملک صاحب سے میری ابتدائی گفتگو نہایت دوستانہ اور خوشگوار ماحول میں ہوئی، ان کا نرم انداز گفتگو، بے تکلفانہ برتاؤ، نمایاں منکسر مزاجی، اور ایسا قرینہ جس سے اعتماد کی کیفیت پیدا ہوتی ہو۔ سب نے مل کر مجھے یقیناً متاثر کیا۔

ملک صاحب نے جو اعتماد کی فضا اول روز قائم کر دی تھی، اس نے تھوڑے ہی عرصے میں ہمارے مابین خلوص ومحبت کا ایک، مستقل رشتہ قائم کر دیا، جس میں نصف صدی کے طویل عرصے میں برابر استحکام ہی آتا رہا۔

ان کی خوش اخلاقی کا یہ عالم ہے جو اُن سے ملتا ہے وہ ان کے بارے میں ایک نہایت اچھا تاثر قائم کرتا ہے، ان کا باوقار اور دوستانہ سلوک دلوں کو موہ لینے کا کام کرتا ہے۔ وہ اپنے ملنے والوں کا احترام کرتے ہیں جو ان کے اخلاق کا فطری عنصر ہے، یہ ایک قدرتی امر ہے، اور ان کی

Marfat.com

اس عادت کے نتیجے میں دوسرے بھی ان کا احترام کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

خلوص نیت...... خلوص طبیعت...... خلوص کار...... کسی بھی تجارت میں اہم عناصر ہیں، جس شخص میں یہ صفات پائی جائیں کامیابی اس کے قدم چومنے پر مجبور ہوتی ہے، یہ چراغ جب روشن ہوتا ہے تو نہ صرف اپنی اہمیت میں اضافہ کرتا ہے بلکہ سارے ماحول کو منور کر دیتا ہے، ملک صاحب خلوص کا ایسا ہی روشن چراغ ہیں، ان کی نیت ہمیشہ صاف رہتی ہے اور ان کے معاملات کا انحصار خلوص نیت پر ہوتا ہے۔

ان تمام صفات کے ساتھ ان کی دینداری نے گویا سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے، ان کے کردار میں پاکیزگی، اخلاق میں حسن انکسار و مدارا، اعمال میں خلوص عبودیت، اللہ تعالیٰ سبحانہ سے بھی انہوں نے معاملہ قابل تعریف حد تک درست رکھا ہے، اگرچہ وہ اپنی دینداری کی نمائش کبھی نہیں کرتے، اسی کا نتیجہ تھا کہ اللہ تعالیٰ سبحانہ نے بھی ان کو بار بار اپنی مہمانی کا شرف عطا کرتے ہوئے اذن حج عطا فرمایا۔

ملک مقبول احمد اور مقبول اکیڈمی کا نام ایک مدرسہ بن چکا ہے۔ ایک نہایت معتمد اور مقبول ادارہ بن گیا ہے، جسے ناشران و تاجران کتب میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے، اور یہ ساری کامیابی ملک صاحب کی شرافت، خوش اخلاق دیانت داری، خوش معاملگی، خلوص نیت اور خوش اعمالی کا انعام ہے۔

فقیر

نقشبند قمر نقوی

Marfat.com

PUNJAB EDUCATION FOUNDATION

19 - Ahmed Block, Garden Town Lahore.

Phone # : 9230729, 9230736, 5940263
Fax # : 9230785, 9230416
E-mail: ahmmalik@yahoo.com, pef@wol.net.pk
Website : http://www.pef.edu.pk

جناب ملک مقبول احمد صاحب سے میری نیازمندی کا عرصہ تقریباً دس سال پر محیط ہے۔ آپ کی زندگی علم و عمل سے عبارت ہے اگر یہ کہیں تو بے محل نہ ہوگا کہ آپ امانت، دیانت، شرافت اور متانت کا مرقع ہیں، پابندیٔ وقت اور حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہیں۔ سب سے بڑھ کر بہت بڑی خوبی جس نے مجھے بے حد متاثر کیا وہ آپ کا اسلام سے دلی لگاؤ اور سرورِ کونین محمد مصطفےٰ، احمد مجتبیٰ ﷺ سے عقیدت اور محبت ہے، حرمین کیلئے تڑپ آپکی زندگی کا لازمی جزو ہے، آپ کی محبت بھری طبیعت میں یہ بات بڑی نمایاں ہے کہ آپ اپنے دوستوں کو اور بالخصوص مجھے اپنی پر خلوص دعاؤں میں ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔ آپ غریب پرور اور علم دوست ہستی ہیں۔ پروردگار آپ کے علمی و ادبی مراتب میں مزید وسعت اور ترقی دے۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

16/10/06

ڈاکٹر اللہ بخش ملک

مینجنگ ڈائریکٹر، پنجاب ایجوکیشن فاؤنڈیشن

Marfat.com

Marfat.com

کتاب اوراس کا تعارف

کتاب راہنمائی کا وسیلہ

کتاب کی ضرورت واہمیت کے بارے میں صرف یہ کہنا کافی ہے کہ رب ذوالجلال کو جب بھی بنی نوع انسان کی رہنمائی کے لئے اپنے پیغمبر مبعوث کرنے کی ضرورت پیش آئی تو ان کو وحی اور الہام کے ذریعے آسمانی صحیفے اور آفاقی کتب سے سرفراز فرمایا۔ قرآن کریم دنیا میں اتاری جانے والی آخری آسمانی کتاب ہے جو ہمارے نبی اکرم محمد مصطفےٰ ﷺ پر وحی کے ذریعے اتری۔ دین اسلام میں مومن کے ایمان کے لئے سابقہ الہامی کتابوں پر یقین رکھنا لازمی قرار دیا گیا ہے جبکہ قرآن کریم جملہ کتب آسمانی (یعنی ''الکتب'') کا مصدق اور محافظ ہے۔

کتاب بظاہر ایک خاموش شے ہے لیکن اس کے اندر گویائی کے سمندر موجزن ہیں۔ کتاب رحمانی اور انسانی تخلیق ہے۔ اور اس کا مقصد نسل انسانی کو صراطِ مستقیم پر چلانا اور معاشرے کی اصلاح ہے۔ شیطانی تخلیقات کے برعکس اچھی کتاب درست سمتوں میں راہنمائی کرتی اور انسان کو استفادے کا موقع فراہم کرتی ہے۔

میں کتاب کی خاموشی کے باوجود اس کی گویائی سے آشنائی رکھتا ہوں اور اس کے باطن کی دانش کو سمجھتا ہوں۔ میرا نصابی علم محدود ہے لیکن میری کتاب سے گہری محبت ہے۔ کتاب ہمیں عقل وخرد کے ان جزیروں کی سیاحت کراتی ہے جو گردشِ زماں میں گم ہو چکے ہیں لیکن کتاب میں موجود ہیں۔ کتاب کا مصنف زندہ انسان کی طرح ہمارے ساتھ باتیں کرتا ہے۔ متعدد فلاسفروں، حکماء اور دانشوروں نے کتاب کے متعلق اپنی رائے کا اظہار یوں کیا ہے۔

Marfat.com

☆ کتاب صرف قیمتی کاغذ، خوبصورت سرورق اور مرصّع جلد پر ہی مشتمل نہیں ہوتی۔ بلکہ اس میں لکھنے والے کے تجربات، مشاہدات، قلبی وارداتیں، دماغی عرق ریزیاں اور کڑی جگر کاویاں بھی شامل ہوتی ہیں۔

☆ کون اندازہ کر سکتا ہے کہ اچھی کتاب لکھنے والے نے اپنی کس قدر میٹھی نیندیں حرام کی ہوں گی اور اپنی آنکھوں کا کس قدر تیل استعمال کیا ہوگا تا کہ پڑھنے والے اس سے استفادہ کریں۔

☆ کتاب انسان کے ذوق کو بڑھاتی ہے، اس کا مطالعہ انسان کو بے کار اور فضول سوچوں سے بچاتا ہے۔

☆ کتاب انسان کی تربیت کرتی ہے، شعور کو بیدار کرتی ہے، کتاب میں بنیادی طور پر زندگی کا علم جمع ہوتا ہے۔

☆ کتابوں کے اثرات کا دائرہ صرف قاری کی ذات تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ دوسرے ممالک میں اقوامِ عالم تک پھیلتا چلا جاتا ہے۔

☆ کتابیں اپنے لکھنے والوں کی کاوشوں کا نچوڑ ہوتی ہیں۔ ان سے محروم رہنا انسانی عقل و دانش سے محروم رہنے کے مترادف ہے۔

☆ کتابیں فانی انسان کا لافانی شاہکار ہوتی ہیں۔ ایک عمدہ کتاب ایک حیات ہی نہیں بلکہ حیات کا غیر فانی سرمایہ ہے۔

☆ کتابوں میں ایک ایسی توانائی ہوتی ہے جس سے مفلس، مفلسی سے اور بد بخت، بدبختی سے نجات پا سکتا ہے۔

☆ ایک کتاب بذاتِ خود ہیروں کی کان ہوتی ہے جبکہ الفاظ اس کان کے ہیرے ہوتے ہیں۔

☆ انسان کی بہترین دولت کتاب ہی تسلیم کی گئی ہے۔

☆ کتابیں ہی وہ آئینہ ہیں جن کے ذریعے ہم صدیوں قدیم زمانوں کی تصاویر دیکھ کر ان کے

Marfat.com

حالات جان پاتے اوران کے مصنفین کو دیکھ پاتے ہیں۔

☆ جس طرح اچھے اور بُرے افراد معاشرے پر اپنے اثرات مرتب کرتے ہیں، اسی طرح اچھی یا بُری کتاب بھی اپنے اثرات مرتب کرتی ہے۔

☆ باذوق لوگ پہلے بھی کتاب پڑھتے تھے اور آج بھی پڑھتے ہیں، کیونکہ کتاب کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔

کتاب کی اشاعت

کتاب کی اشاعت میں مصنف، ناشر اور قاری شامل ہیں۔ مصنف کتاب لکھتا ہے، ناشر کتاب چھاپا اور قاری تک پہنچاتا ہے اور قاری اس کو پڑھتا ہے۔علم و دانش کی باتیں سیکھتا اور گوناگوں تجربات حاصل کرتا ہے۔کتاب کی افادیت نہ صرف اس کے زمانہ اشاعت میں اہمیت رکھتی ہے بلکہ یہ آئندہ زمانوں اور آئندہ نسلوں کی عقل وخرد کو بھی منور کرتی ہے۔اس پر میں ایک ناشر کی حیثیت سے روشنی ڈالتا ہوں۔اس ضمن میں اپنے اشاعتی تجربے اور اس کتاب کے بارے میں بھی چند باتیں پیش کرنے کی جسارت، عجز وانکسار سے کرتا ہوں۔

کتاب کی متذکرہ افادیت کے باوجود کتابوں کی طباعت کا کاروبار کئی حوالوں سے ایک پُرخطر کام ہے۔اکیلا فرد اس کام میں ہاتھ نہیں ڈال سکتا لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اس کام کی ابتدا ایک فرد ہی کرتا ہے۔اس فرد کے اندر ایک اپج ہوتی ہے جس کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگتا ہے اور پھر اس کے دل میں ایک کتاب کے بعد دوسری بہتر کتاب پیش کرنے کی ''ترنگ،، پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔جسے کچھ دوسرے لوگ بھی قبول کر لیتے ہیں اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
راہرو ملتے گئے اور کارواں بنتا گیا

کتاب اس مقصد کے تحت شائع کی جاتی ہے کہ اسے دوسرے لوگوں تک پہنچایا جائے، اس کے مطالب ومفاہیم عام کیے جائیں۔لہٰذا کتاب کا ناشر ایک کتب فروش کا فریضہ بھی ادا کرتا

Marfat.com

ہے۔ میں یہ فریضہ کئی برسوں سے ادا کر رہا ہوں اور میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ اس کام سے روزی کمانا اتنا آسان نہیں ہے جتنا بظاہر نظر آتا ہے یا جس کا تصور کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف کاروان اشاعت میں شامل ہونے والے ساتھی اچھے بھی ہو سکتے ہیں اور بُرے بھی، دیانت دار بھی ہو سکتے ہیں اور بددیانت وخائن بھی، مثبت بھی ہو سکتے ہیں اور منفی بھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ کردار کے اس مثبت اور منفی زاویوں کے باوجود کتابوں کی اشاعت ایک باوقار کام اور ایک باعزت پیشہ ہے۔

بلاشبہ کتاب مصنف کے لکھ دینے ہی سے وجود میں آتی ہے لیکن کتاب کو صوری حسن ورعنائی ناشر ہی فراہم کرتا ہے۔ اس لحاظ سے کتاب سازی کو تخلیقی عمل سے بھی تشبیہ دی گئی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ تخلیقی عمل میں کس قدر دشواریاں اور مشکلات پیش آتی ہیں۔ خُدا کا کرم اور مہربانی شاملِ حال نہ ہو تو تکمیل شدہ کتاب میں کوئی نہ کوئی خامی رہ سکتی ہے، جس سے ناشر کی ساکھ اور بات بگڑ جاتی ہے۔

تخلیق......اور صحت مند تخلیق پا جانے کے بعد کتاب کو شوکیس میں سجا کر رکھ دینے ہی سے اس کا اہم مقصد پورا نہیں ہو جاتا۔ اس کا مقصد تب پورا ہوتا ہے جب وہ قارئین کے ہاتھوں میں پہنچا دی جاتی ہے۔ ناشر کے شوکیس سے اُڑ کر قاری تک پہنچنا ہی اس کی کامیابی ہے۔ اس عمل کے بعد اس کا صرف کردہ سرمایہ کچھ موزوں اضافے کے ساتھ واپس آتا ہے اور اسے نئی کتاب شائع کرنے کا حوصلہ عطا کرتا اور اس کے آئندہ کے اشاعتی منصوبے کو تقویت دیتا ہے۔ یہ حقیقت شائع کردہ کتاب کی فروخت کی روشنی میں ہی فیصلہ کن مرحلے میں پہنچتی ہے کہ ناشر کتابوں کی فروخت کی منڈی میں کیسا جا رہا ہے۔ ناشر کے لئے ایسی کتب شائع کرنا اس کے کاروبار کی زندگی اور وسعت کی علامت ہوتی ہیں جو اپنے موضوع کے اعتبار سے منفرد ہوں یا کسی ممتاز ومعروف ادیب کی تصنیف ہونے کی وجہ سے ہاتھوں ہاتھ بک جائیں۔ ایسی کتب ہی ناشر کو مزید سرمایہ کاری کا اہل بناتی ہیں اور اس کے کاروبار کو وسعت دیتی ہیں۔

مثل مشہور ہے کہ سارے کام سرمائے سے چلتے ہیں۔ اس مثل کے سچے ہونے میں

Marfat.com

کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں لیکن اشاعتی کاروبار میں بعض اوقات ایسے مقام بھی آجاتے ہیں کہ سرمایہ خرچ کرنے کے باوجود کسی مصنف، کمپوزر، مصور، پروف ریڈر، پیسٹر، مطبع خانے (پریس) یا دفتری خانے میں طباعتی کام بو بوہ پھنس کر رہ جاتا ہے اور کاروبار کی گاڑی چلتے چلتے رک جاتی ہے۔ کسی کتاب کی مقررہ عرصے کے بعد تخلیق اور فوری فروخت سے حاصل ہونے والے سرمائے کی آمد رک جاتی ہے۔ مختلف مراحل پر اٹکی اور لٹکی ہوئی کتب فروخت کے مرحلے تک نہیں پہنچ پاتیں۔ ایسے حالات میں کاروبار کیلئے مالک یا منتظم کا گھبرا جانا کاروبار کے لئے بڑا مہلک ثابت ہوسکتا ہے۔

............☆............

میں نے طباعت واشاعت کے بہت سے مراحل اور معاملات سے گزرنے کے بعد یہ کتاب لکھنے کی جسارت کی ہے۔ یہ کتاب میرے تجربات پر مشتمل ہے جس سے نئے ناشرین رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ میرے پوتے بابر مقبول کو پتہ چلے کہ اس کے دادا نے کیا کیا پاپڑ بیلے ہیں۔ نشر واشاعت کے اس کاروبار کا آغاز ایک درماندہ شخص نے کیا تھا۔ میں پورے عجز وانکسار سے عرض گزار ہوں کہ مشکلات کے باوجود میں نے کسی مقام پر حوصلہ نہ ہارا۔ مجھے اس وقت بے پایاں خوشی ہوئی جب وطن عزیز کے ممتاز نقاد جناب ڈاکٹر وحید قریشی نے قائداعظم لائبریری کے ششماہی ادبی مجلّہ ''مخزن'' میں لکھا کہ

> ''مقبول اکیڈمی ایک کمرشل طباعتی ادارہ ہے جو 1958ء میں قائم ہوا۔ ملک مقبول احمد کی شب وروز محنت سے آج یہ ایک اہم پبلشنگ ہاؤس بن چکا ہے۔ اس کا ایک ذیلی ادارہ ''مقبول بکس،، بھی کتابوں کی طباعت کیلئے مشہور ہے۔ اُردو بازار کے قریب سرکلر روڈ پر قائم ہونے والا یہ ادارہ ترقی کر کے کئی دکانوں تک پھیل چکا ہے۔ چنانچہ مال روڈ پر اس کا شوروم کتابوں کا ایک اہم ذخیرہ پیش کرتا ہے جس میں اپنی مطبوعات کے علاوہ دوسرے اداروں کی کتب بھی موجود ہیں۔''

Marfat.com

مجھے اپنے ہر سانس کے ساتھ اس کا اعتراف ہے کہ میرے پروردگار نے مجھے جو عزت، کامیابی، طمانیتِ قلب اور روحانی سکون عطا کیا ہے یہ میری اہلیتوں، کاوشوں، کاروباری جدوجہد اور میری کارگزاریوں کی وجہ سے نہیں، بلکہ یہ سب کچھ مولا کریم نے مجھے میری ماں، میری ''بے جی'' کی دعاؤں کے نتیجے میں دیا ہے۔ یہ سب کچھ مجھے انعام میں ملا ہے۔ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے سربسجود ہوں۔

مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی شرم، کوئی جھجک اور کوئی رکاوٹ نہیں ہے کہ میں تعلیمی سرٹیفکیٹوں، ڈگریوں اور دستاویزی حوالوں سے انتہائی کم علم ہوں لیکن پھولوں کے درمیان رہ کر خوشبودار ہو جانے والی مٹی کی طرح میں بھی ادبا، شعرا، مصنفین، مترجمین، معلمین، محققین اور عالی ظرف انسانوں اور کتابوں کے داخلی جمال سے فیضیاب ہوا اور میں خود بھی ایک کتاب بن کر رہ گیا۔ تقریباً پچاس سال سے میرا اٹھنا، بیٹھنا اور سونا کتابوں کے ساتھ ہے۔ پبلشرز، پرنٹرز اور بک سیلروں کی دوستی اور کتابوں کی ہمہ وقت رفاقت مجھے میسر ہے۔ میں نے ان سب کا رنگ قبول کیا ہے۔ میرے دوستوں اور میرے بچوں نے مجھے ذہنی طور پر اُکسایا اور میں اپنی یہ روداد لکھنے پر آمادہ ہو گیا۔ میں نے راتوں کے سناٹوں میں اپنے دل کی باتیں سنی اور اپنے ذہن پر سوچوں کا بوجھ ڈال کر یہ کہانی دیانت اور صداقت کے گہرے محسوسات کی روشنی میں لکھی ہے۔ اور اب یہ کتاب وقت کے شیلف پر دوسری ہزاروں کتابوں کے ساتھ رکھ رہا ہوں۔

☆☆..........☆..........☆☆

Marfat.com

میری زندگی حقیقت

سپاس و حمد بے پایاں خدا را
کہ صنعش در وجود آورد مارا

''میں ذاتِ باری تعالیٰ کی اس کرم فرمائی کا بے حد شکر گزار ہوں کہ اس نے میری صحت مند تخلیق کی، میرے والدین کو میری پرورش کے جملہ وسائل مہیا کیے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مجھے انسان پیدا کیا اور محمد الرسول ﷺ کی امت میں پیدا کیا۔''

دیہات کا پس منظر

میرا تعلق اعوان کاشتکار برادری سے ہے۔ میرے گاؤں کا نام دیو وال ہے، جو ضلع سیالکوٹ میں واقع ہے۔ ہمارے گاؤں میں تین چار گھر پختہ اینٹوں کے بنے ہوئے تھے۔ گاؤں میں ہمارا خاندان متموّل خیال کیا جاتا تھا کیوں کہ گاؤں بھر میں صرف ہمارا رہائشی مکان ہی پانچ کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک کمرہ بالائی منزل پر تھا، اسے ہم چوبارہ کہتے تھے۔ خاندان کی اراضی وراثت نسل درنسل تقسیم ہو جانے کی وجہ سے میرے حصے میں صرف ڈیڑھ دو ایکڑ زمین آئی۔ ضلع سیالکوٹ پاکستان کا آبادی کے لحاظ سے گنجان ترین ضلع ہے۔ اس ضلعے میں بڑی زمینداریاں نہیں ہیں۔ زمین کم پڑ جانے کی وجہ سے ضلع سیالکوٹ کے بہت سے زمیندار نہروں سے سیراب ہونے والے باروں میں اٹھ گئے اور وہاں مربعے خرید لیے۔ میری ننھیال والوں نے بھی سرگودھا میں گھوڑی پال سکیم کے تحت دو مربعے حاصل کیے اور وہاں جا کر آباد ہو گئے۔

Marfat.com

دیوول جموں کشمیر کی سرحد سے صرف چند فرلانگ کے فاصلہ پر تحصیل پسرور کے شمال میں واقع ہے۔ میرے بچپن میں اس گاؤں کی تین اطراف میں پانی کا جوہڑ تھا۔ ہمارے گھر کا صحن بھی جوہڑ ہی کی طرف تھا۔ اگرچہ صحن پہلے ہی خاصا بڑا تھا پھر بھی میری محترمہ ماں جنہیں میں بے جی کہتا تھا اس صحن کو مزید وسیع کرنے اور اس کی سطح ہموار کرنے میں لگی رہتی تھیں۔ برسات کی آمد سے پہلے جیٹھ اساڑھ کی گرم دھوپ سے جوہڑ سوکھ جاتا، کیچڑ کی اوپر کی مٹی کی تہہ پیپڑیوں اور ڈھیلوں کی صورت اختیار کر جاتی تو میری ماں اڑوس پڑوس اور ملنے جلنے والے لڑکوں اور لڑکیوں یا ان کی ماؤں کی مدد سے صبح و شام کے ٹھنڈے اوقات میں مٹی کے ڈھیلے اٹھوا کر حویلی کے ڈھلوان صحن میں ڈلواتی رہتی۔ ماں ان سے یہ کام مفت یا بیگار میں نہیں کراتی تھی بلکہ ان کو گندم، چنے، چاول، باجرہ، جوار مکئی کے دانے بمعہ گڑ کے دیتی تھی، جنہیں وہ ماچھیوں کی بھٹیوں سے قبل دوپہر یا سہ پہر کو بھنوا کر کھاتے تھے۔ ہم سب بچے اس کھاجے کے اس قدر عادی تھے کہ ہمیں اصل کھانا ملے نہ ملے، کسی نہ کسی فصل کے بھنے ہوئے دانے حاصل کرنے کی طلب ضرور رہتی تھی اور ہم شام کا انتظار بڑے شوق سے کرتے تھے۔

میری ماں نے گھر کا صحن کھلا کرنے کا جو منصوبہ بنایا تھا وہ بہت کامیاب رہا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ میری ماں نے اس کھلے صحن میں کب بیریوں کے پیڑ لگوائے۔ شیشم کے ایک سایہ دار درخت پر کب توریوں کی بیل چڑھائی اور کب پانی کے حصول کے لئے چھوٹی سی کھوئی (چاہ) بنوائی۔ شیشم کے درخت پر بے شمار پرندوں کے گھونسلے تھے۔ شام ہوتے ہی پرندوں کی آمد سے جو شور اٹھتا تھا اس سے گھر میں عجیب رونق آجاتی تھی جیسے یہاں بہت سے لوگ رہتے ہوں۔ موسم گرما میں صبح کے کام کاج سے فارغ ہو کر محلے کی کچھ عورتیں حویلی میں جمع ہو کر چرخہ کاتتیں، کپاس بیلتیں، سرکنڈے اور کھجور کے رنگ برنگے پتوں سے مونڈھے، ٹوکریاں، چنگیریں، چھابے اور جانے کیا کیا بناتیں۔ بعض خواتین سُریلے گلے رکھتی تھیں وہ معراج نامہ، ہیر، یوسف، زلیخا وغیرہ پڑھتیں تو دوسری سنتیں۔ کبھی کبھی دوہوں کا مقابلہ بھی ہو جاتا۔

Marfat.com

میری ماں توریوں کا سالن بڑا مزیدار پکاتی تھیں۔توریوں کا ایسا مزیدار سالن پھر کبھی نہیں ملا، کھاد اور سپرے زدہ سبزیوں میں اب وہ ذائقہ مل بھی کیسے سکتا ہے۔شیشم کے درخت پر چڑھی ہوئی بیل پر لگی توریوں کو موٹا ہونے اور پھر سوکھ جانے دیا جاتا۔سوکھ جانے کے بعد ان کے اندر کا گودا قیمتی نرم برش بن جاتا جو برتنوں سے چکنائی دھونے کے کام آتا۔توری کے برش لاہور میں اب بھی بکتے نظر آتے ہیں لیکن یہ پلاسٹک کے برشوں سے زیادہ قیمتی ہیں۔گھر کے ایک کونے میں ایک تندور بھی بنا ہوا تھا جس میں میری ماں اور ان کو ملنے والی دوسری عورتیں بھی آکر روٹیاں لگاتیں۔گندم کے آٹے کی تندور کی روٹی واقعی مزیدار ہوتی تھی۔

☆☆............☆............☆☆

Marfat.com

Marfat.com

بچپن اور لڑکپن

خاندانِ مقبول

میرے والد حاجی ملک لال دین اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ میرے بڑے تایا کا نام محمد علی تھا اور چھوٹے کا نام محمد حسین۔ اس کے علاوہ گاؤں میں میری دو پھوپھیاں بھی تھیں۔ بڑی پھوپھی کا نام مغلانی بیگم اور چھوٹی کا چراغ بی بی تھا۔ باقی پھوپھیوں کی شادیاں دوسرے دیہات میں ہو چکی تھیں لیکن وہ کبھی کبھار آ جاتیں تو مجھے بہت پیار کرتیں۔ پھوپھی مغلانی کی ایک بہو کا نام ''شریفاں،، تھا وہ اپنے نام ہی کی طرح نہایت شریف، خوش خلق اور نیک دل خاتون تھی اور بچوں سے بہت پیار کرتی تھی۔ گاؤں میں میرے گہرے دوست معراج دین کی والدہ اور ماسی ''بوداں،، نامی ایک خاتون میری ماں کی گہری دوست تھی۔ ان کے علاوہ چاچا نبی بخش جو پولیس میں تھے ان کے منہ میں ہر وقت افیون رہتی تھی، ان کی بیگم جنہیں میں ''ماسی بی بی'' کے نام سے جانتا ہوں، میری ماں کی منہ بولی بہن تھی۔ ان کے بیٹے محمد یوسف سے میری گہری دوستی تھی۔ وہ بڑے ہو کر پولیس میں بھرتی ہوئے اور انسپکٹر کے عہدے تک پہنچے، ڈی ایس پی ہونے والے تھے، کہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ محمد یوسف کی شادی میری تایازاد صابرہ سے ہوئی تھی۔

چاچا نبی بخش کے ایک بھائی چاچا ''منگا'' بھی پولیس میں تھے۔ پولیس سے ریٹائر ہونے کے بعد انہوں نے سڑک پر ایک چھوٹی سی دکان کھول لی تھی، جس میں عام ضروریات کی اشیاء کے علاوہ کھلونے اور آتشبازی کا ہلکا پھلکا سامان بھی فروخت ہوتا تھا۔ ایک سال شب برات آئی تو میں چاچا منگا کی دُکان سے آتشبازی کی کچھ چیزیں لینے گیا اور میری غلطی سے دکان میں

Marfat.com

آگ لگ گئی۔ جس سے کافی نقصان ہوگیا، لیکن چاچا ''منگا'' نے مجھے صرف اتنا کہا ''بیٹا کوئی بات نہیں'' اور مجھے پیار سے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

ہمارے گھر کے صحن میں ایک پانی کی ''کھوئی'' (چاہ) تھی۔ اس سے محلے بھر کی لڑکیاں پانی بھرتی تھیں جبکہ گلی میں واقع مسجد کے کنویں سے بڑی عمر کی عورتیں پانی بھرتی تھیں۔ اس وقت میں یہ نہیں سمجھتا تھا کہ نوجوان لڑکیاں مسجد کے کنویں سے پانی بھرنے کیوں نہیں جاتیں؟ میں یہ بھی دیکھتا کہ یہ لڑکیاں لڑکوں کے درمیان جانا بھی پسند نہیں کرتی تھیں۔ اس کی وجہ اس وقت میری سمجھ میں نہیں آتی تھی تاہم میری خواہش ہوتی کہ یہ لڑکیاں دوستوں کی طرح ہمارے ساتھ مل کر لکن میٹی کھیلیں اور ہماری طرح ہی دھینگا مشتی کریں۔

جب شعور کی آنکھ کھلی، عمر بڑھنے اور سکول میں داخل ہو جانے کے بعد مجھ پر کچھ اسرار کھلنے لگے لیکن ان میں سکول کی تعلیم کا کوئی عمل دخل نہ تھا بلکہ دوستوں، ہم جماعتوں، ہم مکتبوں اور گلی محلے کے جن بچوں کے ساتھ میں اٹھنے بیٹھنے لگا تھا انہوں نے غیر رسمی تعلیم کے ذریعے مجھے بہت سی ایسی تمام باتوں سے آگاہ کر دیا حتیٰ کہ مجھے سکول کی رسمی تعلیم ہیچ نظر آنے لگی۔ اب مجھے معلوم ہوگیا کہ

- ☆ گاؤں کے گرداگرد پھیلا ہوا پانی کا جوہڑ گاؤں کے لئے کس قدر مفید ہے۔ گاؤں کے مویشیوں کی تو زندگی ہی اس سے تھی۔ نیز یہ جوہڑ وجود میں آنے کے بعد اب بھی کچے مکانوں کی حفاظت کرتا تھا۔ اور لوگ اس سے مچھلیاں بھی پکڑتے تھے۔
- ☆ مردوں اور عورتوں میں زیادہ میل جول کیوں پسند نہیں کیا جاتا؟
- ☆ لڑکیاں لڑکوں سے مل کر وہ کھیل کیوں نہیں کھیلتیں جو لڑکے آپس میں مل کر کھیلتے تھے۔
- ☆ محبت کی آنچ کسے کہتے ہیں اور یہ کیسے محسوس ہوتی تھی۔

اس وقت بلاشبہ میرے احساسات میں تبدیلی ہو رہی تھی اور اس تبدیلی کے شعور کے باوجود میرے اندر جذبات کوئی طوفان نہیں اٹھا رہے تھے۔

Marfat.com

بابا خیرو کی لڑکی

شادی بیاہ پر خدمت کرنے اور مرگ وغیرہ پر مختلف کاموں کے علاوہ صفیں بچھانے والے بابا خیرو کی لڑکی شمی مجھے اچھی لگتی تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ وہ میری آنکھوں کے سامنے رہے۔ آنے بہانے اس کو دیکھنے کی خاطر اس کے گھر کے قریب سے گزرتا اور وہ مجھے نظر آ ہی جاتی۔ ایسے لگتا جیسے وہ بھی مجھے دیکھنا پسند کرتی ہے۔ شمی اپنے بچپن ہی میں چند دن نزلہ، زکام، کھانسی اور بخار میں مبتلا رہ کر انتقال کر گئی۔ اس کی ماں اور بہنوں نے رو رو کر بُرا حال کر لیا۔ اس کی میت کو سفید کفن میں لپیٹ کر قبرستان میں دفن کرنے کے لیے لے گئے۔ میں بھی جنازے کے ساتھ گیا۔ میں بچہ تھا لیکن مجھے بڑا دکھ ہوا کہ شمی مجھ سے یکایک کیوں بچھڑ گئی ہے؟ میں درد کی میٹھی سی آنچ شناخت نہیں کر سکتا تھا لیکن اس کی موت کو عرصے تک محسوس کرتا رہا۔ شاید یہی محبت کی آنچ تھی۔

شہناز اور شمشاد

ہمارے گھر کی کھوئی سے پانی لینے کیلئے آنے والی دو سگی بہنوں کے بارے میں بھی میرے احساسات کچھ اس قسم کے ہی تھے۔ وہ بھی مجھے بہت اچھی لگتی تھیں۔ ایک کا نام شہناز تھا جو بہت خوبصورت تھی۔ دوسری بہن شمشاد اگرچہ اتنی خوبصورت نہ تھی لیکن اس میں ایک خاص نوعیت کی بڑے غضب کی کشش تھی۔ اس کے بات کرنے کا انداز انوکھا تھا۔ اٹھنے بیٹھنے اور چلنے کا وقار نرالا تھا۔ دیکھنے اور مجھے بلانے کا طریق ایسا تھا کہ خواہ مخواہ میرا دل چاہتا کہ میں اس کے اردگرد ہی پھرتا رہوں۔ یہ اعتراف کرنا کوئی غیر معمولی بات نہ ہو گی کہ ''میرا مزاج لڑکپن سے ہی عاشقانہ تھا۔'' میں ہر خوبصورت لڑکی کو دل دے بیٹھتا۔ خوبصورت دلکش شخصیت کے سامنے دل و دماغ پر قابو نہ رہتا تھا۔ میری کیفیت کچھ یوں ہو جاتی:

تیرے کوچے اس بہانے مجھے دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا

Marfat.com

میں چاہتا تھا کہ شہناز اور شمشاد الگ الگ میرے ساتھ چُہلیں کریں۔ گویا یہ احساس بھی موجود تھا کہ ان دونوں بہنوں کو میری حرکات کا علم نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ وہ دونوں میرے لئے اچھے خیالات رکھتی تھیں، یا شاید دونوں مجھ سے محبت بھی کرتی تھیں۔

شہناز چھوٹی عمر میں فوت ہو گئی۔ لیکن شمشاد سے محبت چلتی رہی۔ قول و قرار بھی ہوئے لیکن ”اے بسا آرزو کہ خاک شدہ“ ہوا وہی جو اکثر ہوتا ہے۔ والدین نے اس کی شادی اس کی مرضی کے خلاف دوسرے گاؤں میں کر دی اور یوں میری یہ طوفانی محبت اپنے انجام کو پہنچ گئی ــــــ نہ جانے کیوں دو محبت کرنے والے دلوں کے درمیان لوگ حائل ہو جاتے ہیں۔

وقت گزرتا رہا اور اب گردشِ ایام مجھے لاہور لے آئی جہاں میں شاہ عالم مارکیٹ میں قسمت آزمائی کر رہا تھا۔ ایک دن مجھے اپنا ہاتھ دکھانے کا اشتیاق ہوا۔ میں نے وقت کے مشہور پامسٹ میر بشیر سے وقت لیا۔ اور ان کے پاس فلیٹی ہوٹل میں پہنچا۔ انہوں نے میرے ہاتھ کی لکیروں (ریکھاؤں) کو دیکھ کر مجھے کچھ باتیں بتائیں جن کا تعلق مستقبل سے تھا۔ میں نے ان باتوں کو سن کر میر صاحب کے چہرے کی طرف ایسے انداز سے دیکھا جیسے مجھے ان کی مستقبل شناسی پر یقین نہ ہو۔ انہوں نے بھی میرے چہرے پر پھیلی ہوئی بے یقینی کو پڑھ لیا تھا۔ انہوں نے کہا۔ بھئی! تمہارا ہاتھ بڑی واضح ریکھائیں رکھتا ہے جو مجھے تمہارا مستقبل ہی نہیں ماضی بھی بتا رہی ہیں۔ کیا تم لڑکپن میں دو سگی بہنوں سے محبت نہیں کرتے رہے؟ میں یہ سن کر حیران رہ گیا کہ کئی دہائیوں کے بعد میرا ہاتھ پامسٹ کے سامنے سارا سچ بول رہا تھا؟

اپنے گاؤں کی باتیں

یہ بات بھی میرے احساسات اور محسوسات ہی میں شمار ہو گی کہ اپنے گھر کے چوبارے کی چھت پر بیٹھ کر شمال میں ہمالیہ کی برف سے ڈھکی چوٹیاں دیکھنا مجھے بہت بھلا لگتا تھا۔ صبح کی چمکتی دھوپ کا عکس ان کو خوب چمکائے رکھتا۔ گرمیوں کی صبحوں میں یہ چمک نیلی دھاریاں بن جاتی جو دراصل برف کے پگھلنے کے عمل کا عکس ہوتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اچانک گھٹائیں امنڈ کر آتیں

Marfat.com

اور سارا منظر ڈھانپ لیتیں۔ گھٹاؤں کی سیاہی کے پیش منظر میں اڑتے بگلوں کی سفید قطاریں خوبصورت منظر پیش کرتیں۔ اب بڑھاپے کی عمر میں مَیں سوچتا ہوں کہ بچپن کا زمانہ کتنا خوبصورت زمانہ تھا۔ ہوا کی سرسراہٹ میں جلد ہی بارش کے سرلائے دیکھتے ہی دیکھتے پورے منظر اور ماحول کو بدل دیتے۔ خنکی چھا جاتی۔ میری ماں نیچے سے مجھے پکارتی اور میں نیچے آتے آتے اپنے کپڑے بھگو لیتا تاکہ باہر جا کر اپنے ہم عمر لڑکوں سے کھیلوں اور گاؤں کے جوہڑ کو پانی سے بھرتا ہوا دیکھوں۔

گاؤں میں سڑک کے ساتھ ہی تقریباً سارے گھروں کے کنویں تھوڑے فاصلہ پر تھے، ان سے کھیتوں کو پانی مہیا ہوتا تھا۔ مویشی پانی پیتے تھے اور لوگ نہاتے تھے۔ لڑکیاں یہاں آ کر کپڑے دھوتی تھیں۔ کنوؤں کے اردگرد کھیتوں میں کئی پھل دار درخت تھے، ان میں کئی قسم کے آموں کے درخت بھی تھے، بچے ٹہنیوں سے لگے ہوئے آم روڑے یا مٹی کے ڈھیلے مار کر توڑ لیتے اور مزے لے لے کر کھاتے...... ہمارے کھیتوں میں دیگر اجناس کے علاوہ گاجریں، مولیاں، کدو اور ٹینڈے وغیرہ بھی کاشت کئے جاتے۔ خربوزے اور تربوز بھی ہوتے تھے میں اور میرا دوست ''بشیر بہشتی'' اکثر دھاوا بول دیتے اور گاجریں، مولیاں اور کچے خربوزے توڑ کر کھا جاتے، ہمیں کھیت میں دیکھ کر دور سے بڑے تایا ہمیں ڈانٹتے، لیکن اس وقت تک ہم اپنا کام کر چکے ہوتے...... تربوز جب پک جاتا، تو شام کو اس میں سوراخ کر کے تھوڑی سی چینی ڈال کر بند کر دیا جاتا اور صبح جا کر اسے بیل سے توڑ کر لے آتے اور کنویں پر بیٹھ کر کھاتے۔

میر خلیل احمد میرا گہرا دوست تھا وہ میرے ساتھ رسول پور بھلیاں میں پڑھتا تھا۔ ہمارا ایک دوسرے کے گھر بہت آنا جانا تھا۔ یہ اپنے گاؤں بھاگو وال سے جب بھی مجھے ملنے کیلئے میرے گھر آتا تو میری ماں چاول پکا کر اس کے اوپر دہی اور چینی ڈال کر ہمیں دیتی، یہ ڈش میرے دوست کو بھی پسند تھی۔ اس میں چونکہ خلوص اور محبت رچی بسی ہوتی۔ لہٰذا وہ بہت ہی مزا دیتی۔

ہمارا گھر تحصیل نارووال کے بڑے مشہور قصبے ظفروال کی سمت جانے والی کچی سڑک

Marfat.com

(اب پکی بن چکی ہے) کے اوپر واقع تھا۔ گھر اور سڑک کے درمیان کوئی رکاوٹ حائل نہ تھی۔ دور تک کھلا منظر تھا جو فصلوں کے رنگوں ہی سے بدلتا تھا۔ میں دور کشمیر کی ریاست کی سرحد تک کا نظارہ بھی اپنے چوبارے کی چھت سے کیا کرتا تھا۔ اونچی جگہ بیٹھنا اور افق میں گھورنا میری ایک دل پسند عادت تھی۔

سحری کے وقت اٹھ کر چکی پیسنا، اوکھلی میں چاول چھڑنا اور صبح کو بھینس کو بھوسہ ڈال کر دودھ نکالنا یہ سارے کام میری ماں خود کرتی رہی۔

ہماری حویلی کے سامنے کا سڑک تک کا کھلا کھلا منظر زیادہ تر میری بے جی کے استعمال میں رہتا تھا۔ وہ اس منظر کو ظفر وال جانے والی سڑک تک وسعت دے دیتی تھیں۔ وہاں تک سڑک پر کوئی درخت، ٹیلہ، مکان یا جھونپڑی بھی نہ تھی۔ وہ بس اپنے "بیٹے" کو سکول یا آوارہ گردی سے واپس آتا دیکھنے کی متمنی ہوتیں تا کہ ادھر وہ سڑک پر نمودار ہو ادھر وہ اس کے لئے گرما گرم پُوڑے (میٹھی روٹی) تیار کر لیں۔ وہ میرے گھر پہنچنے سے قبل میرے دوپہر کے کھانے کا بندوبست کر لیتی تھیں۔ خصوصی طور پر وہ میرے لئے حلوہ، میٹھے چاول اور برسات میں پُوڑے تیار کرتی۔ السی کی پنیاں، ماش کی دال کا حلوہ، سوجی کی برفی تو ایک معمول کی بات تھی۔ ہم سب گرمیوں میں رات کو چھت پر مچھر دانی لگا کر سوتے تھے۔ صبح میں چاٹی سے دودھ پر آئی ہوئی موٹی بالائی اتار کر کھا لیتا جو بہت مزیدار ہوتی تھی، دن کو لسی، شربت اور کبھی کبھی ستو بھی مل جاتے۔ بھینس کے لئے چارہ کھیت سے میں خود لاتا۔ اگر کھیت میں چارے کی فصل نہ ہوتی تو کہیں سے گھاس کاٹ کر لے آتا۔ باقی سب کام میری ماں خود کرتی تھی۔

والدین کی وفات

گاؤں میں قیام کے آخری سالوں میں میری ماں بیمار رہی، مقامی طور پر بھی اور سیالکوٹ کے شہری ڈاکٹروں کو بھی دکھایا گیا لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی والا معاملہ ہوا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ماں کا "چیک اپ" کسی بڑے ہسپتال میں کسی سپیشلسٹ سے کرایا جاتا لیکن میں

Marfat.com

ایسانہ کر سکا تھا جس کا افسوس مجھے اب بھی ہے اور مرتے دم تک رہے گا۔ میری یہ مستقل عادت تھی کہ میں جب بھی گھر آتا تو سونے سے پہلے ماں کے پاؤں کو ضرور دباتا۔ ماں مجھے دعائیں دیتی رہتی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں ماں کی کوئی خدمت نہیں کر سکا اور نہ ان کو اپنی مصروفیات اور پریشانیوں کی وجہ سے زیادہ وقت دے سکا۔ مجھے یہ وہم وگمان بھی نہ تھا کہ ماں مجھے اکیلا چھوڑ جائے گی لیکن وہ اپنے اکلوتے لاڈلے بیٹے کے ساتھ میری اکلوتی بہن مختار کو بھی چھوڑ کر سات فروری 1979ء کو اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ ان کے چلے جانے کا صدمہ اس قدر شدید تھا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ کئی سال تک میں روتا رہا۔ بعد میں جب بھی ان کا ذکر ہوتا تو میں اپنے آنسو نہ روک سکتا۔ پھر ناگہانی افتاد یہ آپڑی کہ ابا جی بھی چند ماہ بیمار رہنے کے بعد یکم رمضان 1988ء کو خالق حقیقی سے جا ملے (انا للہ وانا علیہ راجعون)۔

اپنے والدین کی روح کے ثواب کے لئے میں مغرب کی نماز کے بعد دو نفل اور ایک مرتبہ سورۂ فاتحہ، تین بار سورۂ اخلاص، ایک بار درود ابراہیمی پڑھ کر دعا مانگتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

کان میں درد

میں ابھی سات آٹھ سال کا نہیں ہوا تھا کہ ایک دن میرے کان میں شدید درد اٹھا۔ میں نے رو رو کر اپنی ماں کو پریشان کر رکھا تھا لیکن درد تھم ہی نہیں رہا تھا۔ کسی عورت نے ماں کو بتایا کہ ساتھ والے گاؤں میں ایک بزرگ دم کرتا ہے اور درد جاتا رہتا ہے ماں نے فوراً ایک آدمی بھیج کر اس دم کرنے والے شخص کو بلایا۔ اس نے مجھے نیچے زمین پر بٹھا کر اپنی انگلی پر زمین سے تھوڑی سی خاک لگائی اور پھر اس خاک پر کچھ پڑھنے کے بعد میرے کان پر لگاتے ہوئے مجھ سے پوچھا ''درد کا کیا حال ہے؟''

''پہلے سے تو آرام ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ واقعی میں اس کو اور اس کے کام کرنے کے طریقے کو دیکھتے دیکھتے درد کو کچھ بھول چکا تھا۔ اس نے دوسری بار بھی پہلے والا طریقہ استعمال

Marfat.com

کیا اور درد کا پوچھا۔ میں نے درد کے اور کم ہونے کا اعتراف کیا۔ پھر انہوں نے دم کا عمل تیسری بار کیا۔ اب مجھے مکمل آرام تھا اور اس کے بعد آج تک مجھے کبھی کان کا درد نہیں ہوا۔ یہ کلام اللہ کی تاثیر تھی۔

ایک مرتبہ مجھے ٹائیفائیڈ ہو گیا۔ ان دنوں اس بخار کو معیادی بخار کہا جاتا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ میں بخار کی شدت میں واہی تباہی بھی بک رہا تھا۔ ساتھ والے گاؤں سے ایک حکیم کو بلایا۔ مگر بخار نہ اترا۔ نیم بے ہوشی کی حالت میں اس حکیم کو میں نے گالیاں بھی دیں۔ پھر مجھے رسول پور بھلیاں حکیم کے پاس لے جایا گیا مگر دوائی نے کوئی اثر نہ کیا۔ اسی دیہات میں ڈسٹرکٹ بورڈ کی ڈسپنسری بھی تھی جسے ہسپتال کے نام سے پکارا جاتا تھا، وہاں بھی لے جایا گیا۔ کئی دن مکسچر پیتا رہا، بخار نہ اترنا تھا نہ اترا۔ کسی نے شہر لے جا کر علاج کرانے کو کہا تو میرے والد صاحب مجھے شہر بھی لے گئے لیکن بخار اس قدر ظالم تھا کہ اس نے مجھے دبوچے ہی رکھا اور تقریباً ایک ماہ بعد بخار ٹھیک ہوا۔

دانت میں درد

میں جب رسول پور بھلیاں میں پڑھتا تھا تو ایک دفعہ میرے دانت میں شدید درد ہوا، میں سکول کے ساتھ ہی ڈسپنسری (ہسپتال) میں ڈاکٹر کے پاس دانت میں درد کیلئے دوائی لینے گیا۔ اس نے میرے دانت دیکھنے کے بعد کہا تھا کہ "دانت بڑے گندے ہیں۔ اگر تم روزانہ مسواک کرنے کی ہمت نہیں کر سکتے تو کم سے کم گنا ہی چوس لیا کرو" حقیقت یہ تھی کہ اس دور میں لوگوں کو صحت کا شعور ہی نہ تھا۔ نزلہ، زکام، کھانسی، آشوب چشم اور چھاتی کے درد وغیرہ عام تھے اور ان کے علاج کا کوئی معقول انتظام نہ تھا۔ تربیت یافتہ معالج کہیں دور دراز شہروں ہی میں دستیاب تھے۔

وبائی امراض پھیلتے تو محکمہ صحت کے افراد آتے اور کچھ تبلیغی اور اصلاحی قسم کے اشتہارات دیہات میں لگا کر چلے جاتے۔ اگر وبائی امراض پھوٹ پڑتے تو ٹیکے لگانے والے یا ادویات تقسیم کرنے والے افراد ضلعی افسر صحت کے دفتر سے آتے اور چند دیہات میں دو چار دن

Marfat.com

اپنا کام انجام دے کر چلے جاتے۔

ایک زوردار تھپڑ

باجڑہ گڑھی کے ملک فیض صاحب بہت بڑے شیعہ لیڈر تھے۔ ہر سال محرم میں باقاعدہ مجلس اور ماتم وغیرہ کا اہتمام کرتے۔ بچے یہ دینی ماتم دیکھنے کے لئے چلے جاتے، بچپن میں ایک دفعہ اپنے گاؤں کے بچوں کے ہمراہ میں بھی یہ سب کچھ دیکھنے کے لئے باجڑہ گڑھی چلا گیا۔ مجلس دیکھنے کے لئے ہم سب بچے ایک مکان کی چھت پر چڑھ گئے۔ مکان کے ساتھ والے گھر کے کھلے صحن میں خواتین کی مجلس وغیرہ تھی لیکن ہمیں یا کم سے کم مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ یہاں کون لوگ ہیں اور وہاں کیا ہو رہا ہے، میرا دھیان کسی اور طرف تھا۔ اچانک چھت پر ایک آدمی آیا اور اس نے ایک زناٹے دار تھپڑ میرے منہ پر جڑ دیا، میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا، دوسرے بچے فوراً بھاگ گئے، مجھے سمجھ نہیں آئی کہ اس نے مجھے تھپڑ کیوں مارا، غالباً اس نے یہ سمجھا ہوگا کہ میں عورتوں کو تانک جھانک رہا ہوں۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں تھا۔ یہ تھپڑ مجھے اب تک یاد ہے۔

بٹیروں کا شکار

مجھے بٹیر پکڑنے کا بڑا شوق تھا اپنے دوست اور تایا زاد بھائی بشیر عرف بہشتی کے ساتھ جال لے کر اکثر صبح کے وقت کھیتوں کی طرف نکل جاتا اور ہم دونوں بہت سے بٹیر پکڑ کر لے آتے، شروع میں ایک دفعہ جال لگایا تو بہت سے بٹیر جال کے پاس پہنچ گئے۔ میں نے آگے سے جا کر پکڑنے کی کوشش کی تو سارے اُڑ گئے۔ میرے ساتھی نے بتایا کہ یہ طریقہ بالکل غلط ہے۔ بٹیروں کو ہمیشہ پیچھے سے پکڑنا چاہیے۔ میں نے اس طریقہ پر عمل شروع کر دیا اور خوب بٹیر پکڑے۔ خود بھی کھائے اور دوستوں کو بھی کھلائے۔

☆☆..........☆..........☆☆

Marfat.com

Marfat.com

وہ سنہرا زمانہ

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ
وہ مخملیں چمن کی وہ میرا آشیانہ

بچوں میں گھومنے پھرنے، نئی نئی چیزوں، جگہوں، پرندوں کو دیکھنے کی فطری خواہش ہوتی ہے۔ بعض بچے تو کیڑوں تک کو پکڑ لیتے ہیں ان سے خوف نہیں کھاتے۔ ماں باپ کہیں جانے کا نام لے لیں تو پیچھے ہی پڑ جاتے ہیں کہ جلدی چلیں۔ باہر جانے کی خوشی میں کچھ کھاتے پیتے بھی نہیں۔ جستجو، تلاش اور لگن کا یہ فطری جذبہ مجھ میں بھی تھا۔ اپنے گاؤں سے کہیں دور اپنے ننھیال سرگودھا کے چک 86 میں جاتے آتے رہنا میرا محبوب مشغلہ تھا۔ گاؤں میں ادھر اُدھر گھنٹوں، پگڈنڈیوں، ندی نالوں پر گھومتے رہنا، اور بارشوں میں اپنے ہجولیوں کے ساتھ نہانا مجھے بہت پسند تھا۔ اس زمانے میں کھیلے جانے والے کھیل، گلی ڈنڈا، بنٹے (کنچے)، اخروٹ اور لکن مٹی میں نے جی بھر کر کھیلے۔ سکول پہنچا تو وہاں والی بال، فٹ بال اور رگڑ بچ کی ٹیموں میں خوب حصہ لیا۔ چاندنی راتوں کو آدھی آدھی رات تک باہر کھلے میدان میں ہم کوکلا چھپاتی کھیلتے رہتے تھے۔ اب تو ان کھیلوں کی یادیں ہی رہ گئی ہیں۔

سرخ آندھی کا آنا

بچپن کے دور میں کئی مرتبہ سرخ آندھی آتی دیکھی۔ جب یہ آندھی آتی تو ہر کسی پر ملال کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ لوگ ایک دوسرے سے کہتے کہ کہیں کوئی قتل ہوا ہے۔ سرخ رنگ خون۔

Marfat.com

کی علامت تو ہے لیکن آندھی کے اس رنگ کے ہونے کی کئی وجوہات ہو سکتی تھیں۔ایک وجہ تو یہ تھی کہ کھیتوں میں برساتی طغیانیوں کا پانی سرخ رنگ کی مٹی کی تہہ بچھا دیتا تھا۔مٹی کی یہ تہہ جہاں کھاد کا کام کرتی تھی، وہاں زیادہ سوکھ کر دھول بن جاتی جب آندھی آتی تو اس مٹی کو ساتھ اڑا لاتی جو آندھی کو سرخ بنا دیتی۔

آج کے دور میں شہر میں رہنے والوں کو تو روشنیوں کے سیلاب میں کبھی تاروں بھرا آسمان دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوتا۔اس پر مستزاد یہ کہ پٹرول، ڈیزل اور فیکٹریوں کی چمنیوں سے دھواں فضا میں جمع ہو جاتا ہے۔لوگ پوش علاقے میں رہنے کے باوجود جب صبح کھانس کھانس کر گلا صاف کرتے ہیں تو اندر سے کالی تھوک برآمد ہوتی ہے۔اخبارات قتل و غارت کی خبروں سے بھرے ہوتے ہیں۔کلاشنکوف کا ایک برسٹ مار کر آنِ واحد میں کئی بے گناہ لوگوں کا خون بہا دیا جاتا ہے۔اگر بچپن میں دیکھی ہوئی آندھیاں قتل کی وارداتوں کا نتیجہ ہوتیں تو آج سرخ جھکڑوں اور طوفانوں ہی کا دور دورہ ہوتا۔فطرت تو اپنے قوانین کبھی نہیں بدلتی۔

بعض اوقات موسم کی اپنی اندرونی کیفیات کے تحت گھٹائیں امنڈ کر آتیں اور پورا آسمان ہی ڈھانپ لیتیں۔موسم خوش گوار اور کھیلنے والا ہو جاتا۔بارہ برس کی عمر تک کے لڑکے لڑکیوں کی محفلوں میں بے تکلف شامل ہو جایا کرتے تھے۔ایسے موسم میں لڑکیاں اپنی پرانی گڑیوں کو جو کپڑے اور روئی سے بنی ہوتی تھیں، کھلے میدانوں یا کھیتوں میں جلاتیں اور ساتھ ساتھ یہ لوک گیت گاتیں۔

گڈی گڈا ساڑیا
وس مینہا کالیا

(اے سیاہ بارش برس اور خوب برس کہ ہم نے گڑیا اور گڈے کو جلا دیا ہے) اگر اتفاق سے گھٹائیں برس پڑتیں تو لڑکیاں اور لڑکے بارش کے برسنے میں اپنی کاروائی کا عمل دخل شمار کرتے۔بچپن کا وہ سنہری دور کبھی یاد آتا ہے تو سارا منظر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔جب

Marfat.com

کالی گھٹائیں آسمان پر نظر آتیں تو کتنی بھلی معلوم ہوتیں، بچے بچیاں مختلف گیت الاپتے، بارش ہوتی تو اس میں خوب نہاتے، اودھم مچاتے اور فطرت کی خوبصورتیوں سے لطف اندوز ہوتے۔

1947ء کی یادیں

ہمارے گاؤں دیووال میں ہندوؤں کا صرف ایک ہی گھر تھا۔ سکھ گھرانہ بھی کوئی نہ تھا۔ ہندو گھرانے کا ایک لڑکا گیان چند میرا دوست تھا، ہم باجڑہ گڑھی کے لوئر مڈل سکول کی نچلی جماعتوں میں اکٹھے پڑھتے رہے۔ 1947ء میں پاکستان بنا تو گیان چند اپنے خاندان کے ساتھ جموں چلا گیا۔ دوستی خیالات، عادات اور دلچسپیوں میں ہم آہنگی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ گیان چند بھی میری طرح سکول سے بھگوڑا رہنے والا طالب علم تھا۔ تعلیم کے برعکس کھیل کود میں اس کی دلچسپی زیادہ تھی۔ اور دیوالی کے تہواروں میں ہم مسلمان لڑکے بھی ان کے ساتھ برابر کے شریک ہوتے اور اپنے ماں باپ کی سرزنش کی پرواہ بھی نہ کرتے۔

ہمارے علاقے میں دو تین گاؤں ایسے بھی تھے جن میں ہندوؤں اور سکھوں کی اکثریت تھی لیکن مسلمانوں کے ساتھ ان کے تعلقات دوستانہ تھے۔ آپس میں لین دین تھا۔ ایک دوسرے کی شادی بیاہ یا مرگ وغیرہ میں شامل ہوتے تھے۔ مذہبی چھوت چھات تو تھی۔ ایک دوسرے کی رسوم ورواج بھی مختلف تھے لیکن پھر بھی ایک دوسرے سے نفرت نہیں تھی۔ تقریبات پر ہندو کھانوں اور مسلمان کھانوں کا انتظام علیحدہ علیحدہ کیا جاتا تھا۔ جہاں ممکن ہوتا وہاں اسی طرح کے تعلقات قائم رکھے جاتے جیسے اپنی ذات برادری میں ہوتے ہیں۔ سکھوں کی کئی برادریاں مسلمانوں میں بھی تھیں اور مسلمانوں کی سکھوں میں تھیں۔ ان برادریوں کے بزرگ کسی دور میں مسلمان ہو گئے تھے۔

1947ء میں انتقال آبادی ہوا اور ہندو اور سکھ اپنے مال اسباب کے ساتھ جموں چلے گئے۔ کسی مسلمان نے ان کو لوٹا نہ ان کی جانیں تلف کیں بلکہ ان کو بحفاظت سرحد پر پہنچایا۔ ہمارے سارے علاقے میں قتل کی صرف چار یا پانچ وارداتیں ہوئیں۔ ان فسادات میں جموں کی

Marfat.com

سرحد سے کچھ لوگ پاکستان آ گئے تھے۔ان میں چھوٹے بچے بھی تھے، جن کے والدین جموں میں قتل ہو گئے تھے۔ایک لڑکے اور لڑکی کو میری پھوپھی چراغ بی بی نے اپنی گود میں لے لیا۔ ان کی اچھی پرورش اور تربیت کی۔ دونوں ہمارے گھر میں بڑے ہو گئے۔لڑکی کا نام ''سرداراں'' تھا، پھوپھی نے اس کا نکاح اپنے بھتیجے خورشید احمد سے کر دیا، اب یہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ سکون سے زندگی بسر کر رہے ہیں، ان کا ایک بیٹا سعودی عرب میں کام کرتا ہے اور اچھی خاصی رقم اپنے والدین کو بھیجتا ہے۔اس کی شادی بھی ہو چکی ہے۔''سرداراں'' کا بھائی جس کا نام محمد عالم ہے بہت ذہین اور زندہ دل آدمی ہے، کچھ عرصہ یہ میرے پاس لاہور میں بھی رہا ہے پھر واپس گاؤں چلا گیا تھا۔اس کی شادی ہوئی لیکن نباہ نہ ہو سکا۔آج کل یہ کسی گاؤں کی ایک درگاہ میں کسی بزرگ کے پاس اللہ اللہ کر رہا ہے۔

گاؤں کا ساون

ساون میں بادل امنڈ کر آتے اور بارش کھل کر برستی۔ندی نالے، کھیت کنویں اور جوہڑ سب بھر جاتے۔سطح زمین پانی کی ہموار چادر نظر آتی۔زرد رنگ کے مینڈک ہزاروں کی تعداد میں نہ جانے کہاں سے آ جاتے اور کھیتوں کی منڈیروں پر بیٹھ کر ایک ساتھ ٹراتے۔چوہے، سانپ، نیولے خشک جگہ کی تلاش میں ادھر ادھر نکل جاتے کچھ درختوں پر بھی چڑھ جاتے جہاں سے انہیں چیلیں، اور شکرے پکڑ کر کھانے کیلئے اونچے درختوں پر لے جاتے۔جو انسانوں کے ہتھے چڑھ جاتے وہ مارے جاتے۔کن کھجورے اور بچھو وغیرہ بھی اپنی جانیں بچانے کیلئے زمین کے نیچے پانی بھر جانے سے گھروں کے کچے فرشوں پر نکل آتے۔اور کوّوں مرغیوں اور چوزوں کا مرغوب کھاجا بن جاتے۔سانپ اور بچھو کے کاٹنے کی وارداتیں بھی ہوتیں۔جس کسی کو سانپ کاٹتا تو اس کے عزیز واقارب اسے لے کر خانہ بدوشوں کی طرف دوڑتے کہ منکہ لگوائیں۔منکہ زہر کو جسم سے چوس لیتا تھا۔بالکل اسی طرح جیسے ڈراپر کی ربڑ کی ٹوپی دوائی کو شیشے کی نالی کے اندر کھینچ لیتی ہے۔ بچھو کا کاٹا بچہ تو درد سے رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیتا۔خود میرے پاؤں پر دو دفعہ بچھو نے کاٹا ہے۔

Marfat.com

بچھو اگر نظر آجاتا تو اسے مار کر کاٹے جانے کے نشان پر مٹی کا تیل لگانے کے بعد باندھا جاتا۔ اسے یہ درد کا توڑ سمجھا جاتا تھا۔ غرضیکہ اس قسم کی تکلیفیں بارش کا حصہ تھیں۔ جب کہ بڑے مصائب میں، کچے مکانوں کا گر جانا، گڑھوں یا نالوں میں کسی کا گر جانا اور مویشیوں کے لئے چارے کی کمی اور بھری ہوئی فصلوں کا ڈوب جانا شامل تھے۔ ان دنوں گھر میں بیت الخلاء نہیں ہوتے تھے۔ رفع حاجت کے لئے کھیتوں میں جانا پڑتا تھا۔ برسات کے موسم جہاں خشک جگہ ملتی رفع حاجت کے لئے استعمال کر لی جاتی لیکن اس سے بدبو بھی پھیل جاتی تھی۔ دوسری طرف جوہڑوں کے بھر جانے کی وجہ سے برسات کی پہلی بارش پیغامبرِ حیات بھی تھی۔

میلے ٹھیلے اور ناٹک

بندر اور ریچھ کا تماشہ دکھانے والے، کلائی پر آہنی کڑے چڑھا کر ہاتھ میں پکڑے لکڑی کے ڈنڈے مار کر گانا گانے والے، پھوڑے پھنسیوں پر جونکیں لگانے والے، طوطے سے فال نکلوانے والے، آیتوں کے دم سے مختلف روگوں کا علاج کرنے والے، دور دراز خانہ بدوشوں کے ڈیروں سے آتے اور اپنے اپنے فن کے تماشے دکھا کر پیسہ دو پیسے، آٹا، چاول وغیرہ اکٹھے کر کے چلے جاتے۔ کئی فقیر تماشے تو نہ دکھاتے لیکن ہر دروازے پر "دعا فقیراں، رحمت مولا" کی صدا لگا کر خیرات پاتے۔ چند مشہور گویے بھی تھے جن کے ناموں سے ان کے گراموفون ریکارڈ بھی بنے ہوئے ہیں۔ یہ جس گاؤں میں آتے وہاں کے لوگ اردگرد کے دیہاتوں میں ان کی آمد کی مشتہری کرتے۔ پھر ساری ساری رات گانے کی محفل جمتی۔ وہ اپنی مرضی سے اور سامعین کی فرمائش پر بھی لوک گیت سناتے۔ لوگ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق بڑھ چڑھ کر ان کو "ویلیں" دیتے۔

اسی طرح ناٹک کرنے والے گروپ بھی آتے۔ خواتین کا کردار ادا کرنے کیلئے ان میں نوجوان خوبصورت لڑکے ہوتے۔ وہ ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال اور سسی پنوں جیسے مشہور عاشقوں کے سوانگ بھرتے۔ مکالمے بولتے اور گاتے۔ ہیروئن کا کردار ادا کرنے والا لڑکا نسوانی آواز میں گاتا اور اس پر خوب روپے نچھاور ہوتے۔ اس دور کا ایک روپیہ آج کے دور کے پچاس روپوں

Marfat.com

سے زیادہ قیمتی ہوتا تھا۔

یہ ناٹک دکھانے والے راس دھاریے کہلاتے تھے۔ ان کا ایک ایک کھیل تین تین راتیں چلتا رہتا۔ ان تماشائیوں میں معززین بھی شامل ہوتے اور وہ کرسیوں پر اگلی صفوں میں بیٹھتے۔ کوئی ٹکٹ نہ ہوتا۔ انعام میں دی جانے والی دونّی، چونّی یا اٹھنی پیتل کے تھال میں ڈالی جاتی جس میں سرسوں کے تیل کا دیا یا موم بتی جلا کر رکھی جاتی تھی۔ ایک روپیہ کا انعام بہت بڑا ہوتا تھا۔ خوبصورت راس دھاریہ چاندی کے روپے کا سکہ اس تماشائی کے ہاتھ سے پکڑتا، چومتا اور سارے مجمعے میں اعلان کرتا کہ یہ انعام کس شخص نے دیا ہے۔ راس دھاریوں کو خالی ہاتھ بھیجنا توہین خیال کیا جاتا تھا اور یہ رواج کے خلاف بھی تھا۔ کہیں کبھی شعبدہ باز دِن کے وقت گاؤں کی چوپالوں اور کھلی جگہوں پر وارد ہوتے۔ وہ گاؤں میں داخل ہوتے ہی ایسی ڈگڈگی بجاتے کہ بچے کونوں کھدروں سے نکل کر چوپالوں کی طرف دوڑتے۔ میں خود ایسے کھیل تماشوں کا شیدائی تھا۔ میں تو ڈگڈگی کی آواز پر سکول سے بھی بھاگ نکلتا تھا۔ میرے ساتھ میرا ہندو دوست گیان چند بھی ہوتا تھا۔

کبھی کبھی جسمانی کرتبوں کے ماہر بازی گر اور نٹ بھی دیہات میں آ کر اپنا کیمپ لگاتے۔ ان کا ایک ساتھی ڈھول بجاتا اور باقی قلا بازیاں کھاتے، تنے ہوئے رسے پر چڑھ جاتے۔ وہ اپنا توازن قائم رکھنے کے لئے ایک بانس اٹھا لیتے۔ رسے پر چلتے چلتے ایک طرف سے دوسری طرف نکل جاتے اور داد پاتے۔ بانسوں پر کرتب دکھانا ان کا معمول تھا۔ جو کچھ ہم آج کل سرکسوں میں دیکھتے ہیں، وہی کرتب نٹ کرتے تھے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے بچے بھی ماہرانہ نوعیت کے تماشے اور جسمانی کرتب پیش کرتے۔

تماشے کے دوران میں تماشائیوں کو راغب کرنے اور جمے ہوئے مجمعے کو قائم رکھنے کیلئے کئی قسم کی افواہیں پھیلائی جاتیں۔ کبھی کبھی کھیل تماشوں کے علاوہ بھی کوئی نہ کوئی افواہ ایسی چھوڑ دی جاتی جس سے ڈر کر بچے گھروں ہی میں رُک جاتے۔ ایسی افواہیں بعض اوقات خود والدین گھڑ کر پھیلاتے

Marfat.com

تھے۔اس دور میں افواہوں کی اہمیت ایسی ہی تھی جیسی اب ہے۔

راستہ روکنے والی بلا

گاؤں میں مسجد کے پاس ایک بہت پرانا برگد (بڑ) کا درخت تھا۔جس کے گرد ایک بہت بڑا گول دارہ بنا ہوا تھا۔گرمی کے موسم میں تو دوپہر کو لوگ اس دارے پر چارپائیاں، مصلے، چٹائیاں اور صفیں بچھا لیتے۔گاؤں کی براتوں کا ورود بھی اسی دارے میں ہوتا اور اگر خدانخواستہ کوئی مرگ وغیرہ ہو جاتی تو لوگ جنازہ اٹھنے تک اور بعد میں فاتحہ خوانی کے لئے بھی اسی دارے میں بیٹھتے تھے۔سردیوں میں بھی رات کے وقت دارے پر الاؤ جلائے جاتے اور بزرگ الگ، نوجوان الگ اور لڑکے الگ اپنے ڈیرے جماتے، گپیں ہانکتے، صلاح مشورے کرتے۔سریں بھی الاپتے اور کبھی کبھی گوئیے خود آجاتے یا بلائے جاتے۔راس دھاریوں کو بلایا جاتا اور رات کو ہنگامہ رہتا۔جس کا جی چاہتا وہ اٹھ کر چلا جاتا۔پھر جی کرتا تو واپس آجاتا۔

میرے والد بتاتے تھے کہ ایک مرتبہ میں رات کو ڈیوٹی سے واپس آکر دارے میں بیٹھ گیا۔لوگوں نے بتایا کہ علاقے میں ایک بلا آئی ہوئی ہے جو اکیلے دکیلے شخص کا راستہ روک لیتی ہے۔یہ بلا کسی کو کہتی تو کچھ نہیں لیکن آدمی کا راستہ روک کر اسے خوفزدہ ضرور کرتی ہے۔میرے والد جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں پولیس میں تھے۔وہ اکثر دن بھر کی ڈیوٹی کے بعد رات ہی کو گھر آتے تھے اور پھر اگلے دن واپس شہر میں ڈیوٹی پر حاضر ہو جاتے تھے۔ایک رات وہ اپنے معمول کے وقت کی نسبت کچھ دیر سے آئے۔رات اندھیری تو نہ تھی لیکن چاندنی ذرا نیالے رنگ کی تھی۔ انہوں نے دیر سے آنے کی وجہ یہ بتائی کہ وہ تین میل کا چکر کاٹ کر فلاں فلاں گاؤں سے ہوتے ہوئے آئے ہیں کیونکہ سیدھے راستے میں سڑک کے عین درمیان راستہ روکنے والی بلا کھڑی تھی۔ میں کچھ دیر تو اس بلا کے سامنے کھڑا رہا۔لیکن پھر خوف سے چند قدم پیچھے ہٹ کر میں نے بائیں سمت کو کھیتوں میں سے دوڑ لگا دی اور فلاں فلاں گاؤں سے ہوتا ہوا مغرب کی سمت سے گاؤں میں داخل ہونے کی بجائے مشرق کی سمت سے داخل ہوا ہوں۔تھانے سے میرا راستہ 5 میل بنتا ہے

Marfat.com

لیکن اب میں آٹھ میل کا سفر طے کر کے گھر پہنچا ہوں۔

اگلے روز جب میرے والد واپس ڈیوٹی پر جا رہے تھے تو انہوں نے اس مقام کو غور سے دیکھا جہاں ان کی مڈبھیڑ بلا سے ہوئی تھی۔ انہیں علم ہوا کہ رات جسے وہ بلا سمجھے تھے وہ دراصل ایک ٹنڈ منڈ جھاڑی تھی۔ چاندنی اور اندھیرے نے جھاڑی کو ان دیکھی بلا بنا دیا تھا۔ میرے والد نے جھاڑی کو کاٹ ڈالا افواہوں نے لوگوں کے دلوں میں خوف بٹھا دیا تھا۔ والد صاحب نے اس حقیقت کو پالیا تو پھر اس بلا کا خوف سب کے دل سے نکل گیا اور گاؤں میں داخل ہونے کا راستہ صاف ہو گیا۔ خوف کا احساس اور واہمے ہی بھوت پریت ہوتے ہیں۔ اندھیرے میں ان دیکھی اشیاء کے کئی کئی بازو، ٹانگیں اور سر نظر آتے ہیں اور انسان اپنی داخلی کمزوری سے ڈر جاتا ہے۔

چودھری صاحب اور نتھا

جب بھی کسی دوسرے گاؤں میں تفریح کا موقع آتا تو شائقین ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں تماشا دیکھنے کے لئے چلے جاتے۔ کئی تماشائی اونگھ جاتے اور خالی دستیاب جگہ پر باقاعدہ سو جاتے کہ اب دن چڑھے گھر کو لوٹیں گے۔ بعض لوگ تماشہ ختم ہونے کے بعد گھر کو جاتے تو راستے میں اگر نیند کا غلبہ زیادہ ہو جاتا تو وہیں سر کے نیچے بازو رکھ کر لیٹ جاتے۔ صبح بیدار ہوتے تو گھر کی راہ لیتے۔ آج کے دور کی طرح نہ ہتھوڑے بازوں کا ڈر تھا، نہ پتھروں سے سر کچلے جانے کا خوف تھا۔ آتشیں ہتھیار بھی لوگوں کے پاس نہیں تھے اور جن کے پاس تھے بھی تو وہ محض دکھاوے کے لئے تھے، ان کا استعمال تو دور کی بات تھی۔ یہ ہتھیار بھی شکار کی 12 بور کی ایک نالی یا دو نالی بندوق ہوتی تھی۔ اندھا دھند خوفناک انداز میں تڑاتڑ گولیاں برسانے والی رائفلیں اور کلاشنکوفیں ترقی یافتہ زمانے کی انسان مار ایجادیں ہیں۔

ایک دفعہ ایک راس کے ختم ہونے کے بعد گاؤں کے چودھری صاحب گھر جانے کے لئے اٹھے تو اندھیرے میں کسی سوئے ہوئے شخص سے ٹکرا گئے۔ چودھری صاحب نے پوچھا۔ ''ارے تم کون ہو؟،، سونے والے نے جواب دیا۔''میں ہوں نتھا۔''چودھری صاحب آگے

Marfat.com

بڑھے تو پھر کسی سے ٹکرا گئے۔ نیند کے غلبے ہی میں پھر پوچھا۔ ''تم کون ہو بھائی''؟ جس سے ٹکرائے تھے اس نے کہا ''میں ہوں نتھا'' چودھری صاحب چونک کر رہ گئے۔ ذرا سا آگے جا کر مڑنے لگے تو پھر کسی سے ٹکرا گئے۔ غصے میں اُونچی آواز میں بولے۔ ''تم کون ہو جو راستے میں سو جاتے ہو؟'' اس نے جواب دیا کہ ''میں ہوں نتھا'' چودھری صاحب نے ایک زبردست پھکڑ تولتے (گالی دیتے) ہوئے کہا۔ ''یہ سارا نتھا ہی ہے۔ چل بھئی مولا دادا...... چل تو بھی اپنے نتھے کی ماں کے پاس۔،، چوہدری صاحب کا یہ واقعہ اسی دن پورے گاؤں میں پھیل گیا اور لوگ ایک دوسرے کو سناتے اور ہنستے ہنستے دوہرے ہو جاتے۔ واہ! کیا سہانا اور خوشگوار زمانہ تھا۔

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے

سالانہ میلہ

ہمارے گاؤں میں سال میں دو تین میلے لگتے ہیں، لیکن سب سے بڑا میلہ کٹائی کے موسم میں یکم ہاڑ (اساڑھ) کو لگتا ہے، قبرستان میں پرانے وقتوں کے کسی بزرگ کا مزار ہے جو داتا لکھشیں بادشاہ کے نام سے مشہور ہے'' میرے بچپن میں اس کے مجاور سائیں صادق تھے اب ان کا بیٹا سائیں لال گدی نشین ہے، میلے میں بہت گہما گہمی ہوتی، دور دور سے لوگ آتے، دکانیں لگتیں، تماشے ہوتے۔ کبڈی اور دوسرے کئی کھیل ہوتے۔ بچوں کے کئی پروگرام ہوتے، حلوائی دکانیں لگاتے اور جلیبیاں خوب فروخت ہوتیں۔ قوالی بھی ہوتی اور اس میں کبھی کبھی کسی صاحب کو حال پڑ جاتا اور وہ بے خودی میں جھومنے لگتا۔ وجد کی یہ حالت اس وقت تک طاری رہتی جب تک قوالی ختم نہ ہو جاتی۔ آخر میں لنگر تقسیم ہوتا جس کا سب کو انتظار ہوتا تھا۔ ______ یہ سب کچھ اب بھی ہوتا ہے۔

سیف الملوک

بچپن میں میری آواز بہت اچھی تھی اور میں میاں محمد بخشؒ کی ''سیف الملوک'' اپنی

Marfat.com

سریلی آواز میں ترنم سے پڑھتا تھا۔ اکثر یار دوستوں کے ساتھ محفل جمتی اور گانے کا یہ شغل جاری رہتا۔ کئی دفعہ گھروں میں ملنے جلنے والی خواتین مجھے بلا لیتیں اور رات گئے تک میں اپنے پر اثر انداز میں سیف الملوک پڑھ کر انہیں خوش کرتا اور ان کی دعائیں لیتا۔

باغ بہاراں تے گلزاراں بن یاراں کس کاری
یار ملن دکھ جان ہزاراں شکر کراں لکھ واری

مجھے موسیقی سے بھی بے حد لگاؤ تھا۔ بڑی ضد اور کوششوں سے میں نے والد صاحب سے ایک گراموفون "ہز ماسٹرس وائس" اور کئی مشہور گانوں کے ریکارڈ منگوائے۔ یہ گراموفون ایک مدت تک میرے پاس رہا اور میں اس پر اپنی پسند کے گانے سنتا اور جھومتا رہتا۔ اب یہ سب باتیں خواب و خیال ہو گئی ہیں۔

اب بادۂ شبانہ کی سر مستیاں کہاں

☆☆..........☆..........☆☆

Marfat.com

تعلیمی سرگرمیاں

رسمی تعلیم

آٹھویں جماعت پاس کر لینے کے بعد جے۔وی کی ٹریننگ کے دوران میں مجھے علم ہوا کہ تعلیم کی دو اقسام ہوتی ہیں۔ایک رسمی تعلیم ہوتی ہے اور دوسری غیر رسمی تعلیم ..... رسمی تعلیم وہ ہوتی ہے جو ہمیں اساتذہ کی نگرانی میں سکول و کالج کی جماعتیں پاس کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس میں حکومت کا مقرر کردہ سلیبس پڑھتے اور امتحان پاس کرتے ہیں۔اس تعلیم کی ابتدا میرے بچپن کے دور میں کچی پہلی سے شروع ہوئی تھی۔اب کچی پہلی نرسری کہلاتی ہے۔اس وقت 5 سال کی عمر کے بچے سکول میں داخل کیے جاتے تھے۔ان ابتدائی پانچ برسوں کے دوران بچے کو جسمانی طور پر پھلنے پھولنے دیا جاتا تھا۔چھٹے سال میں بچہ پہلی جماعت میں داخل ہوتا تھا اور لکھنے پڑھنے کی ابتدا کرتا تھا۔میں بھی انہی مراحل سے گزرا تھا۔

غیر رسمی تعلیم

غیر رسمی تعلیم وہ ہے جو ماں کی گود اور جھولے سے شروع ہوتی ہے اور یہ تعلیم قبر تک جاری رہتی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے دوستوں، گلی محلے کے ماحول، گھریلو بود و باش، رشتہ داروں اور ہر ایرے غیرے نتھو خیرے سے کچھ نہ کچھ سیکھتا رہتا ہے۔سیکھنے کا عمل کبھی مکمل نہیں ہوتا۔ غیر رسمی تعلیم میں کوئی جماعت پاس نہیں کی جاتی اور نہ ہی کوئی سرٹیفکیٹ یا ڈگری وغیرہ حاصل ہوتی ہے۔ہاں ذہن کے گوشے ہر تجربے کے ساتھ وسیع ہوتے چلے جاتے ہیں۔حقیقی زندگی کا شعور پیدا ہوتا ہے۔عمر اور مشاہدات کے ساتھ ہر فرد سیانا ہوتا جاتا ہے۔انسانی زندگی میں رسمی اور غیر رسمی

Marfat.com

دونوں تعلیمیں ساتھ ساتھ ہی جاری رہتی ہیں۔رسمی تعلیم تو ایک خاص مدت پر اختتام کو پہنچتی ہے لیکن غیر رسمی تعلیم کا کوئی اختتام نہیں ہوتا۔

دوستی کے زاویے

کسی سکول یا کالج یا یونیورسٹی کے امتحان کے بعد زندگی کے عمل اور معاشی حالت کو بہتر بنانے کیلئے کاروبار یا ملازمت اختیار کی جاتی ہے جس کے لئے رسمی تعلیم ضروری ہوتی ہے۔اس رسمی تعلیم کے لئے مجھے دوسرے گاؤں باجڑہ گڑھی کے لوئر مڈل سکول میں جو چھٹی جماعت تک تھا بھیجا گیا۔دو تین سال تک تو میں سکول میں اساتذہ اور دوسرے بچوں سے دبکا رہا لیکن چوتھی جماعت میں پہنچ کر میں نے پر پرزے نکالنے شروع کر دیئے۔چند کچے اور چند پکے دوست بھی بن گئے۔پکے دوست کی خوبی یہ ہوتی تھی کہ وہ اپنے دوست کا حکم مانتا تھا۔اس قسم کے دوست ''قانونی اور غیر قانونی'' ''جائز اور ناجائز'' کام مل جل کر کرتے تھے اور کسی عام طالب علم اور کچے دوستوں کو اپنا راز نہیں بتاتے تھے۔میرے پکے دوستوں میں گیان چند بھی تھا۔وہ ذہین تھا لیکن سکول میں باقاعدگی سے حاضر نہیں ہوتا تھا۔میں اور وہ اکثر سکول سے بھاگے رہتے تھے لیکن ہمیں کبھی کسی سبق کے یاد نہ کرنے یا گھر کا کام کر کے نہ آنے پر اساتذہ سے سزا نہیں ملی تھی۔اب میں سمجھتا ہوں کہ شاید ہمارا معیار ذہانت ہماری عمر کے مقابلے میں کافی زیادہ تھا۔اسی لئے ہم پڑھنے لکھنے میں تیز تھے۔

جب میں سکول جاتا تو پورا وقت گزار کر واپس آتا۔جب نہیں جاتا تو کئی کئی دن نہیں جاتا تھا۔ایسے دنوں میں میں بیری کے نیچے پکے دوستوں کے ساتھ وقت گزارتا۔تاہم سکول کے جملہ اسباق بھی یاد کرتا اور ہم جماعتوں سے پوچھ کر گھر کا کام بھی کرتا۔تاریخ جغرافیہ سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی البتہ حساب الجبرا، اردو، شہریت اور فارسی سے گہرا لگاؤ تھا۔پاس ہونے کے نمبر میں تاریخ جغرافیے میں بھی لے لیتا۔میں اکثر بے چین رہتا۔میری بے چینی کی وجہ میری یہ خواہش تھی کہ کاش میں اونچی ہواؤں اور دور فضاؤں میں پرواز کرنے والا پرندہ ہوتا یا بادل ہوتا کہ پہاڑوں

Marfat.com

کے اوپر اڑتا۔ آندھی یا طوفان ہوتا کہ جہاں چاہتا وہاں یلغار کر دیتا۔ اور یوں میں خیالوں کی دنیا میں ہر وقت کھویا رہتا۔

بیری کا پیڑ

سڑک سے ہٹ کر کھیتوں کی ایک منڈیر پر بیری کے چند پیڑ تھے۔ ان میں سے ایک پیڑ کچھ عجیب وغریب تھا۔ اس درخت کے پتے بہت اوپر تھے۔ بل کھاتے ہوئے دو بڑے بڑے تنے دو عظیم الجثہ اژدہوں جیسے نظر آتے تھے۔ یہ درخت مرکزی پگڈنڈی سے ہٹ کر تھا۔ یہ سکول سے بھاگ نکلنے والے لڑکوں کے لئے بڑی اچھی پناہ گاہ تھی کیونکہ وہ وہاں بیٹھ کر بغیر کسی کو نظر آئے چھٹی کے وقت کا انتظار کر سکتے تھے۔ میں اور گیان چند سکول سے بھاگ نکلتے۔ ہم دونوں بیری کے درختوں کے تنوں پر بیٹھ کر اپنی دلچسپی کی باتیں کرتے، گپیں ہانکتے اور الٹے پلٹے منصوبے بناتے رہتے تھے۔

میں جب باجڑہ گڑھی سکول میں چھٹی جماعت میں تھا تو اس سال غالباً ملٹری کی بھرتی یا کسی اور مقصد کے لئے ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب کچھ بڑی عمر کے لڑکوں سے انٹرویو لے رہے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کرسی پر بیٹھے تھے اور سامنے میز کے نیچے ان کی ٹانگیں تھیں۔ انہوں نے سامنے والی دیوار کے ساتھ ایک لڑکے کو کھڑا کر کے پوچھا ''تمہیں میز کے نیچے کتنی ٹانگیں نظر آتی ہیں'' اس لڑکے نے جواب دیا ''تین'' یہ سن کر ہال کمرے میں جتنے لوگ تھے سب نے زوردار قہقہہ لگایا۔ پاس کھڑے ایک ماسٹر نے کہا ''کتنی تیز نظر ہے کہ اس کو تیسری ٹانگ بھی نظر آ گئی۔''

ایک روز والد صاحب ڈیوٹی سے جلد فارغ ہو کر گھر واپس آئے تو وہ میری پڑھائی کے بارے میں رپورٹ لینے کے لئے سکول چلے گئے۔ میں اس وقت بیری کے موٹے تنے پر بیٹھا گیان چند کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے وعدے کے مطابق سکول میں اپنی حاضری لگوانے کے بعد بیری کے چھتر کے نیچے آنا تھا۔ میں نے والد صاحب کو سکول جاتے ہوئے دیکھ لیا اور ڈر کے مارے ایک کھیت میں چھپ گیا۔ والد صاحب مجھے اور گیان چند کو سکول میں نہ پا کر جب واپس

Marfat.com

جا رہے تھے تو گیان چندان کو پگڈنڈی پر مل گیا۔ وہ میری سکول سے بھاگنے کی عادت سے واقف تو تھے ہی۔ انہوں نے گیان چند سے پوچھا: ''مقبول کدھر ہے؟'' گیان چند نے کہہ دیا کہ اُسے معلوم نہیں اور پھر والد صاحب کے ساتھ مل کر مجھے ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ میں جس کھیت میں چھپا ہوا تھا گیان چند نے مجھے دیکھ کر والد صاحب کو بتا دیا اور مجھے مجبوراً باہر نکلنا پڑا۔ جبکہ میرا ارادہ ریاستی بارڈر پار کر کے جموں بھاگ جانے کا بن رہا تھا۔ اب میں ایک مجرم کی طرح خود کو ابا جان کے حوالے کر دینے کے بعد گھر پہنچا تو حیرت یہ ہوئی کہ ابا جان نے مجھے یہ بھی نہیں پوچھا کہ تم کہاں تھے؟ البتہ ''بے جی'' نے مجھے چوبارے والے کمرے کے سامنے والے چھوٹے صحن میں لے جا کر جوتوں کے ساتھ میری خوب مرمت کی۔

آج میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میرے والد نے مجھے کبھی بھی کسی بات پر مارا تھا اور نہ سزا دی تھی۔ جب بھی میری درگت ضروری سمجھی گئی تو یہ فریضہ بھی ''بے جی'' نے ادا کیا جو میرے ساتھ بے پناہ محبت کرتی تھیں۔ اب وہ وفات پا چکی ہیں تو ان کی محبت کی مار بھی بہت یاد آتی ہے اور ان کا پیار بھی ستاتا ہے۔

بھائی منظور احمد

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

اللہ نے مجھے ایک بھائی بھی عطا کیا تھا جس کا نام منظور احمد رکھا گیا لیکن وہ چھوٹی عمر ہی میں اللہ کو پیارا ہو گیا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ حویلی کے اندر بندھی بھینس کے نیچے سے گزر کر گھر کے اندر آ جاتا تھا۔ مجھے اس سے بڑی محبت تھی۔ جس کے فوت ہو جانے کے بعد میں اس کی کمی ہمیشہ محسوس کرتا رہا اور آج بھی خود کو تنہا محسوس کرتا ہوں۔ بھائی چھوٹے ہوں یا بڑے، اچھے ہوں یا بُرے بازو ہوتے ہیں۔ اپنے چھوٹے بھائی کے کھو جانے کا غم میں آج تک نہیں بھول سکا۔

میرا چھوٹا بیٹا ارشد مقبول جب دو تین سال کا تھا تو وہ مجھے بالکل اپنا مرحوم بھائی منظور احمد ہی لگتا تھا۔ شکل و صورت کے علاوہ عادات میں بھی ویسا ہی تھا۔ میں ہندوؤں کے مسئلہ آواگون

Marfat.com

پر یقین نہیں رکھتا لیکن ارشد کو دیکھ کر یوں محسوس کرتا ہوں جیسے منظور دوبارہ ہمارے ہی گھر میں پیدا ہو گیا ہو۔ اپنے اس بھائی کی یاد آتی ہے تو میں جذباتی ہو جاتا ہوں۔ آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے ہیں۔

باجڑہ گڑھی سکول سے فارغ ہو کر میں گورنمنٹ مڈل سکول رسول پور بھلیاں میں داخل ہوا۔ باجڑہ گڑھی کے رہائشی صوفی مقصود احمد وہاں ہمارے استاد تھے۔ وہ نہایت نیک، شریف اور پرہیزگار انسان تھے۔ حضرت کرمانوالےؒ کے مرید تھے اور میرے ساتھ خصوصی شفقت فرماتے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ ان سے درخواست کی کہ وہ حضرت کرمانوالےؒ سے کہیں کہ وہ میرے لئے دعا فرمائیں کہ میں اپنی زندگی میں بڑی کامیابی حاصل کر سکوں۔ صوفی مقصود احمد صاحب نے حضرت کو اس بارے میں خط لکھا۔ حضرت کا خط بھی جواباً موصول ہوا کہ برخوردار مقبول احمد کے لئے دعا کی گئی ہے اللہ قبول فرمائے، آمین۔ حضرت صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط صوفی صاحب نے مجھے دے دیا، میں نے اس خط کو بطور تبرک کے اپنے پاس سنبھال کے رکھا تھا، لیکن 1965ء کی جنگ میں کہیں کھو گیا۔ بعد میں مجھے جب بھی اپنی زندگی میں کوئی کامیابی نصیب ہوئی تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور یہ بھی خیال کیا کہ یہ حضرت کرمانوالے" کی دعا کا شرف ہے۔

میں بہت شرمندہ ہوا

میرے والد صاحب چونکہ پولیس میں تھے۔ گاؤں میں چوبارہ اور پختہ اینٹوں کا مکان بھی تھا۔ حویلی بھی تھی۔ زرعی زمین بھی تھی لہٰذا ان اسباب کی بنا پر میں قدرے احساس برتری میں مبتلا ہو گیا تھا حالانکہ اس وقت میں چوتھی جماعت کا نالائق طالب علم تھا لیکن میں خود کو ایک امیر آدمی کا بیٹا سمجھتا تھا۔ ایک مرتبہ کسی نازیبا اور غرور کی بات پر ماسٹر فیروز دین صاحب نے مجھے کہا: "بیٹا اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے۔" اس نرم لیکن دانائی کی بات سے میں بہت شرمندہ ہوا اور میرے غرور میں بھی کمی آ گئی۔ ماسٹر فیروز دین بڑی احترام والی ہستی تھے۔ وہ اچھے اور قابل استاد تھے۔ طلباء کے ہی نہیں سب بڑوں کے بھی محترم تھے۔ اپنے ہر طالب علم کی شخصیت بنانے کی

Marfat.com

کوشش کرتے اور اس کی حرکات وسکنات پر نظر رکھتے تھے۔ زمانہ اب ایسے انسانوں سے خالی ہوتا جارہا ہے۔

پہلی اور آخری پٹائی

ورنیکلر مڈل سکول رسول پور بھلیاں کے ہیڈ ماسٹر محمد عبداللہ صاحب جو بڑے فرض شناس، نیک دل اور قابل قدر استاد تھے، ڈاک کے محکمے کے اضافی طور پر برانچ پوسٹ ماسٹر بھی تھے۔ بہت سے سکولوں کے اوّل مدرس اور ہیڈ ماسٹر اس عہدے پر کام کرنے کا الاؤنس حاصل کرتے تھے۔ اساتذہ کی مدد ہو جاتی تھی اور محکمہ ڈاک کو باقاعدہ ڈاک خانہ کھولنے کا خرچ نہیں اٹھانا پڑتا تھا۔ ایک روز ڈاکیا آیا اور ان کو ایک خوبصورت پیکٹ دے گیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے اس پیکٹ کو اٹھا کر الماری میں رکھ دیا۔ کنڈا چڑھا دیا لیکن الماری کو تالا نہیں لگایا۔ پھر سکول بند ہو گیا اور ہیڈ ماسٹر صاحب سکول سے چلے گئے۔ میںؐ نے اپنے پکے دوست پریتم سنگھ کے ساتھ پروگرام بنایا کہ کل سب سے پہلے سکول آئیں گے اور دیکھیں گے کہ ڈاکیا اس خوبصورت پیکٹ میں کیا لایا ہے۔ اگلی صبح ہم پروگرام کے مطابق سب سے پہلے سکول پہنچ گئے۔

الماری کو تالا تو لگا ہوا نہیں تھا۔ ہم نے اسے کھولا اور پیکٹ کو نکال کر دیکھا۔ پیکنگ کی ہر قسم کی بچ بچا کر کے ہم اس کے اندرون تک پہنچے۔ اس میں سفید سا سفوف تھا۔ اسے چکھا وہ بہت میٹھا تھا۔ اپنے تجسس کو ختم کر کے ہم نے پیکٹ کو پھر سے الماری میں رکھ دیا۔ گو ہم نے پیکٹ سے کچھ نکالا نہیں تھا لیکن صاف پتہ چلتا تھا کہ پیکٹ کو کھولا گیا ہے۔ اس پر نشانات ہی ایسے پڑ گئے تھے کہ ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب جب اپنے کمرے میں آئے اور الماری کھول کر پیکٹ کو دیکھا تو وہ غصے سے لال پیلے ہو گئے۔ دریافت کرنے پر انہیں یہ پتہ بھی چل گیا کہ سکول میں صبح کے وقت آنے والے سب سے پہلے لڑکے مقبول احمد اور پریتم سنگھ تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے چمکتا ہوا کالے رنگ کا ''مولا بخش'' الماری سے نکالا اور ہم دونوں کی ہتھیلیوں کی خوب سکائی کی کہ ہمارے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے۔

Marfat.com

یہ میری پہلی اور آخری پٹائی تھی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے ہمیں بتایا کہ پیکٹ میں سکرین ہے اور پیکٹ بیمہ شدہ تھا اور اگر اس پیکٹ کا وصول کنندہ شکایت کرتا تو وہ (ہیڈ ماسٹر صاحب) گرفتار ہو سکتے تھے۔ پیکٹ اور پٹائی سے میری اور پریتم سنگھ دونوں کی غیر رسمی تعلیم میں خاصا اضافہ ہوا۔ ہمیں اچھا سبق ملا تھا۔ میری تعلیم دونوں طرح سے ابھی تک جاری ہے۔

ایک دفعہ میں اپنے دوست میر خلیل احمد کے ساتھ سیالکوٹ کے بازار کلاں میں جا رہا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ ایک آدمی جس نے سر میں خاک ڈالی ہوئی تھی اور ننگے پاؤں تھا، بڑے سوز اور درد بھرے لہجے میں یہ شعر پڑھتا ہوا جا رہا تھا۔

تمہیں برباد کرنا تھا ، مجھے برباد ہونا تھا
تیری قسمت میں ہنسنا تھا ، میری قسمت میں رونا تھا

ہمیں اس کی ہیئت کذائی عجیب سی لگی اور وہ جو شعر پڑھ رہا تھا اس کا مطلب بھی معلوم نہیں تھا۔ لیکن یہ واقعہ مجھے کبھی بھولا نہیں۔ اب میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ وہ عشق کا مارا ہوا کوئی انسان تھا۔

میں نے پٹواری بننا قبول نہ کیا

میں نے ورنیکلر مڈل سکول رسول پور بھلیاں سے 1947ء میں ورنیکلر مڈل کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد بڑی کوشش کی کہ کسی ہائی سکول میں داخل ہو کر مزید تعلیم حاصل کروں لیکن ہمارے گاؤں کے نزدیک کوئی ہائی سکول نہیں تھا اور والدین کہیں دور بھیجنے کے لئے تیار نہ تھے۔ ان دنوں دیہاتی گھرانوں میں ورنیکلر مڈل پاس کر کے پٹواری بننے کا کورس بہترین خیال کیا جاتا تھا۔ پٹواری کے گھر میں چارہ اور سبزی کم نہ ہوتی تھی۔ وہ زمین کے مسائل بھی حل کرتا جس کی وجہ سے نقدی کی صورت میں اسے انعام اکرام بھی ملتے تھے۔ اس کے علاوہ ماہوار تنخواہ بھی تھی۔ استاد بننا بھی پسند کیا جاتا تھا لیکن اس کے لئے جے۔ وی کی باقاعدہ ٹریننگ لینا پڑتی تھی۔

والد صاحب چاہتے تھے کہ میں پٹواری بنوں، ان کے سب ملنے جلنے والوں کا مشورہ

Marfat.com

بھی یہی تھا چنانچہ میں نے گوجرانوالہ پٹوار سکول میں داخلہ لے لیا جسے پاس کرنے کے بعد میں پٹواری بن سکتا تھا اور چین کی بنسری بجا سکتا تھا۔لیکن میں نے پٹوار سکول کو انتہائی بور محسوس کیا۔ لمبے چوڑے رجسٹر، کھاتے، جمع بندیاں، جریب سے زمین کی پیمائش، فصلوں کا حساب کتاب اور مالیے کا تعین وغیرہ۔اس قسم کے کاموں کی تعلیم سے میں دو ماہ ہی میں اکتا گیا۔لہٰذا والد صاحب کی ناراضگی کے باوجود میں نے پٹواری بننے کا پروگرام ترک کر دیا۔دراصل میں اپنی آزادی اور اپنی مرضی کے مطابق کچھ کرنا یا بننا چاہتا تھا۔

انہی دنوں میں والد صاحب کا تبادلہ سیالکوٹ شہر کے تھانے سے وزیرآباد تھانے میں ہو گیا۔وہاں والد صاحب کی دوستی تحصیل کی سطح کے ایک افسر جنگلات سے ہو گئی۔اس نے والد صاحب سے کہا کہ وہ اپنے بیٹے کو ادھر لے آئیں۔اسے ادھر ہی محکمہ جنگلات میں فارسٹ گارڈ تعینات کروا دیتے ہیں۔اور والد صاحب کو یہ بھی سمجھایا کہ اسامی اگرچہ گارڈ (محافظ) کی ہے لیکن وہاں جنگلات کو اجاڑنے والے مویشیوں کو پکڑنے، پھاٹک میں بند کر دینے اور پھر مویشیوں کے مالکوں سے پیسے لے کر چھوڑ دینے سے اچھی آمدنی بھی ہو جاتی ہے۔والد صاحب نے مجھ سے ذکر کیا تو میں نے انکار کر دیا کہ مجھ سے یہ رشوت کی آمدنی والی نوکری نہیں ہو سکے گی۔

میں نارمل سکول میں داخل ہو گیا۔میں نے مڈل تک فارسی پڑھی تھی اور اپنے طور پر کچھ فارسی کتب کا مطالعہ بھی کیا تھا جن کا چرچا ابھی باقی تھا۔مجھے ایک تجربہ کار استاد نے بتایا کہ اگر میں فارسی میں منشی فاضل کا امتحان پاس کرلوں تو مجھے درس و تدریس کے کسی ادارے میں کوئی اچھی نوکری مل سکتی ہے۔مجھے یہ مشورہ پسند آیا اور میں نے منشی فاضل کی کتب شہر سے منگوائیں اور کافی عرصہ ان کا مطالعہ بھی کرتا رہا۔لیکن میرے پکے دوستوں نے اس خیال کے خلاف ایک شعر۔

پڑھے فارسی ، بیچے تیل
دیکھو قدرت کے کھیل

سُنا سُنا کر میری حوصلہ شکنی کی تاہم وہ میری فارسی سے محبت ختم نہ کر سکے۔گو میں

Marfat.com

منشی فاضل تو نہ کر سکا، پھر بھی میں نے فارسی میں اچھی خاصی دسترس حاصل کر لی۔ ایک روز میں نے اخبار میں گورنمنٹ نارمل سکول میں داخلے کا اشتہار دیکھا۔ میں نے گھر والوں سے پوچھے بغیر نارمل سکول میں داخلے کیلئے درخواست بھیج دی۔ اشتہار میں جو عمر برائے داخلہ مطلوب تھی میں اس پر پورا نہیں اترتا تھا۔ میری عمر مطلوبہ عمر سے دو سال زیادہ تھی۔ ان دنوں پاکستان قائم ہو جانے کی وجہ سے بہت سے ہندو سکھ اساتذہ بھارت جا چکے تھے۔ بہت سے سرکاری اور غیر سرکاری مدارس خالی پڑے تھے اور اُستادوں کی بہت ضرورت تھی چنانچہ اس ضرورت کے تحت ہی مجھے نارمل سکول نارووال میں داخلہ مل گیا۔ ٹریننگ 1950ء میں مکمل ہوئی اور میں نے اضافی طور پر فارسی اور تعلیم بالغاں کا کورس بھی نارمل سکول کی تدریس کے ساتھ ساتھ پاس کر کے امتیازی سند حاصل کر لی۔

☆☆..........☆..........☆☆

Marfat.com

Marfat.com

میں استاد بن گیا

سفارش کے بغیر ملازمت مل گئی

وہ دور ایسا تھا کہ ملازمت کے حصول کے لئے سیاسی کشکول کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ تربیت حاصل کرنے والوں کی فہرستیں ضلعی انسپکٹر تعلیم کو بھیج دی جاتی تھیں۔ جب بھی ضلع میں کوئی اسامی خالی ہوتی تو ان فہرستوں کی مطابقت سے تقرری کے احکامات تربیت یافتہ معلمین کو ان کے گھروں پر بھیج دیئے جاتے تھے۔ جس طرح معلمین کی بڑی تعداد پاکستان سے بھارت گئی تھی، اسی طرح بھارت سے پاکستان بھی آئی تھی اور ان کو خالی آسامیوں پر فوری طور پر ملازمت دے دی جاتی تھی۔ اس وجہ سے مجھے گورنمنٹ بورڈ پرائمری سکول کلوئے ضلع سیالکوٹ میں تقرری کے احکامات دوسال کے بعد ملے۔ یہ گاؤں ہمارے گاؤں سے دو اڑھائی میل کے فاصلے پر تھا۔

والد صاحب نے مجھے اس دور کی بہترین سائیکل ''ریلے'' خرید کر دی تا کہ میں آسانی سے سکول جا اور آ سکوں۔ سکول کا ماحول بہت اچھا تھا۔ گاؤں کے لوگ بھی اچھے تھے۔ سکول کے بچے دوست ہی لگتے تھے۔ میں چھٹی کے بعد لڑکوں کے ساتھ فٹ بال کھیلتا۔ کچھ دوسرے دیہاتوں کے بڑے سکولوں کے طلباء بھی پرائمری سکول کے بچوں میں کھیلنے کے لئے آ گھستے اور عملاً کھیل بڑوں ہی کے لئے رہ جاتا۔ چھوٹے بچے ویسے بھی فٹ بال کے لئے موزوں نہ تھے اور وہ کھیل میں دلچسپی بھی نہیں لیتے تھے۔

ایک معمولی حادثہ

ایک روز کھیل کے دوران میں میری ٹکر ایک بڑے کھلاڑی لڑکے سے ہو گئی اور میرا

Marfat.com

اوپر والا ایک دانت تھوڑا سا ٹوٹ گیا۔ چونکہ یہ اتفاقیہ بات تھی لہٰذا اس میں درگزر سے کام لیا گیا۔ میرے شاگرد اگرچہ چھوٹے بچے تھے لیکن وہ بڑوں کے گلے پڑنے، ان پر پتھر روڑے پھینکنے کو تیار تھے۔ وہ اپنے استاد کو زخمی حالت میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ بڑے لڑکے نے مجھے ٹکر دانستہ نہیں ماری۔ ملّہ بازی کے کھیل میں لوگ مر بھی جاتے ہیں۔ دوڑتے دوڑتے ہم ٹکرا گئے اور گول میں نے ہی کیا ہے۔ طلباء مطمئن ہو گئے تاہم مجھے یہ احساس اور تجربہ ہوا کہ استاد ایک لیڈر ہوتا ہے جس کا حکم بجالانے کیلئے طلباء ہر وقت ''تیار فوج'' کی مانند موجود ہوتے ہیں۔

کلوئے کے اللہ ماہی

کلوئے میں ایک بے حد نیک، بہت شریف اور بچوں سے بے پناہ محبت کرنے والے میاں اللہ ماہی تھے۔ گاؤں میں ان کی ایک چھوٹی سی دکان تھی جو سکول جاتے ہوئے میرے راستے میں تھی۔ وہ سکول میں بچوں کی آمد شروع ہونے کے ساتھ ہی دکان کھولتے اور پھر چھٹی کا وقت ہونے سے پانچ منٹ پہلے دکان کو بند کر دیتے...... میں سمجھتا تھا کہ بچوں کی آمد سے پہلے دکان کھولنے کا مقصد یہ تھا کہ بچے اپنی ضرورت کی اشیا اور کھانے پینے کی اشیا خرید سکیں جبکہ یہی صورت حال سکول بند ہونے پر بھی پیدا ہو سکتی تھی۔ لیکن انہوں نے اُس کے الٹ چلن اپنا رکھا تھا کہ وہ بچوں کو چھٹی ملنے سے پانچ منٹ پہلے دکان بند کر دیتے تھے اور دکان کے قریب ہی اپنے کمرے میں چلے جاتے تھے۔

میرا تجسس بڑھا تو میں نے ایک دن ان سے پوچھ ہی لیا کہ وہ سکول بند ہونے کے بعد آدھ گھنٹے تک دکان کو کھلا کیوں نہیں رکھتے تا کہ بچے گھروں کو جانے سے پہلے خریداری کر لیں؟

میاں اللہ ماہی ایک اُداس سی ہنسی ہنسے اور بولے۔ ''میاں صاحب زادے! تم ابھی اپنے شباب کے آغاز میں ہو۔ جبکہ میری جوانی ڈھل چکی ہے۔ میری شادی ہوئی ہے، نہ بچے ہیں۔ اور بھی کوئی ایسا نہیں ہے جس سے میں دل کی باتیں کر سکوں...... مجھے بچے سکول میں آتے دیکھ کر بڑی تسکین ہوتی ہے...... ان کو جاتے دیکھ کر دُکھ ہوتا ہے...... اسی لئے میں نے اپنی دکان

Marfat.com

کے اوقات ایسے رکھے ہیں کہ میں اداسی کے مناظر نہ دیکھوں۔''

میاں اللہ ماہی کے اندرونی دکھ سے آگاہ ہونے پر میں بھی دُکھی ہو گیا۔ اپنی سمجھ کے مطابق میں ان کی دلجوئی کرتا اور ان کے پاس بیٹھتا۔ مختلف موضوعات پر ان کی زندگی کے تجربات اور خیالات سنتا۔ گردش ایام کے تحت جب میں نے کلوئے آنا جانا چھوڑ دیا بلکہ سکول کی ملازمت ہی چھوڑ دی تو بھی میں اپنے دوست اور شاگرد غلام نبی سے ملتا رہتا تھا۔ وہ کلوئے کے ساتھ والے گاؤں چک علیا کا رہائشی تھا۔ میں اس سے میاں اللہ ماہی کی خیریت وغیرہ دریافت کرتا رہتا اور انہیں سلام و پیام بھیجتا رہتا۔ ان کے داخلی درد کا احساس مجھ پر غالب تھا کہ...... وہ اس دنیا میں تنہا انسان، کیسے صبح سے شام کرتے ہوں گے اور کیسے افسردہ خواب دیکھتے ہوں گے؟

پانچ چھ سال کے بعد جب میں لاہور میں کاروبار کر رہا تھا تو غلام نبی نے مجھے بتایا کہ میاں اللہ ماہی کی شادی ہو گئی ہے تو مجھے یوں لگا...... جیسے میری اپنی شادی ہو رہی ہے اور میں اپنی بچپن کی منگیتر سے ملنے والا ہوں...... میں اس خبر سے اتنا خوش ہوا کہ میں نے اسی وقت میاں اللہ ماہی کو مبارک باد کا محبت بھرا خط لکھا۔ اس کے ساتھ ہی دلچسپ واقعہ یہ ہوا کہ میری والدہ نے میری شادی کی تیاریاں بھی شروع کر دیں۔ کئی سال بعد غلام نبی نے ہی مجھے بتایا کہ میاں اللہ ماہی کے بیٹے جوان ہو کر برسر روزگار ہیں اور میاں صاحب خوشی سے موٹے ہو گئے ہیں لیکن وہ میرا حال بھی پوچھتے رہتے ہیں۔ اس وقت میرے اپنے حالات بھی اللہ تعالیٰ نے اچھے کر دیئے تھے لیکن میاں صاحب کے بارے میں سن کر مجھے دلی خوشی اور اطمینان ہوا۔

تیرے سامنے آسمان اور بھی ہیں

میری ملازمت کا سلسلہ جاری تھا لیکن میں ہر وقت سوچتا رہتا تھا کہ میری منزل کلوئے اور پرائمری سکول کی معلمی نہیں ہے۔ میری یہ سوچ بڑھتی گئی۔ کوئی بڑا کام کرنے کی لگن نے مجھے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا تاہم ابھی مجھے کوئی راستہ نہیں سوجھ رہا تھا۔ انٹ شنٹ خیالات اور تصوراتی منصوبے میرا احاطہ کئے ہوئے تھے۔ اس دور میں مجھے علامہ اقبال نے بھی بہت سہارا دیا

Marfat.com

مجھے ان کا بہت سا کلام زبانی یاد تھا۔ نارمل سکول کی تعلیم کے دوران میرے اساتذہ نے ان کی نظموں اور غزلوں کے مطالب و معانی ہمیں سمجھائے۔ اس طرح مجھے ان کے نظریات سے بھی خاصی واقفیت ہو گئی تھی۔ میں سائیکل پر روزمرہ کا سفر کرتے ہوئے اور اردگرد تنہائی پا کر اقبال کی نظمیں اور غزلیں اونچی آواز میں ترنم سے گایا کرتا تھا جس سے مجھے نہ صرف ایک گونہ سکون ملتا بلکہ حوصلہ اور عزم بھی ملتا۔ ان کے ایک شعر کو تو میں نے حرزِ جاں بنا رکھا تھا۔ جہاں کہیں مجھے سائیکل پر بیٹھے بیٹھے چڑھائی چڑھنا یا کوئی گڑھا عبور کرنا پڑتا تو میں پیڈلوں پر دباؤ ڈالتے ہوئے زور سے اپنے آپ کو خطاب کرتا۔

تو شاہیں ہے، پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

حقیقت یہ تھی کہ میرے اندر بچپن کے دور میں اڑنے کی خواہش، بادل بن کر آسمان پر چھا جانے کی آرزو بڑھ رہی تھی۔ مجھے اپنے آپ پر اور اپنے گردوپیش پر بے پناہ غصہ آتا۔ کیوں کہ میری سوچوں کو سمجھنے والا بھی تو کوئی نہیں تھا اور میری پرواز کو پر نہیں مل رہے تھے۔ ایک بے مقصد ابھرتی، ڈوبتی زندگی تھی......

میرا پل پل بے چینی میں گزرتا۔ اپنی اس اندرونی کیفیت کا اظہار کیونکہ میں اپنی والدہ محترمہ سے تنہائی میں ان کے جسم کو دباتے ہوئے کرتا، وہ مجھے اپنے رنگ میں سمجھاتیں۔ مجھ پر نثار ہوتیں، مجھے چومتیں اور میرے بالوں کو سنوارتے ہوئے یہ دعا دیتیں ''اللہ کریم تمہاری منزلیں آسان کرے۔ تمہیں دین و دنیا کی دولتیں اتنی دے کہ تم ان کو سمیٹ نہ سکو۔'' یہ دعائیں میں بچپن سے ہی سنتا آیا تھا اور یہ دعائیں سننے کے بعد مجھے اسی طرح تسلی ہو جاتی جیسے تنہائی میں سائیکل پر سوار ہو کر حکیم الامت علامہ اقبال کی نظمیں اور غزلیں گانے سے ہوتی تھی۔

چوہدری دسوندھی خاں

میرے گاؤں دتو وال اور کلوئے کے درمیان ایک مشہور گاؤں ورک ہے۔ اس وقت

Marfat.com

اس گاؤں کی شہرت کی وجہ چودھری دسوندھی خاں تھے جو علاقے کے ذیلدار تھے۔ وہ بہت ہی خوبصورت اور دل پذیر شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ہر کام اللہ کی رضا کے لئے کرتے تھے نمود و نمائش سے انہیں نفرت تھی۔ ذیلدار دسوندھی خاں ایسے لوگوں میں سے تھے جن کی سب دل سے عزت کرتے وہ سخی تھے، فراخ دل تھے غرباء پرور اور ہمدرد انسان تھے ہی...... میرا اور ان کا سامنا سکول آتے جاتے اکثر ہو جاتا تھا۔ میں نیاز مندانہ انداز میں سائیکل سے اتر کر ان کو سلام عرض کرتا۔ ہر ملاقات پر وہ مجھ سے کوئی نئی بات کرتے اور پوچھتے...... تم کہاں سے آتے ہو؟ کہاں جاتے ہو؟ کس کی اولاد ہو؟ خیریت سے تو ہو؟ نصیحت بھی کرتے کہ سائیکل سے نہ اترا کرو بس سلام ہی کافی ہے۔

''چودھویں صدی'' کا منصوبہ

ایک روز ملے تو مجھے اپنے پاس بٹھا لیا اور باتیں ہونے لگیں۔ ان کے پاس بھی شاید میری باتیں سننے کے لئے وقت تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں اپنی موجودہ ملازمت سے خوش نہیں ہوں۔ اور کوئی بڑا کام کرنا چاہتا ہوں میں نے خصوصیت سے انہیں بتایا کہ میں ایک رسالہ نکالنا چاہتا ہوں شاید میں نے اس کا نام ''چودھویں صدی'' بھی لیا تھا۔ انہوں نے سُنا تو وہ بڑے خوش ہوئے کیونکہ میں نے اسلامی کیلنڈر سے ''چودھویں صدی'' جیسے نام کا انتخاب کیا تھا۔ انہوں نے اپنی بیٹھک کا دروازہ میرے لئے کھولا تو میں سمجھ گیا کہ یہ ان کے دل کا دروازہ ہے جو میرے لیے کھلا ہے۔ میری یہ ''سمجھ'' حقیقت ثابت ہوئی۔ وہ اس بات پر حیران ہی نہیں بلکہ خوش بھی ہوئے کہ ان کے علاقے میں رہنے والا سکول کا ایک معمولی مدرس کیسے کیسے اُونچے خیالات رکھتا ہے چوہدری دسوندھی خاں نے ابتدائی کام کے لئے مجھے اپنی بیٹھک دے دی اور کہا کہ وہ میرے عزائم پورے کرنے میں میری ہر طرح سے مدد کریں گے۔

آج 55 سال کے بعد یہ الفاظ لکھتے ہوئے ان کی جو تصویر میرے ذہن کے پردوں پر ابھری ہے وہ بڑی واضح اور تابندہ ہے۔ عظیم اشخاص لوگوں کی یادوں میں اسی طرح زندہ رہتے

Marfat.com

ہیں، جیتے اور بستے ہیں۔ انہوں نے میرے ساتھ ایسے وقت میں یہ تعاون اور کرم فرمایا جب میرے پاس کوئی اور وسیلہ نہ تھا۔

جوانی میں ''جیل یاترا''

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ''اہم فیصلے صرف آغاز کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جب کوئی شخص ایک اہم فیصلہ کر لیتا ہے تو درحقیقت وہ ایک بڑے دھارے میں چھلانگ لگا رہا ہوتا ہے جو اسے ایسی منزل پر بھی لے جا سکتا ہے جس کا نتیجہ فیصلہ کرتے وقت اس کے خواب و خیال بھی نہیں ہوتا۔'' میں نے ایک انعامی سکیم چودھری دسوندھی خاں صاحب کے گاؤں ''وِرک'' کے پتے سے شروع کی۔ اس سکیم کو ابتدا میں ہی کامیابی ملی تو چند ماہ کے بعد میں نے اس کا دفتر سیالکوٹ شہر میں منتقل کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی ملازمت سے مستعفی ہونے کیلئے اپنا استعفیٰ لکھ کر محکمہ تعلیم کو بھیج دیا۔ سیالکوٹ میں یہ کاروبار کرتے ہوئے چند ماہ ہی گزرے تھے کہ کسی نامعلوم شخص نے حکومت کو درخواست گزاری کہ یہ ''انعامی سکیم'' فراڈ پر مبنی ہے۔ اعلیٰ حکام سے ہوتی ہوئی یہ درخواست متعلقہ تھانے میں تفتیش اور کارروائی کے لئے پہنچی۔ پولیس نے تفتیش سے پہلے ہی میرے خلاف پرچہ درج کر کے مجھے گرفتار کر لیا اور پھر عدالت میں پیش کر کے مجھے جیل بھجوا دیا۔ یوں مجھے جوانی میں ہی ''جیل یاترا'' کا ''شرف'' بھی حاصل ہو گیا۔ اگرچہ میری ضمانت اگلے ہی روز ہو گئی تھی پھر بھی ایک رات مجھے جیل میں گزارنا ہی پڑی۔ چند تاریخوں کے بعد مقدمہ خارج کر دیا گیا کیوں کہ درخواست دہندہ کوئی (نامعلوم) شخص تھا جو عدالت میں پیش ہی نہیں ہوا۔ ویسے میں جانتا تھا کہ یہ حسد آمیز مہربانی میرے کسی کرم فرما کی تھی۔

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ بامن ہرچہ کرد آں آشنا کرد

''رپورٹ پٹواری مفصل ہے''

میں نے اس ناخوشگوار واقعے کے بعد انعامی سکیم بند کر دی لیکن میں یہ سمجھنے سے اب

Marfat.com

تک قاصر ہوں اور شاید قاصر ہی رہوں کہ کیا تمام اعلیٰ افسران ان پڑھ ہوتے ہیں کہ جو کچھ کلرک نے لکھ دیا، اسی پر ہیڈ کلرک، سپرنٹنڈنٹ، ڈپٹی، ایڈیشنل ڈائریکٹر نے دستخط کر دیئے اور کاغذات کو حاکم اعلیٰ تک پہنچا دیا۔ اس سلسلے کی ایک کلاسیکی مثال صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کے سیکرٹری قدرت اللہ شہاب کی کتاب ''شہاب نامہ'' میں ''رپورٹ پٹواری مفصل ہے'' کے عنوان سے درج ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ نیچے سے اوپر تک درخواست پر دستخط ہوتے چلے جاتے ہیں، کوئی اس کو پڑھتا تک نہیں۔ یہاں مجھے ایک اور واقعہ یاد آ رہا ہے۔ اٹھارہویں گریڈ کے ایک اعلیٰ افسر کے خلاف ایک گمنام شکایت موصول ہوئی کہ اس کی شہرت اچھی نہیں ہے۔ درخواست چلتے چلتے پانچویں گریڈ کے ایک پولیس افسر کے پاس پہنچی جس نے تھانے میں بیٹھے بیٹھے رپورٹ لکھ دی کہ اس کی شہرت اچھی نہیں۔ اب اس رپورٹ کو اوپر تک کسی نے نہ پڑھا، نہ ایس ایچ او نے رپورٹ کی تصدیق کی اور حکومت پنجاب کے سیکرٹریوں کی کمیٹی نے جس کی صدارت چیف سیکرٹری کر رہے تھے اس افسر کو جبری ریٹائر کر دیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ افسر مذکور کی جملہ سالانہ رپورٹیں اس کے حق میں ہیں۔ اس کے خلاف کبھی کوئی انکوائری بھی نہیں ہوئی تھی...... کیا اس نظام کو بدلا نہیں جا سکتا ہے؟ میرا خیال ہے کہ نہیں بدلا جا سکتا، ورنہ قدرت اللہ شہاب کی سطح کا افسر اور دانشور ''رپورٹ پٹواری مفصل ہے،، کا قصہ لکھنے کے بعد صورت حال کو بہتر بنانے کی ضرور کوشش کرتا اور تب سے اب تک کچھ ہو چکا ہوتا۔

بیوی کی الاٹمنٹ

اپنے ایک دوست کی کتاب میں میں نے پڑھا تھا کہ کس طرح ایک شخص نے بیوی کی الاٹمنٹ'' کی درخواست دی اور پھر یہ درخواست اپنا دفتری سفر طے کرتے کرتے الاٹمنٹ سے وزیر تک پہنچی۔ وزیر موصوف نے ''حلقہ پٹواری عمل کرے'' کا حکم دے کر درخواست کو واپس بھیج دیا تھا یہ درخواست جب متعلقہ پٹواری تک پہنچی تو درخواست پڑھ کر پٹواری پریشان ہو گیا کہ میں اس شخص کو بیوی کہاں سے الاٹ کروں؟ بہر حال پٹواری کاغذات لے کر چودھری عبدالغنی چیمہ جو یہ

Marfat.com

وائس چیئر مین موضع جبال کے پاس گیا اور چودھری صاحب بڑے سیانے آدمی تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ متروکہ علاقے میں ایک ہندو عورت رہتی ہے جو تنہا ہے۔ ان کی کوشش سے یہ عورت درخواست گزار کے ساتھ شادی کرنے اور اسے اپنا ''پتی دیو'' بنانے پر راضی ہوگئی۔ درخواست کی تعمیل کی رپورٹ حاکم کو کر دی گئی جو درخواست کے ساتھ داخل دفتر ہوگئی...... کسی متعلقہ اہلکار نے دیکھا تک نہیں کہ درخواست کس مضمون کی تھی، پٹواری کی ذمہ داری بیوی الاٹ کرنے کی تھی بھی یا نہیں اور پھر اگر اس نے حاکم کے حکم کی تعمیل کر دی تھی تو کیا وہ انعام کا حقدار تھا یا نہیں؟

ہم انگریز حکومت کا چھوڑا ہوا ورثہ بدلنے کو تیار نہیں...... یہ بندہ ناچیز مقبول احمد کس باغ کی مولی تھا کہ اُسے ایک گمنام اور جھوٹی درخواست پر جیل یاترا نہ کرائی جاتی۔ جھوٹی اور بوگس درخواستوں اور یہ درخواستیں نہ پڑھنے کی وجہ سے اب تک نہ جانے کہاں کہاں بے انصافیاں ہو رہی ہیں، ناروا ظلم کیا جا رہا ہے، لوگوں کو ذہنی اذیتیں دی جا رہی ہیں۔

☆☆............☆............☆☆

Marfat.com

ازدواجی زندگی

اڑنے سے پہلے گرفتاری

بچپن گزرا اور پھر لڑکپن کے بعد شباب آ گیا۔ شباب کی آمد کے ساتھ ہی جسمانی اور ذہنی طور پر انسان میں کیفیات کا تلاطم بپا ہو جاتا ہے۔ ان کیفیات کو بیان کرنا ایک الگ نفسیاتی اور جذباتی موضوع ہے۔ میں لکھ چکا ہوں کہ مجھے بچپن سے ہی خوبصورت مناظر اور دلکش چہرے اور خوبصورت گرد و پیش کو دیکھنے کا جنوں تھا۔ مناظر و مظاہر کی رعنائیاں مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری کر دیتی تھیں۔ لڑکپن میں قدم رکھنے کے ساتھ ہی میں رومانوی ہو گیا اور میرا ذوق جمال اِدھر اُدھر کمندیں پھینکنے لگا۔ انس و محبت کے جو چند جھونکے میری دیہاتی زندگی میں آئے وہ خالصتاً افلاطونی محبت ہی کے تھے۔ تاہم بعض اوقات دریا کے تیز بہاؤ کے سامنے کھڑا رہنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ میں فرشتہ تو نہیں تھا۔ لیکن میرے شباب میں طوفان خیزی اس لئے نہ تھی کہ میری محترمہ والدہ نے مجھے ازدواجی زندگی کے لئے بچپن ہی میں ننھیال میں میری ماموں زاد سے نامزد کر دیا تھا۔

نظیر بیگم

مجھے خود بھی اور دوسری طرف میری منگیتر کو بھی اس بات کا علم تھا کہ ہم دونوں کی شادی ہوگی۔ میں اپنے ننھیال میں اپنی ہونے والی بیوی کو دیکھنے کے لئے جاتا تھا۔ وہاں جا کر مجھے بڑی طمانیت محسوس ہوتی تھی۔ واپس گھر آنے کو جی ہی نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ میرے بچپن کا بیشتر حصہ میرے ننھیال چک نمبر 86 شمالی، سرگودھا میں گزرا۔ میرے ماموں برکت علی، محمد حسین، محمد خاں اور رحمت خاں نے وہاں گھوڑی پال سکیم کے تحت دو مربع اراضی حاصل کر لی

Marfat.com

تو وہیں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ یہ زمین بڑی زرخیز تھی۔ نہری پانی سے اس کی آبیاری ہوتی تھی۔ ماموں خود ماہر کاشتکار تھے۔ لہٰذا زرعی پیداوار خوب ہو رہی تھی۔ رہائش کے لیے انہوں نے ایک بڑی سی حویلی تعمیر کر لی تھی۔ اصل زمین مذکورہ رہائشی چک سے تقریباً ایک میل دور تھی اور وہاں بھی ماموؤں نے ایک ڈیرہ بنا رکھا تھا۔ دیگر فصلوں کے علاوہ گنا زیادہ کاشت کیا جاتا تھا کیونکہ یہ ایک نقد آور فصل تھی۔ گنے میں میکلو، پونا، دیسی اور فارمی اقسام تھیں۔ میں اور میرا ماموں زاد بھائی سلطان احمد دونوں شام کے وقت گنے کے کھیتوں سے کاٹھے، میکلو اور پونے گنے لے آتے اور رات بھر ان کو سردی میں پڑے رہنے دیتے۔ صبح دھوپ میں بیٹھ کر ان کو چوستے۔ مجھے ہمیشہ ہی وہ رسول پور بھلیاں کا ڈاکٹر یاد آتا جس نے میرے گندے دانتوں کو دیکھ کر کہا تھا کہ تم اگر مسواک درخت سے نہیں اتار سکتے تو گنا چوس کر ہی دانتوں کو صاف کر لیا کرو۔ اگرچہ میں مسواک کرنے کا بھی عادی ہو چکا تھا لیکن پھر بھی ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے گنے کے پھوگ سے بھی استفادہ کرتا۔

شیر گرم رومانوی جذبات

ہمارے معاشرے میں ننھیال سے زیادہ قریبی رشتہ داری خاندان میں کسی اور رشتہ دار سے کم ہی ہوتی ہے۔ ماں تو ہوتی ہی ننھیال کی ہے۔ اسے زیادہ محبت اپنے ماں باپ کی اولاد سے ہوتی ہے۔ پیار بھی وہ انہی سے زیادہ رکھتی ہے کیونکہ وہ خود ان میں سے بچھڑی کونج ہوتی ہے۔ میری بے جی نے ننھیال کا تصور ایک مہربان دوست کا میرے ذہن پر نقش کیا تھا اور پھر میری منگیتر نظیر بیگم بھی تو وہاں ہی تھی۔ اٹھارہ برس کے اس رومانوی مزاج نوجوان کے تمام شیر گرم دھیمے اور میٹھے میٹھے احساسات اسی کے لیے تھے۔ بلاشبہ وہ میرے بڑے ماموں کی دخترِ نیک اختر تھی مگر میری زندگی کی ساتھی اور میرے گھر کی مالک بننے والی تھی۔ اس لئے وہ اس دور میں ہی میرے دل کی پہنائیوں میں مستقل طور پر آباد ہو گئی تھی۔ میرے ننھیال جانے کے ارادوں میں اور پھر تمام سفر کے دوران میں وہ ہی ذہن کے پردوں پر رقصاں رہتی۔ میں اسے اپنی گہری اور سچی دوست سمجھتا

Marfat.com

تھا۔ بڑی سی حویلی کے کسی گوشے میں ہم گھنٹوں بیٹھے ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہتے۔ ہم دن کا زیادہ وقت ایک دوسرے کی نظروں کے دائرے میں گزارتے۔ خواتین بھی چونکہ ہمارے ہونے والے رشتے کے متعلق جانتی تھیں، اس لئے وہ ہمیں ایک جگہ بیٹھے دیکھ کر مسکرا کر رہ جاتیں۔ اس کی قربت کی میٹھی میٹھی آنچ انوکھی نوعیت کی تھی۔ وہ دبلی، پتلی، گوری، متناسب الاعضا اور صاف وشفاف چہرے والی لڑکی تھی۔ میری نظر میں وہ دنیا بھر کی لڑکیوں سے زیادہ حسین تھی۔ ضمیر جعفری نے کہا تھا:۔

ایک لمحہ بھی محبت کا بہت ہوتا ہے
لوگ جینے کا قرینہ ہی کہاں رکھتے ہیں

شادی اور.........

بے جی نے میری اس سے شادی میری عمر کے اٹھارہویں اور انیسویں سال کے درمیان کردی۔ چند سال ہم ایک دوسرے میں ہر لحاظ سے کھوئے رہے۔ لیکن پھر شاید کسی کی نظر بد لگ گئی یا یہ کسی کی بددُعا کا اثر ہوا......(بعض کہتے ہیں کہ اولاد نہ ہونے کی وجہ بھی ہوسکتی ہے) کہ نظیر بیگم نے میری بے جی سے جو اس کی سگی پھوپھی تھیں اور اس کے والد سے بھی بڑی تھیں بدتمیزی کرنا اور بے توجہی برتنا شروع کردی۔ میں نے اس کو پیار و محبت سے، رشتہ داری کے حوالے سے، ماضی کی محبت کے ذکر سے اور شادی کے بعد آنے والے سہانے دور کو یاد دلا کر سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ میری بات کو سنتی، خاموش رہتی یا پھر آنسو بہا دیتی، جیسے وہ کسی وجہ سے اپنا رویہ نہ بدلنے پر مجبور تھی۔ اس کا چلن نہ بدلا تو میں نے اس کو کہا کہ میں اپنی بے جی کی خاطر اپنی محبت تو کیا اپنی جان کو بھی قربان کرسکتا ہوں۔ اس نے اس دھمکی کو بھی سنا ان سنا کردیا۔ مجھے صرف اتنا کہا کہ میں اسے اس کے ماں باپ کے پاس بھیج دوں۔ ان دنوں اس کے والدین سرگودھا میں اپنی زمین کا حصہ فروخت کرکے بورے والا میں جا کر آباد ہوگئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھ سے جدا ہوکر اپنے رویے اور اپنے گھر کے متعلق سوچے گی یا اس کے والدین ہی اسے سمجھائیں گے۔ لیکن میری

Marfat.com

توقعات خام نکلیں۔ وہ والدین کے ہاں ڈٹی رہی۔ میں اسے خرچہ وغیرہ بذریعہ منی آرڈر بھجوا دیتا اور کبھی کبھی خود بھی جا کر مل آتا اور خرچہ وغیرہ دے آتا۔ یہاں تک کہ میں اپنی دوسری شادی کے بعد بھی اسے اکثر ملتا رہا۔ اور اسے اپنے پاس لانے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔

وہ کافی عرصہ سے بیمار چلی آ رہی تھی، میں بڑی مشکل سے منت سماجت کر کے علاج کے لیے اسے اپنے پاس لاہور لے آیا۔ ڈاکٹر کو دکھایا، اس نے مختلف قسم کے ٹیسٹ وغیرہ لے کر اپریشن کا مشورہ دیا، لیکن ہماری انتہائی کوشش کے باوجود نظیر بیگم اپریشن کے لیے تیار نہ ہوئی، اور کچھ عرصہ ہمارے پاس رہ کر پھر واپس والدین کے پاس بوریوالہ چلی گئی۔ حالانکہ یہاں ہر قسم کی سہولت موجود تھی اور سارے گھر والے اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔

آخر 10 مارچ 1980ء کی صبح وہ ہم سب کو اُداس چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی (اناللہ وانا علیہ راجعون)

دوسری شادی

نظیر بیگم سے شادی کے تلخ تجربے سے میں سخت دل برداشتہ تھا لیکن میں دوسری شادی کے حق میں بھی نہیں تھا لیکن میری ماں بضد تھیں اور کہتی تھیں کہ اس لڑکی (نظیر بیگم) نے ایسا اندھیر مچایا ہے کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ پھوپھی سے اپنی نفرت میں وہ یہ بھی چاہتی ہے کہ پھوپھی کے بیٹے کا گھر آباد نہ ہو اور اس کے پھوپھا پھوپھی اپنے پوتے پوتیوں کی خوشیاں نہ دیکھ سکیں۔ میری محبت میں اور نظیر بیگم کے خلاف غصے کی حالت میں اور سب سے اہم یہ کہ مستقبل میں نسل کو آگے چلانے کے لئے بے جی نے میری دوسری شادی کا فیصلہ کر لیا۔ اس وقت 1959ء کے عائلی قوانین ابھی وجود میں نہیں آئے تھے اور پہلی بیوی سے اجازت لینا ضروری نہیں ہوتا تھا۔ بے جی نے اپنے دوسرے بھائی سے ملاقات کی۔ انہیں ساری اونچ نیچ اور خواہ مخواہ کے جھگڑے سے آگاہ کیا۔ آخر وہ نظیر بیگم کے چچا تھے۔ گو فاصلہ تھا لیکن وہ اندرونی حالات سمجھتے تھے۔ اپنے بھائی کے کنبے کو بھی پہچانتے اور جانتے تھے۔ انہوں نے حامی بھر لی۔ ان کی حامی بھر لینے کے بعد کچھ مزید

Marfat.com

تفصیلات بھی طے کر لی گئیں کہ کوئی دھوم دھڑ کا نہیں ہوگا۔ مجبوری کی شادیوں میں سنجیدگی ہی اختیار کرنا پڑتی ہے۔ سب کچھ طے کرنے کے بعد بے جی نے مجھے "خورشید" کو جا کر دیکھنے اور اس سے بات چیت کرنے کو کہا۔ میرے لئے یہ عجیب حکم تھا۔ میں نے ننھیال میں خوب آتے جاتے رہنے کے باوجود "خورشید" کو نہیں دیکھا تھا نہ اس کو جانتا تھا۔

خورشید کا طلوع

زمین و آسماں کی گردشو، دم بھر کو رک جاؤ
کہ اِک عہد محبت کر رہا ہوں از سرِ نو میں

بے جی کے حکم پر بادل نخواستہ میں ماموں کے گھر چلا گیا۔ شام کا سماں تھا۔ میں نے ایک چھوٹی ماموں زاد سے پوچھا۔ "خورشید" کہاں ہے؟ اس نے مجھے اشارے سے بتایا کہ وہاں برآمدے میں ہانڈی روٹی پکا رہی ہے۔ میں وہاں جا پہنچا اور سلام دُعا کے بعد اس کا حال پوچھا۔ میرا خیال ہے کہ ابھی اسے اپنے بارے میں ہونے والے اس فیصلے کا پتہ نہیں تھا (بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے کچھ سن رکھا تھا) وہ نظیر بیگم جیسے خدوخال کی نہ تھی۔ اس کا اپنا ہی ایک چہرہ تھا جس پر معصومیت ہی معصومیت پھیلی ہوئی تھی۔ اس معصومیت کو میرے ذوق جمال نے تحسین کی نظر سے دیکھا اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ مزید باتیں کرنے اور مزید کچھ پوچھنے کی میری جرأت عنقا ہوگئی ہے۔ اور میں اسے اپنے کام میں مگن چھوڑ کر باہر نکل آیا لیکن میری نگاہ نے میرے دل کو اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

فقط نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دل کا
نہ ہو نگاہ میں شوخی تو دلبری کیا ہے

میں حیران تھا کہ بیشار دفعہ میں اپنے ننھیال اور سسرال آیا گیا ہوں لیکن ایسی حسین و جمیل اور دلکش شکل و صورت میری نگاہوں سے اوجھل کیسے رہی۔ چند دنوں کے بعد نہایت سادگی سے ہماری شادی ہوگئی۔ اور ہم اپنے گاؤں پہنچ گئے اب میں خود حیران تھا کہ قدرت نے اچانک

Marfat.com

نظیر بیگم سے زیادہ خوشبوئیں رکھنے والی بے جی کی خدمت گزار، فرماں بردار بہو" خورشید" بھیج دی تھی۔

خورشید کی آمد کے ساتھ ہی ہمارے گھر میں نئے اجالے طلوع ہونے لگے۔ امیدوں پر چھائے ہوئے سارے اندھیرے "خورشید" کی معصومیت کے نور سے دُور ہو گئے۔ ان میں اللہ کی رحمت شامل تھی۔ گاؤں کی سیانی خواتین نے تو پہلے دن خورشید کو دیکھتے ہی بے جی کو کہہ دیا کہ اگر حسین بی بی پہلے ہی اس "نور بھری"، کو لے آتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ اُس "غرور بھری" کو لاکر بیٹے کی عمر کے کئی سال کیوں ضائع کر دیئے؟ بے جی ان خواتین کو سمجھاتیں کہ وہ مقبول احمد کی بچپن کی منگیتر تھی اور یہ فیصلہ خاندان کے بزرگوں کا تھا وغیرہ وغیرہ۔

اولاد

بے جی کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمتوں سے شادی کے دو سال بعد اس وقت نوازا جب 3 اگست 1958ء کو ظفر مقبول ہمیں عطا ہوا پھر ایک سال کے بعد ہی یعنی 15 نومبر 1959ء کو اللہ تعالیٰ نے اس کا بھائی ارشد مقبول اس کے ساتھ کھیلنے اور ہمارے کنبے کو رونق بخشنے کے لئے عطا کیا۔ میری بیٹی شہنیلا 27 جولائی 1961ء کو پیدا ہوئی اور ماں باپ، بھائیوں، اور دادا اور دادی...... سب کے لئے رحمت کا پیام ثابت ہوئی۔

خورشید کی باتیں

میری اہلیہ خورشید کو اپنے اہل خانہ سے محبت کے علاوہ ایک جنون صفائی کا بھی ہے۔ صفائی اور سلیقہ معمول کی مطابقت سے مجھے بھی پسند ہے لیکن جنوں کی اس حد تک نہیں...... دوسری طرف میری اہلیہ جنون کی حد تک سلیقہ مند اور صفائی پسند ہے۔ میرے لباس کے لئے کپڑے کی خرید، سلائی، دھلائی اور رکھ رکھاؤ کا ہر کام وہ خود کرتی ہے۔ گھر کے تمام افراد کا خیال رکھتی ہے تاہم گھر کی ہر شے کو اس کی مخصوص جگہ پر طریقے سلیقے سے رکھنا اور تمام گھریلو معاملات کو مہارت سے نمٹانا اس کی خاصیت ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات جب مجھے اپنے ذاتی استعمال کی شے بھی

Marfat.com

تلاش بسیار کے باوجود مل نہیں پاتی، تو میں سمجھ جاتا ہوں کہ وہ شے اہلیہ محترمہ کی صفائی کی زد میں آ چکی ہے۔ ایسے مواقع پر ہمارے درمیان ایک ہلکی پھلکی نوک جھونک بھی ہو جاتی ہے۔

گھر میں جب ضرورت کے تحت کوئی خوردنی شے بیکری وغیرہ سے منگوائی جائے تو وہ شے ایک وقت میں ہی حسب ضرورت استعمال کر لی جاتی ہے۔ بچی ہوئی تمام اشیاء دوسرے دن اِدھر اُدھر بانٹ دی جاتی ہیں۔ ہمارے گھر میں کام کرنے والی ایک خاتون سارا دن صفائی کرتی رہتی ہے۔ فرش پر پہلے تو جھاڑو دیتی ہے۔ پھر گیلے کپڑے سے رگڑ کر خاک اور دھول سمیٹتی ہے اور دیواروں اور دروازوں کی جھاڑ پونچھ کرتی ہے۔ اس کے باوجود میری اہلیہ اس خاتون کو کوستی رہتی ہے کہ کیا تجھے نظر نہیں آتا کہ کتنی مٹی دیوار سے گری پڑی ہے، دروازہ میلا ہے، کھڑکی پر گرد جمی ہوئی ہے۔ کام کرنے والی عورت پھر گیلا کپڑا پھیرنے لگتی ہے۔

والدین اور نظیر بیگم کا حج

1971ء میں میرے والدین اور نظیر بیگم کی حج کی درخواستیں بذریعہ ہوائی جہاز منظور نہ ہوئیں تو انہیں بحری جہاز کے ذریعے ہی حج کی سعادت حاصل کرنے کے لئے بھجوا دیا گیا، اس وقت بحری جہاز کے ذریعے حج کا دورانیہ 4 ماہ کا تھا۔ لہٰذا میری بیوی خورشید نے انہیں اس عرصہ کے لئے تمام قسم کی دالیں، چاول، نمک، مرچ اور گھی وغیرہ پیک کر کے دے دیا اور کھانا پکانے اور کھانے کے متعلقہ برتن اور کپڑے مع لحاف، دریاں اور چادریں وغیرہ بھی ساتھ دے دیں، وہ انہیں روز تاکید کرتی کہ ان میں سے جو چیز بچ جائے اسے وہیں خیرات کر دیں۔ نظیر بیگم اور میرے والدین حج کر کے واپس آئے تو گھر میں بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ ان خوشیوں میں خورشید بیگم پیش پیش تھی۔

میری دوسری شادی بے جی کے انتخاب پر ایسی لڑکی سے ہوئی تھی جسے میں نہیں جانتا تھا اور نہ ہی اس سے کوئی لگاؤ تھا۔ لیکن اس خاتون نے میری ماں کی، جو دائم المریضہ تھی، دن رات خوب خدمت کی۔ کبھی کوئی گلہ کیا، نہ کوئی شکایت کی۔ ماں کی جگہ اور ماں ہی کے انداز میں گھر کا

Marfat.com

کام کاج بھی سنبھالا۔ یہ خورشید کی معصومیت اوراس کا سبھاؤاور میری ماں کی خدمت تھی جس کی بنا پر وہ میرے دل کی گہرائیوں میں بسنے لگی اور میں اس کا بندہ بے دام بن گیا۔ میں یہ اعتراف کرنے سے نہیں جھجکتا کہ میں اپنے کام کاج کی وجہ سے اپنے والدین کی وہ خدمت نہیں کر پایا جس کے وہ حقدار تھے لیکن خورشید نے ان کی جو خدمت کی اس نے مجھے بھی مطمئن کر دیا۔

کوئی لاکھ کہے کہ بہو ہونے کے ناتے، اپنی ساس کی خدمت کرنا خورشید کا فرض تھا اور پھر وہ اس کی پھوپھی اور پھوپھا بھی تو تھے۔ مگر لڑکیاں ایسا کرتی ہی چلی آئی ہیں تاہم میں خورشید کا ممنونِ احسان ہوں، کہ اس نے میری بے جی کو کبھی کسی شکایت کا موقعہ نہ دیا۔ دوسری طرف سوائے ''صفائی میں خدائی'' سمجھنے کے اس میں کوئی ضدی پن نہیں۔ وہ بہت اچھا کھانا پکاتی ہے لیکن اسے خود کھانے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ دوسروں کو کھلا کر خوش ہوتی ہے۔ کھانا بچ گیا تو کھالیا ورنہ چائے کے ساتھ ایک رس کھالینا ہی کافی سمجھتی ہے اور بس......وہ دل کی بھی اچھی ہے۔ نرم روی سے آہستہ بولتی ہے۔ میں اسے اونچا بولنے کو کہوں تو کہتی ہے کہ تم اپنے کانوں کا علاج کراؤ میں تو اونچا ہی بول رہی ہوں۔ خورشید کی ان خوبیوں کا ہی نتیجہ ہے کہ میری ساری توجہ کاروبار میں لگی رہی اور اس نے گھر کو جنت بنانے اور بچوں کی تعلیم وتربیت میں زندگی صرف کر دی اور اب تک سب کی خدمت دل وجان اور مادری شفقت سے کر رہی ہے۔

☆☆..........☆..........☆☆

Marfat.com

لاہور میں آمد

اونچی فضا کی طرف پرواز

سیالکوٹ کے مقدمے اور جیل یاترا کے ناخوشگوار تجربے کے بعد میں اپنے پیدائشی گاؤں دتو وال سے اپنے مستقبل کی تلاش میں زندہ دلوں کے شہر لاہور میں اُٹھ آیا۔ اس وقت میرے اثاثوں میں مڈل، جے وی کی اسناد، والد صاحب کا مہیا کردہ تھوڑا سا سرمایہ، غیر رسمی تعلیم کے چند تجربات اور زمانے کے کچھ تھپیڑوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ لیکن میرا سب سے قیمتی سرمایہ علامہ اقبال کی شاعری سے حاصل کیا ہوا عزم وارادہ تھا۔ فضاؤں میں اڑنے اور بادل کی طرح چھا جانے کی خواہش تھی۔ یہ شعر اکثر وردِ زبان رہتا:۔

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں

اس کے علاوہ ماں باپ کی دعائیں بھی میرے حوصلے کو بلند کر رہی تھیں۔

ادبی رسالے کی ادارت کا تجربہ

لاہور آتے ہی میں نے شاہ عالم مارکیٹ میں ایک فلیٹ کرائے پر لیا۔ اس کے ایک کمرے میں اپنے میگزین ''چودھویں صدی'' کا دفتر بنایا اور بقیہ ملحقہ حصے میں رہائش اختیار کر لی۔ میگزین کے ساتھ میں نے پبلشنگ کے کام کا آغاز بھی کر دیا۔ ان دنوں پاکستان انڈسٹریل ڈویلپمنٹ کارپوریشن یعنی PIDC کا بڑا چرچا تھا یہ سرکاری ادارہ دیگر ممالک سے ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل کے لئے بات چیت کرتا رہتا تھا اس لئے اخبارات میں اس کے کاموں کا بڑا ذکر پایا جاتا

Marfat.com

GOVERNOR'S HOUSE
LAHORE

۱۶/ مارچ ۱۹۶۸ء

کسی زبان کے رسائل و جرائد کی خوبیٔ طباعت اور کثرتِ اشاعت جہاں ان کی مقبولیت کی دلیل ہے وہیں اس زبان کے بولنے والوں کے حسنِ مذاق کا ثبوت بھی ہے۔ رسالہ "چودھویں صدی" کے چند شمارے جو میری نظر سے گذرے ہیں انہیں دیکھ کر مجھے بڑی مسرت حاصل ہوئی ہے۔ یقیناً یہ اردو کے ان چند رسائل میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے جن کا نصب العین اردو زبان کی وساطت سے علم و فن کی خدمت ہے اور جن کو ظاہری اور باطنی خوبیوں سے آراستہ کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

دنیا کا کوئی ادب اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک اس کو علوم و فنون کے معارف ارتقا کا ترجمان نہ بنا دیا جائے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ کتابیں جو مختلف اصناف ادب کی ترجمانی کرتی ہیں اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ ادب کی ترقی کے مدارج کا ہنگامی جائزہ بھی اس کے نشوونما کے لئے بہت ضروری ہے۔

میری دلی خواہش ہے کہ ہماری قومی زبان کے رسائل و جرائد مغربی ممالک کے رسائل و جرائد کی طرح علم و فن کا گہوارہ بن جائیں اور ان کی تربیت میں وہ ارباب علم و حصہ لیں جن کے نتائج فکر ہمارے ملک کے باشندوں میں نہ صرف ادبی ذوق ہی پیدا کر سکتے ہیں بلکہ جو ہمارے ادب کا سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ ہیں۔ میری دعا ہے کہ رسالہ "چودھویں صدی" اس مقصد میں کامیاب ہو۔

اختر حسین

(اختر حسین)
گورنر مغربی پا...

Marfat.com

تھا۔ میں نے عوام کی زبانوں پر چڑھے ہوئے پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی کے نام کے مقابلہ پر فوراً ہی کتابوں کی اشاعت کے لئے پی آئی بی سی (PIBC) کے نام سے ایک کمپنی تشکیل دی اور اسے رجسٹر کرالیا۔ (''کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ'') میں نے پی آئی بی سی کے ادارے سے بہت سی ٹیکنیکل کتابیں اور تیرتھ رام فیروز پوری کے کچھ ناول شائع کئے: دو تین کتابیں مشہور عوامی شاعر احسان دانش کی شائع کیں۔ لیکن ناتجربہ کاری کی وجہ سے یہ کام مناسب کامیابی حاصل نہ کر پایا۔ میری شائع کی ہوئی کتابیں زیادہ تعداد میں فروخت نہ ہوسکیں چنانچہ میں نے تمام سٹاک ردی میں تول کر بیچ دیا۔ اور پوری توجہ رسالہ ''چودھویں صدی،، کی طرف مبذول کر دی جس کی باقاعدہ اشاعت کے لئے اس کا ڈیکلریشن بھی حاصل کرلیا۔ اس رسالے کے چند شمارے چھپے تو گورنر پنجاب جناب اختر حسین نے ایک تعریفی خط لکھ کر حوصلہ افزائی فرمائی: ''چودھویں صدی'' پندرہ روزہ رسالہ تھا۔ میں نے ایک ماہنامہ ''نئے زاویے'' کا بھی ڈیکلریشن حاصل کرلیا لیکن میں اس سے قطعی کوئی استفادہ نہ کرسکا۔ کتب کی اشاعت اور میگزین میں میرے معاون محمد اکرم صاحب تھے اور احسان دانش صاحب میگزین میں میرے ساتھ بطور نگران شامل تھے۔

1957ء میں رسالہ ''چودھویں صدی،، کی اشاعت کی پڑتال آڈٹ بیورو آف سرکولیشن نے کی ۔ اس کی تصدیق کے مطابق اس رسالے کی اشاعت اس وقت آٹھ ہزار تھی۔ چنانچہ اب محکمہ اطلاعات کے افسر اعلیٰ شان الحق حقی کے دستخطوں کے ساتھ ''چودھویں صدی'' کو سرکاری اشتہارات کی اشاعت کے اہل قرار دیا گیا۔ میگزین کے لئے اخباری کاغذ کا کوٹہ بھی منظور ہوگیا۔ اشتہارات کا سرکاری طور پر ملنا اور اخباری کاغذ کا کوٹہ دونوں ہی میرے لئے قدرت کے عطا کیے ہوئے بڑے انعامات تھے۔ ان سے میرا مستقبل سنور سکتا تھا۔ وقتی طور پر میں نے ان مراعات سے استفادہ کیا اور میرے حالات نے کروٹ بدلی۔ تاہم یہ ساری سہولتیں، انعامات اور میری کوششوں کے باوجود ہم پندرہ روزہ ''چودھویں صدی'' کو زندہ نہ رکھ سکے۔ نہ ہی ''نئے زاویے'' ٰکی اشاعت زیادہ عرصہ تک ممکن ہوئی۔ پبلشنگ کے کام کے اخراجات ہی کم نہ

Marfat.com

تھے۔ میں اپنے والد صاحب کی عمر بھر کی کمائی یا پس انداز کیا ہوا سرمایہ جو بارہ تیرہ ہزار روپے پر مشتمل تھا، زندہ دلوں کے شہر لاہور میں لے کر آیا تھا لیکن یہ میرے تجربات کی نذر ہو چکا تھا۔ میرے ملنے جلنے والے پوچھتے کہ بارہ تیرہ ہزار کے مصرف سے تم نے کچھ تو حاصل کیا ہی ہوگا؟ تو ان کو میرا جواب ہوتا۔ ''میں نے اس سرمائے سے اہم تجربات حاصل کئے ہیں''۔ اس وقت تو یہ میری ایک جذباتی بڑتھی لیکن بعد کی زندگی میں اللہ تعالیٰ نے میری اس بڑ کا بھرم رکھا اور میرے ان تجربات کے ثمرات مجھے عطا کیے۔

حالات کی ستم ظریفی

ایک دیہاتی مدرس سے نمایاں درجے کا طابع (پبلشر) بن جانے کا سفر، ایک مشکل اور حوصلہ فرسا سفر تھا لیکن مصائب در مصائب کے باوجود اللہ ہی جانتا ہے کہ میں نے اُسے کیسے جاری رکھا۔ مصائب سے پُر اس سفر کے دوران ہی میرا بیٹا ظفر مقبول بیمار پڑ گیا۔ میرے پاس اس کے علاج کے لئے پیسے نہیں تھے۔ مشکل کی اس گھڑی میں میری بہن ''مختار'' نے میری مدد کی اور کچھ پیسے ادھار دیئے کہ میں بچے کی دوائیاں لاسکوں۔ میری بہن کے ادھار کے یہ پیسے شفاعت اور برکت والے تھے جن سے میرا بیٹا صحت یاب ہو گیا۔ روپے پیسے کے حصول کے لئے مجھے اپنی زندگی میں کچھ تلخ اقدامات اٹھانے پر بھی مجبور ہونا پڑا۔ ایک واقعہ عرض کرتا ہوں:۔ مجھے کچھ ایسی ادائیگیاں کرنا تھیں جن کی ادائیگی کے بغیر، پبلشنگ کے کام میں میری اب تک کی تمام کوشش ضائع ہو سکتی تھی اور لگا ہوا سرمایہ ڈوب سکتا تھا۔ بہت سے دوستوں اور کاروباری ساتھیوں سے ان ادائیگیوں کے لئے میں نے رقم ادھار مانگی، سود اور منافع میں حصہ داری کی بنیاد پر بھی طلب کی لیکن جب کوئی بات نہ بن سکی، تو میں نے اپنی بیوی سے اس کے میکے اور سسرال کی طرف سے دیئے گئے سارے زیورات طلب کئے کہ ان کی فروخت سے ادائیگیاں کر کے اپنی عزت بچا لوں اور کام کو بھی آگے لے جاسکوں۔ ان زیورات میں ایک ہار میری بیوی کو بے حد پیارا تھا۔ یہ وزن میں بھاری بھی تھا اور خوبصورت بھی۔ میری بیوی اسے پہنتی تو میں اسے خوشی سے کہتا۔ ''یہ ہار پہن کر تم ملکہ عالیہ لگتی

Marfat.com

ہو۔" وہ مسکرا کر رہ جاتی۔ اس نازک موقع پر یہ ہار دیتے ہوئے وہ کچھ افسردہ سی ہوگئی لیکن اس وقت کاروبار کی ضرورت فوقیت رکھتی تھی اور ادائیگیاں ضروری تھیں۔ میں نے ہار لے کر پوٹلی میں رکھا اور بیوی سے آنکھ ملائے بغیر گھر سے نکل آیا۔ زیورات کی پوٹلی میری بغل میں تھی اور بیوی کی حسرت بھری آنکھوں میں آنسو تھے۔

خورشید کا سونے کا ہار بچ گیا

میں سوہا بازار تک پریشانی کے عالم میں چلتا رہا۔ ہر قدم پر کوئی نئی تجویز سوچتا رہا لیکن زیورات کو بچانے کا کوئی نیا منصوبہ میرے ذہن میں پیدا نہ ہوا۔ یکا یک جیسے دماغ کے گوشے روشن ہوگئے۔ جملہ زیورات تو نہیں لیکن ہار بچانے کا ایک طریقہ مجھے سوجھ گیا۔ سوچ کے اس تناظر میں ادائیگیوں کی ترتیب پر غور کیا۔ میں نے زیورات کی پوٹلی کو ایک خاموش علیحدہ کونے میں جا کر کھولا۔ اس سے ہار کو نکالا۔ اسے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا اور باقی زیورات فروخت کردیئے۔ جو رقم دستیاب ہوئی، اس سے کام نہیں چلتا تھا۔ میں سوہا بازار سے نکلا اور انارکلی چوک پر واقع نیشنل بنک میں پہنچا۔ اس قیمتی ہار کو بنک میں رہن رکھ دیا۔ ادائیگیاں بروقت ہوگئیں۔ میری اور میرے کاروبار کی ساکھ بچ گئی۔ کام بھی آگے بڑھا۔ اس ہار کے متعلق میں نے بیوی کو کبھی نہیں بتایا کہ اس کو بچانے کیلئے میں نے کیا عمل کیا۔ وہ یہی سمجھتی رہی کہ میرے زیورات کے ساتھ ہار بھی فروخت ہوگیا ہے۔ ایک سال کے بعد میرے مالی حالات بہتر ہوگئے تو میں نے وہ ہار بنک سے واپس لے لیا۔ گھر آیا اور موقعہ ملتے ہی میں نے جیب سے ہار نکال کر اپنی اہلیہ کے گلے میں ڈالا تو وہ حیرت زدہ ہوگئی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ اس کا اپنا ہی پرانا ہار ہے۔ وہ اسے نقلی یا کوئی اور ہار سمجھ رہی تھی۔ لیکن اسے جب میں نے تمام حقیقت بتائی تو وہ خوشی اور محبت سے میرے گلے کا ہار بن گئی، ہر خوش اخلاق بیوی شوہر کے گلے کا ہار ہی ہوتی ہے۔ خدانخواستہ اگر وہ بداخلاق ہو تو وہ شوہر کے لئے جنجال بھی ثابت ہوتی ہے۔

Marfat.com

غیر رسمی تعلیم کی راہنمائی

تعمیر اخلاق، قناعت، فقر و تصوف کے بارے میں میرا علم غیر رسمی تھا لیکن میں نے کتابوں کے مطالعے اور دنیا کے تجربے سے بہت کچھ سیکھا۔ یہ غیر رسمی تعلیم ہی میری راہنما بنی۔ مشکلات گوناگوں تھیں لیکن میں اپنے کام کے پھیلاؤ سے مطمئن تھا۔ کم وسائل کے باوجود عظیم منصوبوں کی تکمیل میں کوشاں ہو جانے ہی کو معلمین حیات نے اصل مردانگی قرار دیا ہے۔ میری عقل و دانش کے مطابق میرا رسالہ ''چودھویں صدی'' کا بڑا دیو قامت منصوبہ تھا لیکن اب میں نے ''چودھویں صدی'' کی اشاعت بند کر دی تھی تو میرے ذہن میں کتب کی اشاعت پر بھرپور توجہ دینا، بڑے بڑے ادیبوں، شاعروں سے روابط پیدا کرنا، ان سے اعلیٰ درجے کی معیاری کتابیں لکھوانا اور کاروبار کو وسعت دینے کے نئے نئے تجربات کرنا اور آگے کی سمت قدم بڑھانا میرا مقصود نظر تھا۔ میں نے پیچھے دیکھنے کی بجائے ہمیشہ مستقبل پر نظر رکھی۔

بلاشبہ میرا ذاتی علم بہت محدود تھا لیکن دوسروں کے علم اور تجربات میرے سامنے تھے۔ میرے ذاتی حالات اور کوائف حوصلہ شکن تھے لیکن دوسرے لوگوں کی کامیابیوں کو میں نے مشعل راہ بنایا۔ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جن کے دنیاوی حالات مجھ سے بھی دگرگوں تھے لیکن انہوں نے حوصلہ نہ ہارا اور کامیابی نے ان کے پاؤں چومے۔ میرے پاس بھی عزم تھا، ارادہ تھا اور اللہ کے فضل سے مشکلات سے ٹکرا جانے کی صلاحیت تھی۔ اس سب کے علاوہ میرے ساتھ میری ماں کی دعائیں تھیں۔ ایک شعر جس نے مجھے ہمیشہ متحرک اور استقلال بخشا، وہ یہ تھا:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

میں نے قوم کے ایک فرد کی حیثیت میں اپنی حالت بدلنے کے لئے بھرپور کوشش کی اور اس میں اپنی توانائیاں صرف کیں تو نتیجہ یہ ہوا کہ تاریک راستے روشن ہوتے چلے گئے۔

Marfat.com

لاہور زندگی کا مخزن

اہم بات یہ ہے کہ زندہ دلوں کے شہر لاہور میں آتے ہی میری غیر رسمی تعلیم کا ایک لمبا دور شروع ہو چکا تھا...... اب ہر نیا دن میرے سامنے نیا چیلنج پیش کرتا اور میں اس کو حل کرنے میں تن من سے مصروف ہو جاتا۔ لاہور میں نئے نئے افکار رکھنے والے انسان تھے، نئی نئی معاشرتی قدروں کے حامل واقعات تھے، حیرت انگیز باتیں اور سبق آموز تجربات تھے، کتابیں، رسائل، اخبارات، سینما گھر، تماشوں کے ہجوم، ہر نوع کے پیشہ وروں کے اڈے، چلتی پھرتی رواں دواں زندگی سے رابطوں کا سلسلہ، نئے مناظر اور جلسے جلوس تھے۔ یہاں عظیم عالمگیری مسجد بھی تھی اور اس کے پڑوس میں گناہ کے کاروبار کا بازار بھی تھا۔ یہاں شاہی مسجد کے ایک کونے میں تصور پاکستان کے خالق حکیم الامت علامہ اقبال دائمی نیند میں سوئے ہوئے تھے اور ان کے مزار پر روزانہ ہزاروں لوگ فاتحہ پڑھتے اور ان کی روح کو ثواب پہنچاتے تھے۔ اسی شاہی مسجد کے دوسرے کونے میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ سکندر حیات کی قبر ہے جہاں کوئی دن کو بھی جانا پسند نہیں کرتا...... لاہور کے بے شمار جلوے اور رنگ ہیں۔ میری آمد کے وقت لاہور کی آبادی دس بارہ لاکھ ہو چکی تھی، لیکن زندگی پر ہجوم لگتی تھی۔

مشاہدات، تجربات، میل ملاقات اور زندگی کے ہنگامے مجھے بہت کچھ سکھا رہے تھے۔ میں دیکھتا کہ لاہور میں ہر کوئی سرگرم عمل تھا۔ ہر شخص اپنی زندگی کی ہر تبدیلی کو قبول کر رہا تھا۔ خود میرے اندر بھی تبدیلی کی خواہش موجود تھی۔ میں اگر مرعوب ہوتا تو ایسے شخص سے جو یا تو بہت پڑھا لکھا ہوتا یا صاحب کردار ہوتا یا صاحب اختیار ہوتا۔ میں موخر الذکر قسم کے لوگوں سے صرف اس وقت متاثر ہوتا جب میں ان میں سے کسی کی اچھی کارکردگی اور اچھی خدمات کے سچے واقعات سن کر خود اپنی تسلی کر چکا ہوتا۔

میری نظر تقریباً ہر وقت اپنے عزائم ہی پر ہوتی۔ اب میں اور لاہور مجھ پر رچتا بستا چلا جا رہا تھا۔ جب میرے کاروباری حالات سازگار ہونے لگے تو میں نے بہتر رہائش

Marfat.com

گاہیں کرائے پر لیں۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ اپنی ذاتی رہائش گاہیں تعمیر کیں۔ بوجوہ کسی کو چھوڑنا، کسی کو بیچنا، کسی میں رہائش ترک کرنا اور کسی میں رہائش اختیار کرنا میری تبدیلی کی خواہش کی تکمیل کرتے چلے گئے۔ اس دوران میرا کنبہ بھی تبدیلیوں سے دوچار ہوتا رہا۔ اللہ نے مجھے بچے دیئے۔ ذمہ داریاں بڑھیں اور اللہ نے کاروبار بھی بڑھایا اور میری زندگی کو واقعات کا مرقع بھی بنایا۔

یہاں صرف ایک واقعہ کا ذکر ضروری ہے جس نے مجھے زندگی کا ایک نیا سبق دیا۔

زراعت کا ناکام تجربہ

ایک دفعہ ضلع شیخوپورہ کی سرکاری زمین کی نیلامی کا اشتہار میری نظر سے گزرا۔ یہ زمین موضع سچا سودا متصل چوہڑکانہ (جواب فاروق آباد ہے) میں تھی۔ میں نے اپنے والدین سے مشورے کے بعد نیلامی میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا، مقررہ تاریخ پر نیلامی میں بولی دے کر میں نے زمین کے تقریباً 2 مربعے حاصل کر لیے۔ ضابطے کی کاروائی کے بعد مجھے زمین کا قبضہ مل گیا۔ زمین غیر آباد تھی، لہٰذا وہاں ٹیوب ویل لگایا اور رہائش کے لئے مکان بنایا اور زمین کو آباد کرنے کے لئے ایک ٹریکٹر خریدا۔ کچھ عرصہ وہاں پر ماموں زاد بشیر احمد کاشت کاری کرتا رہا...... بوریوالہ میں اس کی اپنی زمین بھی تھی، جس کی دیکھ بھال خود ہی کرتا تھا۔ وہ اپنی زمین پر واپس چلا گیا تو اس کی جگہ میں نے مولوی افضل کو جو کافی عرصہ سے مقبول اکیڈمی میں کتابت کا کام کرتا تھا، معاملات طے کر کے زمین پر بھیج دیا۔ کچھ عرصہ تک تو کام بڑی خوش اسلوبی سے چلتا رہا لیکن ایک روز پتا چلا کہ مولوی افضل ٹریکٹر لے کر بھاگ گیا ہے۔ مولوی افضل گوجرانوالہ کے کسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ میں اپنے دوست ظفر اقبال ورک کو لے کر گوجرانوالہ گیا۔ وہاں ظفر اقبال کا بھائی خضر اقبال ورک گورنمنٹ کے ایک محکمہ میں انسپکٹر تھا، اس سے مشورہ کرنے کے بعد ہم چوہڑکانہ پولیس سٹیشن گئے۔ وہاں اتفاق سے ایس ایچ او چیمہ صاحب تھے جو ظفر اقبال ورک کے دوست تھے۔ انہوں نے بتایا کہ محمد افضل نے تو اُلٹا میرے خلاف رپورٹ درج کروا رکھی ہے...... بڑی مشکل سے جان چھڑائی اور خدا خدا کر کے ٹریکٹر واپس لیا۔ یہ تجربہ خوش گوار نہیں تھا۔ اس لئے میں نے زمین وغیرہ سب بیچ دی اور آئندہ اس طرح کا کوئی کاروبار کرنے سے ہاتھ کھینچ لیا جس کی نگرانی کسی دوسرے کے سپرد کرنی پڑ جائے۔

Marfat.com

شاہ عالمی کا دفتر

پہلا منصوبہ

میں لکھ چکا ہوں کہ لاہور میں آمد کے بعد رسالہ "چودھویں صدی" اور کتابوں کی اشاعت عملی زندگی کا میرا پہلا منصوبہ تھا اور اس کے لئے میں نے کوہ نور چیمبرز میں دفتر اور رہائش کے لئے ایک فلیٹ کرائے پر لیا تھا۔ PIBC نامی پبلشنگ کمپنی قائم کی۔ ماہنامہ "نئے زاویے" کا ڈیکلریشن لیا۔ اور ساتھ والی بلڈنگ 32/A میں PIBC پرنٹنگ پریس بھی قائم کیا۔ لیکن یہ کام میں چلا نہ سکا اور بارہ تیرہ ہزار روپے جو میرے والد صاحب نے اپنی ساری زندگی میں جمع کئے تھے، وہ میں نے اپنے تجربات کی نذر کر دیئے۔

دانا بابا کستوری

شاہ عالمی میں قیام کے دوران مجھے کئی قسم کے انسانوں سے واسطہ پڑا جن سے میں نے بہت کچھ سیکھا اور نئے تجرباتِ حیات بھی حاصل کئے۔ میرے فلیٹ کے سامنے والی بلڈنگ 4-B میں ایک بنگالی بابا جی رہائش پذیر تھے۔ انہوں نے اپنی اس رہائش گاہ پر "دانا بابا کستوری" کا بورڈ لگا رکھا تھا۔ وہ ہمارے ہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ آدمی دلچسپ تھے اور باتیں بڑی خوبصورت اور چچی تلی کرتے تھے۔ میرے علاوہ دفتر کے دوسرے لوگوں سے بھی ان کی گپ شپ رہتی تھی۔

اس بنگالی بابا میں ایک نرالی بات یہ تھی کہ وہ باقاعدگی سے ہر رات "اس بازار" کی سیر کو جاتے تھے۔ ہم ان سے پوچھتے تھے کہ "بابا تم نیک آدمی ہو۔ تم وہاں کیا کرنے جاتے ہو؟" ان کا جواب "معرفت" کے رنگ میں رنگا ہوتا اور اس کے کچھ بھی معنی نکالے جاسکتے تھے۔ وہ کہتے کہ اگر

Marfat.com

ہم وہاں نہیں جائیں گے تو وہ لوگ کھائیں گے کہاں سے؟

اور میں سوچتا رہتا کہ کیا یہ کستوری کا کمال تھا؟ یا ہم سے بابا کی مراد وہ تمام تماشبین تھے جو وہاں جاتے تھے یا ہم سے وہ اپنی ذات مراد لیتے تھے۔ یا وہ واقعی......

وہ جنہیں رات کو پریاں اٹھا لے جاتی تھیں

جس طرح میں ''دانا بابا کستوری'' کی ''اس بازار'' والوں کا ''رازق'' ہونے کی بات نہیں سمجھ سکا تھا اسی طرح میں ایک تندرست و توانا، خوبصورت، گورے چٹے اور باتونی پیر فرتوت کے بارے میں، طباعت کے مختلف شعبوں سے وابستہ سنجیدہ اور متین حضرت کی یہ بات بھی نہیں سمجھ پایا کہ انہیں رات کے وقت پریاں اٹھا لے جاتی تھیں۔ بعض لوگ تو یہاں تک کہتے تھے کہ ہمارے سامنے دروازے پر دستک ہوئی۔ پیر فرتوت فوراً اٹھے اور سیڑھیاں چڑھتے ہی غائب ہو گئے۔ انہیں تمام گھروں کی چھتوں پر تلاش کیا لیکن نہ ملے۔ اگلی صبح وہ اپنے بستر پر بے سدھ پڑے ملتے۔ ان کا جسم درد سے ٹوٹ رہا ہوتا۔ دو تین بے تکلف دوست مجھ سے پوچھتے کہ ''ان کو پریاں کیوں اٹھا لے جاتی ہیں؟'' میں تو یہ بھی تسلیم نہیں کرتا تھا کہ پریاں واقعی کوئی مخلوق ہے اور اگر ہے تو ان کا انسانوں کو اٹھا لے جانا کیا معنی رکھتا ہے؟۔ پھر وہ ادھیڑ عمر کے بندے کو کیوں اٹھا لے جاتی تھیں؟ مجھے پوچھنے والوں کی عقل پر بھی رونا آتا کہ وہ خود ان کو چھت کی طرف جاتے اور غائب ہوتے دیکھتے ہیں اور پھر صبح اچانک بستر پر دراز بھی پاتے ہیں۔ دوسری طرف وہ بزرگ ہی ان کو بتاتے کہ وہ صبح اس وجہ سے بیدار نہیں ہو سکتے کہ رات پریوں کے ہاں گزار کر آتے ہیں۔ کیا پریاں ان سے مشقت کراتی تھیں کہ وہ نہ صرف تھک جاتے تھے، بلکہ ان کے جسم کا بند بند ٹوٹنے لگتا ہے اور انہیں بستر پر ہی آرام ملتا ہے؟

میرے خیال میں تو وہ بزرگ نہ صرف کام چور تھے بلکہ چڑیا بیگم (افیون) کا استعمال بھی کرتے تھے۔ نشہ ٹوٹ جاتا تو ان کا بدن دکھنے لگتا۔ ان کے متعلق بک بک جھک جھک چلتی رہتی۔ یار لوگوں کو جب کوئی اور موضوع نہ ملتا تو کام کرتے کرتے ایک پکار اٹھتا...... ''حوروں کے

Marfat.com

بسیرے ہیں لاہور کی گلیوں میں'' ......دوسرا پکارتا ''پریوں کے تو ڈیرے ہیں لاہور کی گلیوں میں'' تیسرا الاپتا'' کچھ اداس وڈیرے ہیں لاہور کے جلد سازوں میں،'' ادھر مصرعہ گرتا، اُدھر چنیا بیگم کے عاشق کا ذکر شروع ہو جاتا۔

☆☆..........☆..........☆☆

Marfat.com

Marfat.com

کاروباری تجربے

مجھے اپنے نئے کاروبار سے آمدنی ہو رہی تھی۔ لیکن جب روپیہ آتا تو اس کے ساتھ ہی کئی نئے کام بھی نکل آتے۔ اس طرح دس روپے آتے تو بیس روپوں کی مزید ضرورت محسوس ہوتی۔ میں روپے پیسے اور کاموں کی تقدیم تاخیر کے حساب میں مصروف رہتا کہ کتنا خرچ ہو چکا ہے اور کتنا درکار ہے۔ فلاں ادائیگی کیوں کر ہوگی اور فلاں ادائیگی کو مزید کتنے دن روکا جا سکتا ہے۔ کاروباری اخراجات کے علاوہ گھریلو ذمہ داریاں نبھانا بھی ایک اہم مسئلہ تھا۔

ٹیکس انسپکٹر ناراض ہو گیا

ایک روز صبح دس بجے کے قریب میرے دفتر میں ایک انکم ٹیکس انسپکٹر آن دھمکا۔ آتے ہی اس نے مجھ سے کاروبار کی آمدن و خرچ کا ریکارڈ طلب کیا۔ چند رجسٹرات کے نام لئے۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ مجھے یہ سوجھا ہی نہیں تھا کہ انکم ٹیکس والے بھی آ سکتے ہیں۔ ستم بر ستم یہ کہ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس محکمے سے آنے والے حضرات سے کیسے برتاؤ کیا جاتا ہے؟ چنانچہ انسپکٹر صاحب ہماری نااہلی کی وجہ سے بے نیلِ مرام چلے گئے لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ چیں بہ جبیں تھے۔

چند دنوں کے بعد 1954ء سے لے کر اب تک کے سالوں پر مبنی انکم ٹیکس کی ادائیگی کیلئے لکھا ہوا نوٹس مجھے آ گیا جس میں حکم دیا گیا تھا کہ فلاں تاریخ تک نوٹس میں درج شدہ ٹیکس جمع کراؤ۔ اگر اس نوٹس پر کوئی اعتراض ہو تو لکھو کہ اس کا فیصلہ عدالت کرے اور تعمیل نہ کرنے کی

Marfat.com

صورت میں ضابطے کی کاروائی ہوگی۔ میں نوٹس دیکھ کر ہی حواس باختہ ہوگیا تھا۔ سر پکڑ کر بیٹھ گیا مقررہ تاریخ تک ٹیکس کی رقم ادا کرنے کی مجھ میں استطاعت ہی نہ تھی۔ تاہم میں مقررہ تاریخ کو انکم ٹیکس افسر کی خدمت میں اصالتاً حاضر ہوگیا۔

انکم ٹیکس افسر کا مشورہ

باتیں کرتے کرتے اور اپنے نئے کاروبار میں درپیش مشکلات کا ذکر کرتے کرتے میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور میں زاروقطار رونے لگا۔ میرے اندر کی پژمردگی میرے چہرے پر پھیل گئی۔ تجربہ کار انکم ٹیکس افسر سے میری اندرونی حالت چھپی نہ رہی۔ اس نے اپنے محکمانہ نوٹس کے ساتھ منسلک میری درخواست پر کچھ لکھا اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تم بالکل اناڑی اور سادہ لوح شخص ہو کہ انکم ٹیکس لگنے پر گھبرا گئے ہو۔ تم نئے نئے کاروباری لگتے ہو۔ میاں! کاروباری حضرات تو ٹیکس لگنے پر خوش ہوتے ہیں۔ اس سے ان کے کاروبار کی ٹھوس حیثیت تسلیم ہوتی ہے۔ بڑی کمپنیاں اور ادارے جب مال خریدنے کے لئے ٹنڈر طلب کرتے ہیں تو وہ مال سپلائی کرنے والے اداروں کی انکم ٹیکس گزار ہونے کی تصدیق بھی طلب کرتے ہیں۔'' وغیرہ وغیرہ

میں یہ باتیں حیرت سے سن رہا تھا۔ مجھے انکم ٹیکس افسر کی باتیں اور ان کا باتیں کرنے کا انداز اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے مزید کہا: ''میاں! میں نے تمہارے انکم ٹیکس کی ادائیگی کے لیے اقساط مقرر کردی ہیں۔ انکم ٹیکس کے کسی وکیل یا ماہر سے رابطہ کر کے اپنا ریکارڈ تیار کراؤ۔ آئندہ تمہارے کام آئے گا۔ ایک قسط آج کل میں جمع کرادو اور پکے کاروباری بن جاؤ۔''

کتابوں کی اشاعت

پندرہ روزہ ''چودھویں صدی'' کی اشاعت کے ساتھ ساتھ کتابوں کی پبلشنگ کا کام بھی جاری تھا۔ ان دنوں اللہ کے فضل وکرم سے میرے پاس چھ سات آدمی کام کرتے تھے۔ ان میں سے ایک فاروقی صاحب تھے، دراز قد، بارعب اور باریش، ان کے بڑے بھائی کا کراچی میں

Marfat.com

پبلشنگ کا خاصا بڑا ادارہ تھا، نیک اور پرہیزگار انسان مشہور تھے۔ اس کے برعکس میرے ساتھ کام کرنے والے فاروقی صاحب بڑے زندہ دل اور شوخ طبع کے مالک تھے، خوبصورت لباس پہنتے، اچھا کھانا کھاتے اور فلم بینی کے بھی شوقین تھے۔ دوسروں کی پارٹیاں کرنے اور اپنی دعوتیں کروانے میں گہری دلچسپی لیتے تھے اور اس کے لئے وہ موقعہ کی تلاش میں رہتے تھے۔ مثلاً اگر کسی کی قمیض، سوئیٹر یا کوٹ کا بٹن بھی ٹوٹ جاتا اور وہ نیا بٹن لگوالیتا تو فاروقی صاحب اسے اہتمام سے نیا بٹن لگوانے پر مبارکباد کہتے اور ساتھ ہی پارٹی کا مطالبہ بھی کردیتے۔ پارٹی کھانے کا کوئی موقع ضائع نہ جانے دیتے۔ دوسری طرف کوئی ان کی تھوڑی سی تعریف بھی کرتا تو فوراً ساتھ کی دکان سے برفی، لڈو منگوا کر پیش کرتے۔ کسی بڑے واقعے پر دوستوں کو ہوٹل میں چائے پلاتے اور ساری تنخواہ خرچ کرڈالتے تو کہتے: ''رہے نام اللہ کا''۔ تانگے پر اگلی نشست پر اکیلا بیٹھ کر فلم دیکھنے جانا بھی ان کا خصوصی شوق تھا۔ نئی فلم لگتی تو بلیک میں ٹکٹ خریدتے اور پہلے ہی دن فلم دیکھتے یا قبل از وقت اپنی نشست سینما ہال میں مخصوص کروالیتے۔ فلم دیکھنے کے بعد لکشمی چوک میں ہم سب لوگ سڑک کے کنارے بیٹھ کر گردے، کپورے اور چانپیں کھا کر خوب تسکینِ کام و دہن کرتے۔

جب تک فاروقی صاحب میرے ساتھ کام کرتے رہے تب تک پارٹیوں کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ فاروقی صاحب کے برادر بزرگ کا گھر کراچی سے کچھ فاصلے پر لسبیلہ جانے والی سڑک پر تھا۔ فاروقی صاحب کی معیت میں ان سے ایک مرتبہ ملاقات بھی ہوئی۔ اس ملاقات میں کچھ اور دوست بھی میرے ہمراہ تھے جو کراچی میں سیر و تفریح کے لیے گئے تھے۔ فاروقی صاحب کے کسی دوست نے ان سے کہا تھا کہ ''کراچی میں جا کر اگر تم ہاکس بے نہیں گئے تو سمجھو تم نے کراچی دیکھا ہی نہیں ہے''۔

ہاکس بے کے نظارے

ان کے ارشاد پر کراچی کا ہاکس بے دیکھنے کے لئے ہم بوٹا مارکیٹ پہنچے۔ ایک ٹیکسی والے کو ہاکس بے چلنے کے لئے کہا۔ وہ ہمیں دیکھ کر مسکرایا۔ ساتھ کھڑے ڈرائیور حضرات بھی

Marfat.com

ہماری فرمائش کا سن کر مسکرانے لگے تھے۔لیکن ہم ان کا مطلب نہ سمجھ سکے کہ کیوں مسکرا رہے تھے۔ ان کا مسکرانا آپس کی کسی بات پر بھی ہو سکتا تھا۔ بہر کیف آنے جانے کا کرایہ طے کر کے ہم ہاکس بے کے لیے روانہ ہو گئے۔

ڈرائیور ہمیں ساحل سمندر پر لے گیا جہاں سامنے چند کیبن نظر آئے۔ان کے سرے پر ٹیکسی رک گئی۔ہم نے ڈرائیور سے ٹیکسی روکنے کی وجہ پوچھی کیونکہ سامنے تو ریت ہی ریت اور ویرانی ہی ویرانی تھی۔اس نے بتایا کہ ہم ہاکس بے پہنچ چکے ہیں۔ہم نے وہاں کی ویرانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ''اِدھر تو کچھ بھی نہیں ہے''۔ڈرائیور بولا تمہاری سادگی کی وجہ سے ہی تو سب ڈرائیور لوگ تم پر مسکرا رہے تھے۔یہاں تو لوگ عیاشی کے لئے آتے ہیں اور یہ بازار شام کو بجتا ہے، تم صبح سویرے آ گئے ہو''۔اب ہمیں خود اپنی حالت پر شرمندگی محسوس ہوئی۔لیکن کمروں کو اندر سے دیکھنے کی خواہش بھی پیدا ہو گئی تھی۔

ٹیکسی ڈرائیور ہمیں ایک بہت بڑے ہال کمرے میں لے گیا جس کے سامنے سمندر لہریں مار رہا تھا۔ہال میں رنگین چھتریاں لگی ہوئی تھیں۔جن کے نیچے کرسیاں پڑی تھیں۔کمروں میں نفیس قسم کے بیڈ لگے ہوئے تھے۔صبح کے اس وقت سوائے ایک بیرے کے ہمیں وہاں کوئی اور شخص نظر نہیں آیا۔ہم نے اس بیرے سے چائے لانے کے لئے کہا تو اس نے معذرت کی کہ ابھی دودھ نہیں آیا۔تاہم اس نے کہا کہ اگر کچھ اور پینا ہو تو بتایئے۔اس کا انداز ایسا تھا کہ ہم ''مشروب'' کا مطلب سمجھ گئے۔پھر بیرے نے ڈرائیور کے ساتھ کچھ سرگوشی کی اور اس نے توجہ بیرے کی تجویز کی طرف دلائی تو ہم نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور ''استغفر اللہ'' کہا۔اب ہم نے ڈرائیور کو واپس چلنے کے لئے کہا دراصل ''ہاکس بے'' ہمارے مزاج کے مطابق نہیں تھا۔جونا مارکیٹ پہنچ کر ہم نے زوردار قہقہہ لگایا کہ خیر سے بدھو گھر کو آئے۔فاروقی صاحب کو جرمانہ کیا گیا کہ انہوں نے ہمیں گمراہ کرنے کی کوشش کی تھی اور ایک غلط جگہ پر بھیج دیا تھا۔

شاہ عالمی کا نوجوان

دراصل ہمارے ساتھ وہ کچھ ہوا تھا جو شاہ عالمی کے ایک نوجوان کے ساتھ لاہور

Marfat.com

میں ہوا تھا۔ اس کے کوٹ پر کسی نے ایک بڑا سا سٹکر ''یہ اُلو ہے'' چپکا دیا تھا۔ وہ جہاں سے بھی گزرتا لوگ اس پر ہنستے۔ پہلے تو اسے لوگوں کے ہنسنے کی وجہ ہی کا پتہ نہ چلا۔ پھر جب اسے احساس ہوا کہ اس پر ہنسا جا رہا ہے تو اس نے اپنے لباس اور جوتوں پر نظر ڈالی لیکن اسے کوئی خرابی نظر نہ آئی۔ اب اس نے ایک نوجوان کو مسکراتے دیکھ کر پوچھا۔ ''بھائی صاحب! کیا بات ہے؟ کیا میری شکل میں کوئی کارٹون جیسی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے؟''

''نہیں بھائی! کسی نے تم سے مذاق کیا ہے...... ذرا کوٹ اتار کر دیکھو تو......''

اس نے کوٹ اتار کر دیکھا تو مسئلہ حل ہو گیا۔ اس نے سٹکر اتار دیا لیکن اب خود بھی ہنسنے لگا۔ یہ واقعہ میں نے اس لیے لکھا ہے کہ اگر ہم جونا مارکیٹ میں ہی ٹیکسی ڈرائیور سے حقیقت دریافت کر لیتے تو ہاکس بے جا کر خفت کیوں اٹھاتے۔

میرے حاسد بھی پیدا ہو گئے

ایک دفعہ میرے ساتھ کام کرنے والے ایک کارکن نے میرے ساتھ ایک واضح بددیانتی کی۔ وہ دوسرے شہروں کو کتابیں بھیجنے کے لئے پیکنگ کیلئے دو کارٹن خرید کر لایا۔ اس کی قیمت ایک روپیہ کی بجائے مجھ سے ڈیڑھ روپیہ فی کارٹن وصول کر لی۔ مجھے اس کی اس حرکت کا پتہ چل گیا تو میں نے اسے بڑی نرمی سے اپنی غلطی کو تسلیم کر لینے کو کہا لیکن وہ مصر رہا کہ اس نے کوئی بددیانتی نہیں کی۔ میں نے اس کا حساب کر کے اسے فارغ کر دیا۔

اب اس شخص نے اپنے انتقام کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لیے میرے خلاف افواہیں پھیلانی شروع کر دیں۔ میری شہرت کو داغدار کرنے کے لئے غلط اور من گھڑت واقعات میرے دوستوں تک پہنچانے لگا۔ ان میں سے ایک افواہ یہ تھی کہ میں نے غلط ذرائع سے بہت سی دولت جمع کر لی ہے۔ اس ضمن میں اس نے یہ واقعہ ''اختراع'' کیا کہ میں اپنے کسی کام کے لئے فلاں بنک میں گیا تھا، وہاں ملک مقبول احمد تیرہ چودہ کروڑ روپے کے بانڈز چودہ ''توڑوں'' میں بند کر کے لایا اور یہ ''توڑے'' بنک کے لاکر میں رکھوائے۔ ملک مقبول نے مجھے دیکھا تو اس کا رنگ

Marfat.com

فق ہو گیا اور لاکر جلدی جلدی بند کر کے وہاں سے چلا گیا۔ اس قدر دولت اس نے کس طرح حاصل کر لی ہے؟ کیا یہ ساری دولت اس نے کتابوں سے کمائی ہے؟ یہ شخص ضرور کوئی اور ہی کام کرتا ہے؟ شاید اِدھر کا مال اُدھر کرتا ہے۔ جن صاحب نے مجھے یہ بات سنائی وہ کام کاج میں پرانے ساتھی تھے۔ وہ میرے عادات و خصائل کے شناسا تھے، خود ہی کہنے لگے "اس پیر فرتوت کو یہ تو پتہ چل گیا کہ آپ کے لاکر میں کتنی رقم کے بانڈز رکھے جا رہے ہیں مگر اسے یہ علم نہیں ہو سکا کہ لاکرز کتنے بڑے ہوتے ہیں؟ اور کیا لاکر میں چودہ "توڑے" رکھے جا سکتے ہیں؟ میرا یہ تجربہ ہے کہ اس قسم کے حاسد ہمارے معاشرے کا حصہ ہیں۔ خود محنت نہیں کرتے، دوسروں کی محنت اور دیانت کی کمائی کو حسد کی نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں لیکن اس قسم کے لوگ دیانتدار بندے کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے اور حسد کی آگ میں خود ہی جل کر مر جاتے ہیں۔

نیچاں دی اشنائی کولوں فیض کسے نہ پایا
کیکر تے انگور چڑھایا ہر گچھہ زخمایا

بغیر ٹکٹ سفر

کراچی کے سابقہ سفر کے بعد بھی کاروباری سلسلہ میں کئی مرتبہ مجھے کراچی جانا پڑا۔ ایک دفعہ تقریباً ایک ہفتہ قیام کرنا ہوا، میں فارغ اوقات میں کلفٹن اور منوڑہ کی سیر کے لئے بھی چلا جاتا۔ ایک روز کلفٹن میں چائے پینے کے بعد دکاندار کو پیسے دینے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو مجھے ایک جھٹکا سا لگا، میری جیب کٹ چکی تھی۔ خوش قسمتی سے اوپر کی جیب میں چند روپے بچ گئے تھے۔ اب میں بہت پریشان ہوا، ہوٹل کا کرایہ تو میں نے پیشگی دیا ہوا تھا لیکن سوچنے لگا کہ اب واپسی کا کیا ہوگا؟ کسی بک سیلر سے ذکر کرتے اور قرض مانگتے ہوئے شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ کیونکہ اس وقت کراچی میں لوگوں سے زیادہ گہرے تعلقات استوار نہیں ہوئے تھے۔ میں نے اسی پریشانی کے عالم میں ہوٹل آ کر اپنا بریف کیس لیا اور سٹیشن پر آ کر لاہور جانے والی گاڑی میں بغیر ٹکٹ کے سوار ہو گیا، خوش قسمتی سے راستے میں کوئی ٹکٹ چیک کرنے کے لیے نہیں آیا۔ ملتان

Marfat.com

ریلوے سٹیشن پر میں گاڑی سے اتر گیا اور بچ بچا کر سٹیشن سے باہر نکل آیا اور شہر کے ایک مشہور ہوٹل (نام یاد نہیں رہا) میں آ کر کمرہ کرایہ پر لے لیا۔ ان دنوں میں اچھا خاصا بابو ٹائپ تھا، کاؤنٹر پر موجود آدمی نے رجسٹر پر میرا نام وغیرہ لکھ کر کمرے کی چابی مجھے دے دی۔ کمرے میں آ کر میں نے کھانا منگوایا، کھانا بہت لذیذ تھا، کھا کر حالت کچھ سنبھلی۔ کراچی سے روانہ ہونے کے بعد میں نے کھایا پیا ہی نہیں تھا کیونکہ جیب میں تو کچھ تھا ہی نہیں۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد ہوٹل سے ہی میں نے اپنے دوست حنیف چوہدری کو فون کیا، ان کے گھر والوں نے بتایا کہ وہ ملتان سے باہر ہیں، دو تین روز تک واپس آئیں گے۔ میں نے بھی فیصلہ کر لیا جب تک حنیف چوہدری واپس نہیں آتے، یہیں قیام کروں گا۔ چنانچہ ہوٹل میں مزے سے انواع واقسام کے کھانے کھاتا رہا اور بل بنتا رہا۔ تین دن کے بعد حنیف چوہدری کے گھر فون کیا تو وہ واپس آ چکے تھے۔ میں نے ان کو فون پر ہی اپنی رام کہانی سنائی تو وہ فوراً ہوٹل میں آ گئے، میں نے ان سے اپنی ضرورت کے مطابق رقم لے کر ہوٹل کا بل ادا کیا اور ریل کا ٹکٹ لے کر لاہور پہنچ گیا دوسرے دن چوہدری حنیف صاحب کو شکریہ کے ساتھ منی آرڈر بھجوا دیا۔ یہ وہی چوہدری حنیف ہیں، جو ایک عرصہ تک امروز ملتان کے فیچر رائٹر رہے ہیں۔

☆☆..........☆..........☆☆

Marfat.com

Marfat.com

اِرادوں کی بلندی

اے مرد خود آگاہ بلندی پہ نظر رکھ
ہے تیرے لیے موت تیری پست نگاہی

مقبول اکیڈمی

''مقبول اکیڈمی'' قائم کرنے کے بعد ہی میں نے زندگی کی ایک بڑی شاہراہ پر قدم رکھ دیا تھا۔ اس شاہراہ پر چلتے چلتے بڑے کٹھن مقامات آئے۔ مجھے کئی حوصلہ شکن مراحل سے گزرنا پڑا لیکن میں نے ہمت نہ ہاری، خود اعتمادی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ ہر مشکل کا یقین اور حوصلے سے مقابلہ کیا اور اللہ تعالیٰ پر بھروسا رکھتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھا۔ مقبول اکیڈمی کا قیام کسی جلد بازی کا نتیجہ نہیں تھا۔ اس کے پیچھے میرا عزم اور اس کاروبار کا گہرا مشاہدہ تھا۔ میں نے ملک میں موجود اشاعتی اداروں کا بغور جائزہ لیا تھا، ان کے طریق کار کو سمجھا، اور بڑے غور و فکر کے بعد ایک اشاعتی ادارہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا تو اسے کتابوں کی دنیا میں ایک معتبر اور قابلِ رشک ادارہ بنانے کے لیے ہمت کی کمر باندھ لی۔ لاہور میں اس وقت کئی نامور اشاعتی ادارے کام کر رہے تھے۔ میں ان سے خوف زدہ نہیں تھا اور نہ ہی میرا ارادہ ان سے ''مقابلہ آرائی'' کا تھا۔ ان اداروں کی کامیابی میرے لئے مثال تھی اور میں ایسی کتابوں کی اشاعت کا خواہش مند تھا جن سے آئندہ نسلیں بھی مستفید ہوں۔ یہ آسان کام نہیں تھا۔ مقصد اگر محض تجارت اور نفع کمانا ہوتا تو اس کے بھی سو طریقے اشاعتی دنیا میں موجود تھے۔ میں نے ان سب کا مطالعہ کر لیا تھا۔ کتاب چھاپنا ہوتا تو فوراً شائع کی جا سکتی تھی لیکن میں ایسی کتابوں کی تلاش میں تھا جو دنیا کو روشنی فراہم کرتیں اور نہ صرف میرے لیے

Marfat.com

افتخار باعث ہوتیں بلکہ میری شفاعت کا وسیلہ بھی بنتیں۔

جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

رئیس احمد جعفری سے پہلی ملاقات

بہت دنوں کے غور وفکر کے بعد میں نے اس دور کے بے مثال ادیب جناب رئیس احمد جعفری سے ملاقات کرنے اور رہنمائی حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اُن دنوں ٹیگور پارک (میکلوڈ روڈ) میں قیام پذیر تھے۔ رئیس احمد جعفری بڑے باکمال ادیب تھے۔ ملک اور قوم کا درد ان کے دل میں سمایا ہوا تھا۔ وہ اپنے قلم کو مسلمانوں کی ترقی کے لئے استعمال کرتے تھے اور تصنیف و تالیف ان کی زندگی کا ایک اعلیٰ نصب العین تھا۔ وہ اُن دنوں شہرت کے عروج پر تھے۔ مجھے اُن سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور کچھ دیر کی بات چیت کے بعد میں نے اپنا مدعا بیان کیا۔ جعفری صاحب بہت وضع دار اور شریف النفس انسان تھے۔ میری استدعا کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے انہوں نے وعدہ فرمایا کہ وہ بہت جلد مجھے اپنے چند مسودوں سے نوازیں گے۔ اشاعت کے پیشے میں یہ میرا اوّلیں قدم تھا۔ رئیس احمد جعفری صاحب کی نوازش نے مجھے ایک نیا عزم اور حوصلہ بخشا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس روز میری مسرت کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ ان دنوں جعفری صاحب کی کوئی کتاب چھاپنا بڑے اعزاز کی بات تھی۔ وہ اس دور میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے مقبول ترین مصنف تھے اور ادب کے تمام گوشوں پر ان کی گہری نظر تھی۔ اپنے وعدے کے مطابق انہوں نے مجھے دو ناولوں کے مسودے عنایت فرمائے اور میں نے یہ دونوں ناول بہت تھوڑے وقت اور خوبصورت انداز میں شائع کر دیئے۔ اور قیمت زیادہ نہ رکھی تاکہ جلدی بک جائیں۔ ان ناولوں کے بازار میں آتے ہی ایک تہلکہ سا مچ گیا۔ دونوں ناول بہت پسند کیے گئے اور تھوڑے سے وقت میں فروخت بھی ہو گئے۔ میرا سرمایہ مناسب منافع کے ساتھ واپس آ گیا۔ میں جعفری صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ مجھے مبارکباد دینے کے لئے خود اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھے

Marfat.com

اپنے سینے سے لگا کر پہلی کامیابی پر شاباش دی۔ ''مقبول اکیڈمی'' نے مقبولیت کی شاہراہ پر یہ پہلا قدم رکھا تھا۔ میں اپنے معبود کے آگے سربسجود ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دنوں جعفری صاحب کے ناولوں کی بہت مانگ تھی۔ وہ زبان و بیان کے ماہر تھے اور عوام کے مزاج کو سمجھتے تھے۔ ان کے ناولوں کے پلاٹ انوکھے اور مقدس ہوتے تھے لیکن ان میں ہلکی سی رومانی چاشنی بھی ہوتی تھی۔ کالجوں کے طلبا اور طالبات نوجوان اور بوڑھے سب ان کے ناولوں کے شیدائی تھے۔ ان ناولوں کی غیر معمولی مقبولیت اور فوری فروخت نے مجھے ایک نیا حوصلہ اور خود اعتمادی دی۔

آزادیٔ ہند:

اس کے بعد 1959ء میں جب مولانا ابوالکلام آزاد کی خودنوشت ''انڈیا ونز فریڈم'' (India Wins Freedom) شائع ہوئی تو جعفری صاحب نے مجھے مشورہ دیا کہ اس کتاب کا اردو ترجمہ شائع کیا جائے۔ اُن کا یہ مشورہ بلاشبہ صائب اور بروقت تھا۔ میں نے استدعا کی کہ وہ اپنے جواہر نگار قلم سے خود اس کا ترجمہ کریں۔ انہوں نے میری گذارش قبول کر لی اور ترجمہ شروع کر دیا۔ میں نے ساتھ کے ساتھ اس کی کتابت شروع کروا دی۔ خدا کے فضل و کرم سے ہم نے اس کتاب کو ''آزادیٔ ہند'' کے نام سے صرف ایک ماہ میں شائع کر دیا۔ یعنی ایک ماہ میں اس کا ترجمہ بھی ہوا، کتابت بھی ہوئی اور کتاب چھپ کر تیار بھی ہو گئی۔ کتاب کا ٹائٹل مشہور و معروف آرٹسٹ جالؔی صاحب نے بنایا اور اس کے ظاہری حسن نے کتاب کو چار چاند لگا دیئے۔ اس کتاب نے بھی اشاعتی مارکیٹ میں ایک تہلکہ سا مچا دیا۔ کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا پہلا ایڈیشن چند ہی دنوں میں ختم ہو گیا۔ پھر دوسرا ایڈیشن اور تیسرا ایڈیشن چھپا۔ یعنی ایک ماہ میں اس کے تین ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئے۔ اشاعتی دنیا میں یہ پہلی کتاب تھی جس کے آرڈرز ہمیں پورے ملک سے ٹیلی گرام کے ذریعے موصول ہوتے رہے۔

''آزادیٔ ہند'' بظاہر انگریزی سے ترجمہ کی گئی کتاب تھی لیکن اس کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ اس میں جعفری صاحب نے مولانا ابوالکلام آزاد کی ان باتوں کا مدلل جواب بھی دے دیا تھا

Marfat.com

جوانہوں نے پاکستان کے خلاف لکھی تھیں۔اخبارات میں کتاب کے بارے میں جو تبصرے شائع ہوئے، اُن میں ملے جلے خیالات کا اظہار کیا گیا تھا۔چند اخبارات نے سیاسی اختلافات کی وجہ سے کتاب پر مخالفانہ تبصرے کیے اور بعض نے اس کے حق میں۔ان تبصروں کی وجہ سے بھی کتاب کی اشاعت میں حیرت انگیز اضافہ ہوا۔''آزادیِ ہند،، نے مقبولیت کا ایک نیا ریکارڈ قائم کیا۔اور عالم یہ ہے کہ آج تک اس کے بے شمار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور اب تک ہو رہے ہیں۔ آزادیِ ہند پاکستان میں شائع ہونے والی واحد کتاب تھی جس کی تعریف میں ملک کی بڑی بڑی نامور شخصیات نے ہمیں تعریفی خطوط بھیجے۔ان شخصیات میں جناب قدرت اللہ شہاب، جناب ہاشم رضا، مولانا حامد علی خان، چودھری محمد علی، جناب مشتاق احمد گورمانی، ممتاز دولتانہ، گورنر مغربی پاکستان اور خان عبدالقیوم خاں جیسی شخصیات شامل تھیں۔(یہ خطوط اس کتاب میں ضمیمے کے طور پر شامل ہیں)۔دلچسپ بات یہ ہے کہ مولانا کوثر نیازی خود میرے پاس بلڈنگ کی تیسری منزل پر سیڑھیاں چڑھ کر تشریف لائے اور اپنے پرچے میں تبصرے کے لئے دو کتابیں لے گئے۔ ''آزادیِ ہند'' کی کامیابی نے مقبول اکیڈمی کو بھی بے پناہ مقبولیت بخشی۔

''آزادیِ ہند'' کی اس کامیابی نے میرے حوصلے بلند کر دیئے۔ماضی کی ناکامیوں نے مایوسی کے جو گھٹا ٹوپ اندھیرے میرے ذہن وقلب پر مسلط کر دیئے تھے وہ سب دور ہو گئے اور مجھے روشنی میں لا کھڑا کیا۔یہ میری عملی زندگی کی سب سے پہلی اور سب سے درخشاں کامیابی تھی۔کراچی سے شیخ شوکت علی اینڈ سنز کے شیخ شوکت علی اور نفیس اکیڈمی کے اقبال سلیم گاہندری صاحب شاہ عالمی میرے دفتر میں آئے''ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات'' کے الفاظ سے نوازا اور اس نوآموز کو مبارکباد دی۔شیخ شوکت علی اور سلیم گاہندری صاحب کی اشیرباد نے مجھے نیا ولولہ عطا کیا۔اس کے بعد رئیس احمد جعفری کی بہت سی کتابیں مقبول اکیڈمی سے میں نے شائع کیں، ان میں'' قائداعظم اور انکا عہد'''' خلیفہ ہارون الرشید اور ان کا عہد'''' خطبات قائداعظم'''' خون کی ہولی'' ''شہاب الدین غوری'''' تغلق'''' یزید'' اور'' یورش'' کے علاوہ کئی ناول بھی شامل

Marfat.com

ہیں۔ میرا یقین پختہ ہو گیا تھا کہ

روشنی اگر خدا کو ہو منظور
آندھیوں میں چراغ جلتے ہیں

"تمدنِ عرب" کی اشاعت

انہیں ایام میں جناب احسان دانش صاحب سے ملنے کے لئے گیا تو انہوں نے فرمایا کہ اُن کے پاس ایک نہایت نایاب کتاب ہے۔ میں اگر اسے شائع کرنا چاہوں تو ان سے لے کر شائع کر سکتا ہوں۔ اس کتاب کا نام تھا۔ "تمدنِ عرب"، اور اس کے مصنف فرانس کے نامور صاحبِ قلم "گستاؤلی بان" تھے۔ "تمدن عرب" بڑی ضخیم اور باتصویر کتاب تھی۔ اور حوالے کے طور پر کثرت سے استعمال ہوتی تھی میں نے احسان دانش صاحب سے یہ کتاب پانچ سو روپے میں خرید لی۔ اُن دنوں پانچ سو روپے ایک خطیر رقم ہوا کرتی تھی۔ یہ کتاب قیامِ پاکستان سے پہلے نواب حیدر آباد دکن کی سر پرستی میں شائع ہو چکی تھی اور اس کا اُردو ترجمہ ایک عظیم شخصیت سید علی بلگرامی صاحب نے کیا تھا۔ کتاب تو میں نے بڑے شوق سے خرید لی مگر جب اشاعت کا مرحلہ آیا تو اس کے اخراجات کا تخمینہ بہت زیادہ نکلا۔ میرے پاس رقم ناکافی تھی۔ خوب سوچ بچار کے بعد میں اپنے بڑے ماموں کے پاس گیا جو میرے سُسر بھی تھے۔ نہایت ادب و انکسار سے اپنا مدعا بیان کیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ انکار نہیں کریں گے۔ کیوں کہ روپے پیسے کے اعتبار سے اُن کی پوزیشن بہت مضبوط تھی لیکن افسوس کہ انہوں نے میری مدد کرنے سے معذوری کا اظہار کر دیا۔ اس کے بعد میں نے دوسرے ماموں محمد حسین صاحب سے رجوع کیا۔ انہوں نے نہایت شفقت اور مہربانی سے مجھے کچھ رقم عنایت فرما دی جس سے کام کا آغاز تو ہو گیا لیکن اخراجات بہت زیادہ ہونے کے باعث تیزی سے پیش رفت نہ ہو سکی۔ کتاب باتصویر تھی اور اسی وجہ سے اخراجات زیادہ تھے۔

Marfat.com

اندھیرے میں روشنی

مایوسی کے اس اندھیرے میں مجھے اپنے ایک قلمی دوست ملک اللہ داد صاحب کا خیال آیا جو ضلع میانوالی کے ایک گاؤں سلطان خیل میں رہتے تھے۔ اُن سے بالمشافہ ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی۔ صرف قلمی دوستی ہی شناسائی کا ذریعہ تھی۔ خداوند کریم کا نام لیتے ہوئے میں اُن کے پاس سلطان خیل (میانوالی) جا پہنچا۔ مجھے اس طرح اچانک اپنے سامنے پاکر انہیں حیرت بھی ہوئی اور انتہائی مسرت بھی۔ وہ ملاقات آج بھی میرے ذہن کے پردے پر ایک متحرک تصویر کی طرح جاگزیں ہے۔ ملک صاحب نے جی کھول کر میری آؤ بھگت کی اور پھر نہایت ملائمت بھرے لہجے میں میری آمد کا سبب دریافت فرمایا۔ میں نے قدرے تذبذب کے ساتھ اپنی پریشانیوں کا اظہار کر دیا۔ جواب میں انہوں نے کمال مروّت اور محبت کے ساتھ مجھے پانچ ہزار روپے عنایت فرما دیئے۔ اُن دنوں پانچ ہزار روپے لاکھوں کے برابر تھے۔ انہوں نے بڑی انکساری کے ساتھ رقم میری ہتھیلی پر رکھی اور میرے چہرے کی طرف نظر تک نہیں اُٹھائی۔ رقم کی واپسی کے متعلق اشارہ تک نہیں کیا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اپنوں کے مقابلے میں غیر اس قدر مہربان اور شفیق بھی ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے مجھے یہ رقم دے کر مجھے ہمیشہ کے لئے اپنا غلام بنالیا تھا۔

(یہاں مجھے ایک بات کہنے کی اجازت دیجئے کہ جب کوئی شخص ہم پر احسان کرتا یا مشکل وقت میں ہماری مدد کرتا ہے تو ہم اُس کے احسان کا ذکر کرتے نہیں تھکتے لیکن رب العالمین جو ہر لحہ ہم پر اپنی رحمت کی بارش کرتا رہتا ہے ہم اسے فراموش کر دیتے ہیں۔ قرآن حکیم میں رب العالمین نے فرمایا ہے کہ "انسان احسان فراموش اور کھلا جھگڑالو ہے۔" میرے نزدیک ہمارے تمام مصائب کی وجہ صرف یہی ہے کہ ہم اللہ کے احسانات اور نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتے)۔

ہاں تو میں ذکر کر رہا تھا اپنے قلمی دوست ملک اللہ داد خاں صاحب کا کہ جنہوں نے میری اس وقت مدد فرمائی جب اپنوں نے بھی منہ موڑ لیا تھا۔ شاعر نے ٹھیک ہی کہا ہے۔

Marfat.com

دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست
در پریشاں حالی و در ماندگی

میں اپنے دوست ملک اللہ داد خاں صاحب کا آج بھی ممنونِ احسان ہوں کہ انہوں نے انتہائی مشکل گھڑی میں اس ناچیز کی مدد فرمائی۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ انہوں نے عمر بھر رقم کی واپسی کا مطالبہ تو دُور کی بات ہے کبھی اس رقم کا ذکر تک نہ کیا۔ میں نے خود ہی قسطوں میں وہ رقم ادا کی۔ بلکہ ایک قسط تو اُن کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے کو بھجوائی۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے، آمین!

اسلامی کتابوں کی مبارک اشاعت

''تمدنِ عرب'' کی اشاعت کے بعد میں نے، ''تمدنِ ہند''، ''سیرتِ ابن ہشام'' اور ''عبرت نامہ اندلس'' ایسی ضخیم کتابیں بھی شائع کیں۔ اور ان کے ساتھ دیگر موضوعات پر بھی بہت سی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری رکھا۔ انہی دنوں مکتبہٴ فرینکلن نے پاکستانی پبلشرز کے اشتراک سے امریکی کتب کے تراجم شائع کرنے کا پروگرام شروع کیا تھا۔ مکتبہٴ فرینکلن کے ڈائریکٹر مولانا حامد علی خاں تھے جو نامور ادیب، دانش ور اور ممتاز ادبی رسالہ ''ہمایوں'' کے سابق مدیر تھے۔ اُردو ادب میں بغیر ڈاڑھی کے تین ''مولانا'' مشہور ہیں۔ ان میں ایک حامد علی خان تھے جو نہایت شریف النفس اور وضع دار انسان تھے۔ (باقی دو مولانا چراغ حسن حسرت اور مولانا صلاح الدین احمد صاحب تھے) مولانا حامد علی خان نے دیگر پبلشروں کے ساتھ ساتھ میری بھی سرپرستی فرمائی۔

میرا عقیدہ خطرے میں پڑ گیا

''سیرتِ ابنِ ہشام'' کا نسخہ میں نے شیخ محمد اسماعیل پانی پتی صاحب سے حاصل کیا تھا جو ان دنوں رام گلی برانڈرتھ روڈ میں رہائش پذیر تھے۔ انہوں نے اس طبع شدہ کتاب کے ساتھ اپنا

Marfat.com

تحریر کردہ دیباچہ بھی منسلک کر دیا۔ میں ان کے مذہبی عقیدے سے واقف نہ تھا اور دیباچے پر توجہ نہ دی۔ کتاب کا ٹائٹل جناب ''سید نفیس رقم'' سے لکھوایا جو نہایت ہی نفیس انسان اور فنِ کتابت کے بادشاہ ہیں۔ ان کے نفیس ہاتھوں سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ نفاست اور کتابت کے فن میں مہارت کا آئینہ دار ہے۔ یہ 1960ء کی بات ہے۔ اب تو سید صاحب نفیس الحسینی کے نام سے مشہور عالم دین ہیں اور لوگ ان سے فیض حاصل کر رہے ہیں۔ میرے ایک دوست محمد شریف قاسمی صاحب ایک روز اُن سے ملے تو باتوں ہی باتوں میں محفل میں اس ناچیز کا ذکر بھی آ گیا۔ اس وقت حضرت موصوف کے دستِ مبارک سے لکھا ہوا سیرتِ ابن ہشام کا سرورق اور اس کے ساتھ محمد اسماعیل پانی پتی کا تحریر کردہ دیباچہ بھی ان کے پیش نظر تھا۔ نفیس صاحب نے اس دیباچے کو سامنے رکھتے ہوئے میرے متعلق ارشاد فرمایا کہ (نعوذ باللہ) شاید میرا عقیدہ راسخ نہیں ہے۔ محمد شریف قاسمی صاحب نے جب مجھے یہ بتایا تو مجھے شدید ندامت محسوس ہوئی۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ میں ایک صحیح العقیدہ مسلمان ہوں اور رسول اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس سے سچی عقیدت اور ان کے آخری نبی ہونے پر راسخ ایمان رکھتا ہوں۔ قاسمی صاحب میرے عقیدے سے مطمئن ہو گئے۔ اور یہ بات انہوں نے سید نفیس الحسینی صاحب تک بھی پہنچا دی۔

احسان الحق سلیمانی سے ملاقات

اس کے بعد میں نے سیرتِ ابنِ ہشام کا نیا ترجمہ جناب احسان الحق سلیمانی سے کروایا اور ان ہی سے دیباچہ بھی لکھوایا۔ محمد اسماعیل پانی پتی کا دیباچہ حذف کر دیا۔ اس کے بعد جناب احسان الحق سلیمانی صاحب سے محبت کا تعلق پیدا ہوا تو یہ بڑھتا چلا گیا اور میں نے ان کی متعدد کتابیں شائع کیں۔ ان کی لکھی ہوئی کتاب ''رسولِ مبین ﷺ'' پر انہیں صدارتی ایوارڈ ملا اور آزاد کشمیر گورنمنٹ نے بھی اسے ایوارڈ سے نوازا۔ اس کے علاوہ ''قرآن حکیم اور ہماری زندگی'' اور ''مسلمان یورپ میں'' بھی سلیمانی صاحب کی تالیفات ہیں جو مقبول اکیڈمی سے شائع ہوئیں۔ احسان الحق سلیمانی صاحب محکمہ تعلیم میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ وہ بے حد دیانت دار اور

Marfat.com

بااصول افسر تھے۔ بہت بڑے عالم اور علم دوست تھے۔ پاکیزہ اطوار اور سچے مسلمان تھے۔

تاریخی ناولوں کی اشاعت

تاریخی ناول نگاروں میں محمد سعید صاحب کی بڑی شہرت تھی۔ وہ بہت پڑھے لکھے انسان تھے۔ تاریخ سے انہیں بڑی گہری دل چسپی تھی۔ ان کا شمار صاحبِ طرز اور مقبول ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ جو ناول بھی لکھتے، موضوع کے اعتبار سے حرفِ آخر ہوتا تھا۔ اُن کے پڑھنے والے بڑے بے چینی سے ان کے نئے ناول کا انتظار کرتے تھے۔ انہوں نے مقبول اکیڈمی کے لئے بہت سے ناول لکھے۔ ان کی تحریر میں ایک خاص وصف یہ تھا کہ وہ دیگر ناول نگاروں کی طرح تاریخی واقعات کر توڑ مروڑ کر پیش نہیں کرتے تھے بلکہ تاریخی واقعات کے استناد کو مدِ نظر رکھتے تھے۔ اُن کے طرزِ بیان میں ایسی چاشنی تھی جو اُن کے ہم عصروں کے ہاں نہیں ملتی۔ ان کے تاریخی ناول زہرۃ الروم، اطلس، مدینۃ الیہود، پاکستان کا سٹالن گراڈ، تیمور، ہمایوں، القاہرہ، الجزائر، استنبول، صقلیہ، بحری عقاب وغیرہ کئی ناول ہم نے شائع کئے۔ محمد سعید صاحب شاہ عالمی والے دفتر میں اکثر آتے اور گھنٹوں محو گفتگو رہتے تھے۔ ہمارے تعلقات پیشہ ورانہ کم اور دوستانہ زیادہ تھے۔

ایک سانولی لڑکی

انہی دنوں کی بات ہے کہ ہمارے دفتر میں ایک سانولی صورت والی لڑکی دوسرے تیسرے روز آیا کرتی تھی۔ وہ غالباً ایف اے کی طالبہ تھی اور اسے کہانیاں لکھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ اس بات کی بہت خواہش مند تھی کہ اس کی کوئی کہانی ہمارے میگزین ''چودھویں صدی،، میں شائع ہو جائے۔ یہ لڑکی بڑی باکردار اور شریف تھی، یہی وجہ تھی کہ ہم سب اس کی بہت عزت کرتے تھے خاص طور پر محمد سعید صاحب اس کی بہت حوصلہ افزائی فرماتے اور جب وہ آتی تو وہ خود جا کر اس کے لئے ''سیون اپ'' کی بوتل لے کر آتے۔ ایک روز ہمارے دفتر کے ایک آدمی نے اُس کے

Marfat.com

ساتھ ''دوستی'' کا اظہار کیا تو اس نے بڑا ہمدردانہ جواب دیا: ''آپ چونکہ ایک شادی شدہ انسان ہیں اس لئے میں آپ کی زندگی تباہ نہیں کرنا چاہتی۔''

آگے چل کر یہی لڑکی ایک مشہور ناول نگار ثابت ہوئی۔ میں نے ایسی صاحب کردار لڑکیاں بہت کم دیکھی ہیں۔ میرے دل میں آج بھی اس کے لئے بہت عزت ہے۔

☆☆............☆............☆☆

Marfat.com

درِ رحمت کھلا

دُعا پر یقین

دُعاؤں پر میرا یقین اس وقت سے ہے جب میں ابھی سنِ شعور کو بھی نہیں پہنچا تھا۔ میں خود دُعائیں مانگنا نہیں جانتا تھا لیکن کسی معمولی سی مشکل سے بھی دوچار ہو جاتا تو اپنی ''بے جی'' سے دُعا کرنے کے لئے کہتا اور ان کے ساتھ میں خود بھی ہاتھ پھیلا دیتا۔ اپنے رب کے سامنے ہاتھ پھیلاتے اور صرف اپنے خدا سے مانگتے مانگتے میں صغر سنی سے کبر سنی اور اب بڑھاپے میں داخل ہو گیا ہوں۔ ہر دور میں اللہ کریم میری ''بے جی'' کی اور میری دعائیں قبول کرتا اور مجھے آنے بہانے دیتا رہا۔ بلاشبہ مجھے گوناگوں صعوبتوں کا سامنا بھی کرنا پڑا لیکن مایوسی کا ایسا وقت کبھی نہیں آیا کہ میں کتابوں کی اشاعت سے ہاتھ کھینچ لیتا۔ میرے دل میں یہ بات ابتدا سے ہی بیٹھ گئی تھی کہ ترجمہ شدہ کتاب ''آزادیِ ہند'' نے پاکستان کی اور پاکستان سے محبت رکھنے والے افراد کی خدمت کی ہے۔ اور سرکارِ دو عالم ﷺ کی سوانح حیات ''سیرتِ ابن ہشام'' کی اشاعت سے مجھے اسلام کی خدمت کا موقعہ ملا۔ مجھے کئی مرتبہ یوں محسوس ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے میری یہ خدمت قبول کر لی اور میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ خدا کی رحمت و برکت تو مجھے پہلے بھی حاصل تھی اور میرا کنبہ کھاتا، پیتا اور شاد اور آباد چلا آ رہا تھا لیکن اب اللہ نے میرے کاروبار کی ترقی کے مزید اسباب مہیا کر دیئے، کئی راستے کھول دیئے۔

ایک اچھے مشورے پر عمل

میں اس باب میں ترقی کے ان راستوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو خود بخود کشادہ ہوتے

Marfat.com

گئے۔ مثال کے طور پر ایک دوست نے مجھے بتایا کہ اگر تم کوشش کرو تو صوبہ سرحد کا محکمہ تعلیم ''عبرت نامۂ اندلس'' اپنے ہر ہائی سکول اور کالج کے لیے کافی تعداد میں خرید لے گا۔ اس کتاب میں اندلس سے مسلمانوں کے اقتدار سے محروم ہو جانے کی تاریخی داستان درج ہے جس کا انگریزی سے اُردو میں ترجمہ مشہور مترجم مولوی عنایت اللہ دہلوی نے نظام دکن کے ایما پر کیا تھا۔ آزادی سے پہلے یہ کتاب حیدر آباد دکن سے شائع ہوئی تھی۔ میں نے یہ کتاب اپنا تمام اثاثہ جمع کر کے چھاپ لی۔ چند کتابوں کی خصوصی طور پر جلد بندی کرائی۔ پھر میں کتاب کا چھپا ہوا نسخہ لے کر سرحد کے ڈائریکٹر تعلیمات سے ملا جنہوں نے کتاب کو پسند فرمایا اور مجھے ایک سو کتب مہیا کرنے کا باقاعدہ آرڈر بھی جاری کر دیا۔ ''عبرت نامۂ اندلس'' کی قیمت فی جلد تیس (30) روپے تھی۔ اس طرح مجھے جو تین ہزار کی رقم یک مشت دستیاب ہوئی، وہ میرے کاروبار کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ تھی۔ مجھے جس قدر خوشی تین ہزار کے اس آرڈر کے ملنے پر ہوئی ویسی خوشی اس کے بعد بہت بڑے آرڈرز ملنے پر بھی نہ ہوئی۔

لائبریریوں تک رسائی

یہ غالباً 1961ء یا 1962ء کا واقعہ ہے کہ میں شاہ عالمی والے دفتر میں بیٹھا تھا۔ اُردو بازار کے ایک بہت مشہور پبلشر عبدالحمید نظامی صاحب تشریف لائے اور مجھ سے نفسیات اور بچوں کی چند چھوٹی چھوٹی کتب تین تین سو کی تعداد میں طلب فرمائیں۔ اتنی بڑی تعداد کی خریداری پر میں بہت حیران ہوا اور سوچنے لگا کہ ہم کو تو کسی دکاندار نے چند کتابوں سے زیادہ کا کبھی آرڈر نہیں دیا، نظامی صاحب اتنی زیادہ تعداد میں یہ کتابیں کہاں سپلائی کریں گے۔ چند روز کی جستجو کے بعد میں نے کھوج نکال لیا کہ موصوف محکمہ تعلیم میں لائبریری کتب کی سپلائی کرتے ہیں اور لائبریریوں میں کتابیں فراہم کرنے کے ٹنڈر اخباروں میں چھپتے ہیں۔ میرے لیے آگے بڑھنے کا یہ ایک نیا راستہ نکل آیا تھا۔ اب میں نے بھی محکمہ تعلیم کے ٹنڈروں میں مقابلہ بازی شروع کر دی۔ اس کے بعد نظامی صاحب نے کئی بار افسوس کا اظہار کیا کہ ان سے بڑی غلطی ہوئی کہ انہوں نے

Marfat.com

مقبول اکیڈمی سے زیادہ تعداد میں کتابیں خرید کرانہیں اس لائن میں آنے کا راستہ بتا دیا۔لیکن میں نے نظامی صاحب کو ہمیشہ اپنا محسن سمجھا۔ان کے حق میں دعا کی لیکن اپنے کاروباری مقابلے کے حق کو محفوظ رکھا۔اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے اوراس کی کرم نوازی سے ہی یہ غیبی راستہ میرے لئے کھل گیا۔اور کاروبار کی ترقی کے لئے مجھے ایک نیا زینہ میسر آ گیا۔میں اخبار میں کتابوں کی فراہمی کا اشتہار پڑھ کر جب ٹنڈر داخل کرتا تو ہاتھ اٹھا کر دعا کرتا۔

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

سکولوں میں سامان کی فراہمی

سکولوں میں کتب اور مدرسے کا دیگر سامان فراہم کرنا ایک الگ ہی کاروباری میدان تھا۔مجھے پتہ چلا کہ بعض تاجران کتب اپنے ذاتی تعلقات اور سرمائے کی بنیاد پر کتب کی فراہمی کے علاوہ سکولوں میں فرنیچر، گھڑیال، کھیل کود کا سامان، نقشے، چارٹس اور دریاں، ٹاٹ وغیرہ بھی فراہم کرنے کے ٹھیکے حاصل کر لیتے ہیں۔بس وہ اس ٹوہ میں رہتے ہیں کہ کب سامان مدرسہ کی فراہمی کے حوالے سے "ٹنڈر نوٹس" چھپتے ہیں، بعض ہوشیار کاروباری حضرات ٹنڈر نوٹس چھپنے سے پہلے ہی اعلیٰ تعلیمی دفاتر سے زیریں سطح پر جاری ہونے والی گرانٹ کی متعلقہ چٹھیاں حاصل کر لیتے اوران کوعلم ہو جاتا کہ کب خریداری کا رَن پڑنے والا ہے۔

واضح رہے کہ سکولوں میں متعلقہ سامان کی فراہمی ہر سال مختلف ترقیاتی سکیموں کے تحت کی جاتی ہے جو پنج سالہ ترقیاتی منصوبوں میں شامل ہوتی ہیں۔ان ترقیاتی سکیموں کے تحت ہر سال نئے پرائمری سکولوں کا اجرا کیا جاتا۔کئی پرائمری سکولوں کا درجہ مڈل تک بڑھایا جاتا اور کئی مڈل سکولوں کو ہائی سکولوں کا درجہ دیا جاتا۔کچھ پسماندہ سکولوں کی نشوونما کی سکیمیں ان میں بھی ہوتی ہیں۔اساتذہ کی ملازمت کی اسامیاں بھی نکالی جاتی ہیں۔ان سکولوں کے لئے ضروری سامان کی خریداری کے لئے ضلعی ترقیاتی کمیٹی کو لاکھوں روپیہ مہیا کیا جاتا۔اس کمیٹی کا صدر تو ڈپٹی

Marfat.com

کمشنر ہوتا لیکن دفتری امور کمیٹی کا سیکرٹری انجام دیتا جو ایک ضلعی افسر تعلیم ہوتا۔ مختلف تعلیمی اداروں کے ممبران بھی کمیٹی کا حصہ ہوتے۔ عام طور پر ڈپٹی کمشنر صاحبان اپنی معروفیت کی بنا پر کسی مجسٹریٹ کو کمیٹی کے کام کی نگرانی کے لئے نامزد کر دیتے ہیں۔ جملہ کام ضلعی افسر تعلیم ہی کو بطور سیکرٹری خریداری کمیٹی انجام دینا پڑتا ہے۔ جیسا کہ محاورہ ہے کہ "ہر کوئی اسی کا اسیر ہوتا ہے۔ جس کے ہاتھ میں کفگیر ہوتا ہے" محکمہ تعلیم کو مطلوبہ مال فراہم کرنے والے سب لوگ ضلعی انسپکٹر تعلیم سے رابطہ کرتے اور ضلعی افسر تعلیم کا عملہ دن رات کام کر کے ضابطے کی کارروائی پوری کرتا، ٹنڈر طلب کیے جاتے، مقررہ تاریخ پر کھولے جاتے، قیمتوں کے مقابلے کی فہرست تیار ہوتی، منظور کردہ ٹنڈروں کے مطابق مال کی فراہمی کے احکامات جاری کئے جاتے۔ مقررہ تاریخ تک مال فراہم نہ کیا جاتا تو دوسرے نمبر پر آنے والی فرم کو مال فراہم کرنے کیلئے ضلعی انسپکٹر تعلیم ہی "پرچیز کمیٹی" کے سیکرٹری کی حیثیت سے حکم نامہ جاری کرتا۔ خریداری کے اس سلسلے کے قواعد وضوابط بڑے سخت ہیں۔

بلیغ الدین جاوید

ٹنڈروں کے ذریعے آرڈرز حاصل کرنا اچھا خاصا معروفیت کا کام تھا لیکن کتب کی اشاعت کی طرح اس کے بھی چند اقدام تھے جن کی تکمیل کے لئے تجربہ ضروری تھا۔ اس کام کے لیے میں نے ایک پڑھے لکھے دوست بلیغ الدین جاوید کی خدمات حاصل کیں۔ وہ صاف گو، جرأت مند اور دلیر انسان تھا۔ اس کی یہ خوبی تھی کہ وہ اپنے قانونی علم اور کتابی قواعد وضوابط کے بل پر افسران کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتا تھا۔

ایک دفعہ پرچیز کمیٹی کی ایک میٹنگ میں جس کی صدارت ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر صاحب کر رہے تھے، محکمہ صنعت وحرفت کا ایک افسر، پرچیز کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے، ضلعی انسپکٹر تعلیم کی کارکردگی میں کیڑے نکال رہا تھا اور کئی کام دوبارہ کرنے اور ٹنڈروں پر درج نرخوں کی نئے سرے سے فہرستیں بنانے کے لیے کہہ رہا تھا۔ ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر صاحب بھی اس کی تائید کر رہے تھے۔

Marfat.com

محکمے کا افسر اور نمائندے سب خاموش تھے۔کام جان جوکھوں کا تھا کیونکہ پہلے ہی راتوں کو جاگ جاگ کر متعلقہ کاغذات تیار کیے گئے تھے۔بلیغ الدین جاوید محکمے کے افسر اور کارندوں کی اعانت کے لیے اٹھا اور اس نے ایک ٹنڈر دہندہ کی حیثیت سے اے۔ڈی۔سی صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔''جناب! مجھے کچھ عرض کرنے دیجئے۔،،

اجازت ملنے پر اس نے کہا کہ وہ ساری رات ضلعی انسپکٹر تعلیم کے دفتر میں اپنے ٹنڈروں کی نگرانی کیلئے موجود رہا ہے۔یہ ممبر صاحب وہاں نہیں تھے حالانکہ آپ نے آج کی میٹنگ کی تیاری کے لئے ان کو بلایا ہوا تھا لیکن وہ کرسیاں، میزیں سپلائی کرنے والے ٹھیکے دار حاجی صاحب کے ساتھ کہیں اور گئے ہوئے تھے۔دفتر ضلعی انسپکٹر تعلیم کا سارا کام پرچیز مینوئل کے مطابق ہوا۔ضلعی انسپکٹر اپنے عملے کو بار بار روکتے ٹوکتے رہے اور آپ سے ہونے والی میٹنگ یاد دلاتے رہے کہ وہاں کسی اہلکار یا ٹنڈر دہندہ اور ذمہ دار افسر کی سبکی نہ ہو۔اب جو ترمیمات محکمہ انڈسٹری کے ناحز ممبر صاحب کرنے کو کہہ رہے ہیں اس میں تو مزید ایک ہفتہ لگ جائے گا اور پرچیز کھٹائی میں جا پڑے گی۔ویسے بھی یہ ترمیمات پرچیز مینوئل کے خلاف ہیں۔اور پرچیز مینوئل کے صفحہ نمبر فلاں کے پیرا نمبر فلاں میں یہ سب کچھ درج ہے۔

اے۔ڈی۔سی صاحب نے محکمہ صنعت وحرفت کے ممبر سے پوچھا''کیا آپ نے پرچیز مینوئل کو ملاحظہ کیا ہے؟،،ممبر نے کہا کہ اس نے فلاں فلاں محکمے کی پرچیز کمیٹیوں میں شمولیت کی ہے۔وہاں یہ ہوا اور وہ ہوا اور ممبران ہی نے سب کچھ درست کرایا۔یہ فہرست بھی غلط ہے اور اس کو درست کرا کر ہی آگے بڑھا جا سکتا ہے ورنہ وہ میٹنگ کی کاروائی پر دستخط نہیں کریں گے۔

اے۔ڈی۔سی صاحب کو غصہ آ گیا اور انہوں نے کہا۔''ممبر صاحب کل پرچیز مینوئل لے کر آئیں اور ضلعی افسر یعنی سیکرٹری صاحب سے میٹنگ کریں، پھر میرے ساتھ میٹنگ کریں۔''

اگلے روز ممبر صاحب کو پرچیز مینوئل کہیں سے نہ ملی۔لہٰذا انہوں نے خاموشی سے متعلقہ کاغذات پر دستخط کر دیئے۔بلیغ الدین جاوید سے سیکرٹری اور ممبر دونوں صاحبان نے پرچیز مینوئل

Marfat.com

کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا کہ "جی ہاں! میرے دفتر میں موجود ہے،، حالانکہ بلیغ الدین جاوید نے پرچیز مینوئل کی کبھی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کا اندھیرے میں چلایا ہوا تیر نشانے پر بیٹھا تھا۔

رقوم کی ادائیگیاں

سرکاری اداروں کو فراہم کیے ہوئے مال کے بلوں کی ادائیگی بھی چیک کے ذریعے ضلعی افسر تعلیم کے دستخطوں سے ہوتی ہے۔ حکومت پنجاب نے ایک مراسلہ جاری کر رکھا تھا کہ اگر جملہ ترقیاتی گرانٹس حاصل کرنے والے محکموں کے افسران 30 جون تک رقومات خرچ نہ کر پائیں تو ان کی سالانہ رپورٹوں میں اس کوتاہی کے بارے میں منفی اندراج کیا جائے گا کیونکہ حکومت گرانٹس خرچ کرنے کے لئے جاری کرتی ہے دبا کر رکھنے کے لئے نہیں۔ اس وجہ سے محکمہ تعلیم کے ضلعی دفاتر میں مالی سال کے دو اختتامی مہینوں یعنی مئی اور جون میں گرانٹوں کو ختم کرنے کے حوالے سے بڑی رونقیں رہتی ہیں۔ بعض ڈپٹی کمشنر صاحبان یہ بھی پوچھ لیتے ہیں کہ گرانٹ کو ملے تو سال ہو گیا ہے پھر کس مقصد کے لئے اسے دس ماہ دبائے رکھا گیا؟ حالانکہ ہر سال گورنمنٹ کی طرف سے تمام محکمہ جات کو یہ ہدایت جاری کی جاتی ہے کہ مال سرکار کی خریداری کا عمل واضح، شفاف اور دیانت پر مبنی ہونا چاہیے اور یہ بھی ضروری ہے کہ گرانٹ کے جاری ہوتے ہی متعلقہ افسران خریداری کا عمل شروع کر دیں۔ افراتفری مچانے کے لئے گرانٹ کو دس ماہ تک دبا کر نہ بیٹھے رہیں اور مئی جون میں ہنگامی حالت پیدا نہ کریں کہ خریدے ہوئے مال کی پڑتال کا موقع ہی نہ ملے یا پھر گرانٹ ہی ضائع ہو جائے۔ اس ضمن میں میرا تجربہ یہ ہے کہ محکمہ تعلیم کے دیانتدار افسر تو ان احکامات پر عمل کرتے ہیں لیکن بددیانت افسران اب بھی گرانٹ آخری دو مہینوں میں ہی خرچ کرتے اور اکثر اوقات کرپشن کا شکار ہوتے ہیں۔

لائبریری کتب

اپنی کاروباری برادری کی طرح میں نے بھی مختلف محکمہ جات کے ٹنڈر نوٹس پڑھنا

Marfat.com

باقاعدگی سے شروع کر دیا۔ مقبول اکیڈمی کی طرف سے شائع کردہ بچوں کی کتب معلوماتی، علمی، نفسیاتی، معیاری اور باتصویر ہوتی تھیں۔ اس زمانے میں حکومتِ پنجاب نے کتب کی خریداری کے بارے میں ایک مخصوص حکمت عملی تیار کر رکھی تھی اور اس سلسلہ میں لائبریری کتب کی ایک فہرست تھی۔ لائبریری گرانٹ سے ساڑھے 37 فیصد رقم کی کتابیں اس فہرست سے خریدنا لازمی تھا۔ ساڑھے 37 فیصد کی کتب اس فہرست کے مطابق انتخابی ہوتی تھیں جبکہ بقیہ 25 فیصد رقم سے ہر قسم کی کتابیں خریدی جا سکتی تھیں لیکن لازم تھا کہ ان کتب میں سے کوئی کتاب ''نظریہ پاکستان''، ''حکومت پاکستان'' اور ''مملکت خداداد پاکستان'' کے خلاف مواد پر مشتمل نہیں ہونی چاہیے۔ مقبول اکیڈمی نے جو کتابیں شائع کیں وہ سب نظریہ پاکستان، تاریخ اسلام، اور تعمیری موضوعات پر تھیں اور ان پر اخبارات میں ہمیشہ حوصلہ افزا تبصرے چھپتے اور انہیں ملک وقوم کے لئے مفید قرار دیا جاتا تھا۔ مقبول اکیڈمی کی کتب حکومت کی فہرست میں شامل نہ تھیں کیونکہ میری اکیڈمی نے کبھی محکمہ تعلیم کو کتب فراہم ہی نہ کی تھیں۔ اس میدان میں تو اکیڈمی ابھی اتری تھی، لہٰذا میں نے پنجاب حکومت کی سیکرٹریٹ کی متعلقہ برانچ کو اپنی جملہ کتابوں کے ساتھ درخواست گزاری کہ ان کتب کو لائبریری کتب کی فہرست میں شامل کیا جائے۔ حکومتِ پنجاب نے میری درخواست قبول کر لی جس سے مجھے تو تقویت ملی لیکن پہلے سے سکولوں کو لائبریری کتب مہیا کرنے والوں کو سخت تکلیف پہنچی، اس لئے کہ میری کتب کی ایک اچھی خاصی تعداد لائبریری کتب کی فہرست میں آ گئی تھی۔

لائبریری کتب کی فراہمی کا نیا نظام

ایک سال کے بعد حکومتِ پنجاب نے محکمہ تعلیم کو سیکرٹریٹ کی سطح پر سکولوں کی لائبریریوں کیلئے مختلف پبلشروں کی شائع کردہ کتب کی ایک نئی فہرست تیار کرنے کا حکم بھیجا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کتب کی خریداری کے بارے میں اخبارات وغیرہ میں شکایات شائع ہوتی رہتی تھیں کہ وہ گراں ہوتی ہیں، ان کی پبلشنگ ناقص ہوتی ہے اور مواد کے لحاظ سے بھی بالکل گھٹیا ہوتی

Marfat.com

ہیں۔ یہ شکایات غلط بھی نہیں تھیں کیونکہ خریداری کرنے والے اہلکار ناشرین سے اپنے لیے زیادہ سے زیادہ کمیشن طلب کرتے تھے۔ ان شکایات کے پیش نظر ہی محکمہ تعلیم نے نئی فہرستِ کتب جاری کی جس میں مختلف پبلشروں کی جن میں مقبول اکیڈمی بھی شامل تھی دو، دو، چار، چار کتابیں ہی منتخب کی گئیں۔

اپنی کتابوں کی کمی کی اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے میں نے سات آٹھ پبلشروں سے جن کی کتب منظور ہوئی تھیں، ان کی کتب کا پورا ایک ایک ایڈیشن خرید لیا اور ان کی منظور شدہ کتب کو اپنی فہرست میں شامل کر لیا۔ اس طرح میری ملکیتی کتابوں کی تعداد میرے مخالفین کی مجموعی کتابوں سے بھی زیادہ ہوگئی اور سالانہ خریداری میں مقبول اکیڈمی کی فراہم کردہ کتب کی تعداد سرفہرست رہی۔ ظاہر ہے کہ میری کامیابی پر مخالفین کا تلملانا لازمی امر تھا۔

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اُسی کا ہے

میں اپنے تجربات، سوچ اور جدوجہد کا جائزہ لیتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ میں نے کسی کام کو اپنی دسترس سے کبھی دور نہیں دیکھا۔ میں نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ فلاں کام میری پہنچ میں نہیں۔ میں ہمت، حوصلے اور اللہ کے بھروسے پر نیک نیتی اور پختہ ارادے سے آگے کی سمت قدم اٹھاتا ہوں اور ہر وقت اپنی باعزت کامیابی کی دعا کرتا ہوں۔ میں ہیر پھیر سے دور رہتا ہوں اور اپنے عمل میں بدنیتی کی آمیزش نہیں ہونے دیتا۔ اللہ تعالیٰ تو نیتوں کو جانتا ہے۔ دوستوں سے عرض ہے کہ وہ فخر تو کریں لیکن کبھی غرور اور تکبر کے مرتکب نہ ہوں۔ اگر آج وہ بلند ہیں تو خدا نہ کرے کل کو وہ اور ہم سب پست بھی ہو سکتے ہیں۔ مولانا صلاح الدین احمد کے پرچے ''ادبی دنیا'' میں ایک دفعہ میں نے یہ اشعار پڑھے تھے۔

دل کیا، دل کی ہستی کیا لٹ ہی گئی تو، بستی کیا
کیسا فخر بلندی پر دور کہیں ہے پستی کیا ؟

Marfat.com

زندگی کے نشیب وفراز میں ان اشعار نے مجھے ہمیشہ حوصلہ دیا ہے۔

ایک مقدمے کی روداد

1961ء میں سرگودھا کے ضلع انسپکٹر تعلیم نے سوا لاکھ روپے کی مالیت کی لائبریری کتب کی فراہمی کے لئے اخبارات میں مشتہری کے بعد ٹنڈر طلب کئے۔ باقی سب کتب فروشوں کے مقابلے میں مقبول اکیڈمی نے مطبوعہ قیمت پر زیادہ ڈسکاؤنٹ پیش کیا جس کی بنا پر ضلعی خریداری کمیٹی نے ضابطے کی مکمل کاروائی کے بعد مقبول اکیڈمی کا ٹنڈر منظور کیا اور کتب کی فراہمی کا حکم جاری کر دیا۔ یہ مقبول اکیڈمی کی بہت بڑی کامیابی تھی جو پبلشنگ کے شعبے کے میرے نو (9) معاصرین کے لئے بڑی تکلیف کا باعث بنی اور ان سب نے مقبول اکیڈمی کے خلاف کارروائی کے لئے ایک سازش تیار کر لی۔

میں نے ضلعی انسپکٹر تعلیم کے آرڈر کے مطابق بروقت کتب مہیا کر دیں۔ مخالف گروپ میں میرے جانے پہچانے کتب ساز اور کتب فروش احباب شامل تھے جن میں ایک منافق، کینہ نواز اور سازشی ذہن کا مالک نام نہاد "دانشور"، بھی شامل تھا۔ اس نے خوب بڑھا چڑھا کر اخبارات میں مقبول اکیڈمی کے خلاف خبریں لگوائیں۔ وہ اپنے کینہ پرور اور سازشی قلم سے نشتر زنی کرتا رہا۔ اس نے لاہور میں متعلقہ ناشرین کی ایک میٹنگ کرنے کے بعد مقبول اکیڈمی کے خلاف ایک درخواست افسرانِ اعلیٰ کو گزاری کہ مقبول اکیڈمی تو کتب کی صنعت میں نو وارد ہے، اس نے ضلع سرگودھا میں لائبریری کتب فراہم کرنے کے احکامات ضلعی محکمہ تعلیم کی ملی بھگت سے حاصل کئے ہیں اور چونکہ ضلعی انسپکٹر تعلیم سرگودھا چند دنوں کے بعد ریٹائر ہونے والے تھے لہٰذا ان کو کتب فراہم کرنے کے احکامات جاری نہیں کرنے چاہئیں تھے۔ علاوہ ازیں جو کتب مقبول اکیڈمی نے فراہم کی ہیں وہ حکومت کی منظور کردہ فہرست سے مطابقت نہیں رکھتیں۔

مخالفین اپنی کوششوں میں اس حد تک منظم تھے کہ جون 1961ء میں یہ سارا معاملہ محکمہ انسداد رشوت ستانی کو تحقیقات کیلئے بھجوا دیا گیا اور ساتھ ہی محکمانہ تحقیقات کے نتیجے میں سرگودھا

Marfat.com

ڈویژن کے انسپکٹر سکولز سمیت کئی دیگر افسران کو معطل کر دیا گیا۔ محکمہ انسداد رشوت ستانی نے بھی کارروائی مکمل کرنے کے بعد معاملہ انٹی کرپشن جج سرگودھا کی عدالت میں برائے سماعت بھیج دیا۔ میں نے سازش کا انکشاف ہوتے ہی اپنے بدخواہ معاصرین کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی چنانچہ ایک ماہر وکیل چودھری ظفر اقبال ورک کی خدمات حاصل کیں جو میرے ایک دیرینہ کرم فرما دسوندھی خاں آف موضع ورک کے فرزندِ ارجمند، اور میرے بہت اچھے دوست ہیں۔ قانونی تقاضوں کے مطابق میں ہر مقررہ تاریخ پر سرگودھا جا کر عدالت میں حاضر ہوتا رہا۔

چند پیشیوں کے بعد میرے وکیل نے محسوس کیا کہ عدالتی کارروائی خاصی سُست ہے لہٰذا باہم صلاح و مشورے سے طے ہوا کہ ہائی کورٹ میں رٹ دائر کر دی جائے۔ لہٰذا ہائی کورٹ کے سینئر ایڈووکیٹ محمد فاروق صاحب کے ذریعے ہائی کورٹ میں رِٹ دائر کر دی گئی جو جسٹس غلام محمد مرزا کی عدالت میں سماعت کے لئے لگی۔ وکلا کے دلائل سننے اور صرف چند پیشیوں کے بعد نہ صرف فیصلہ مقبول اکیڈمی کے حق میں ہوا بلکہ عدالت نے محکمہ تعلیم سرگودھا کے تمام افسران کو بے گناہ قرار دے کر باعزت بحال کر دیا۔ یہ ایک ناگہانی مصیبت تھی لیکن میرے اللہ نے مجھے عزت و آبرو سے نوازا اور مخالفین کے ناپاک ارادوں کو پامال کیا۔ مخالف سازشیوں کی مجھے اشاعتی منظر سے ''آوٹ'' کرنے کی مہم ناکام ہوئی۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ عزت اور ذلت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ان لوگوں نے جو بُری سے بُری چالیں میرے خلاف چلیں، اللہ تعالیٰ نے ان سب سے مجھے بچا لیا اور ان کی تمام سازشیں خاک میں مل گئیں۔ ان لوگوں کو مقبول اکیڈمی کی مخالفت کا جو بخار چڑھا ہوا تھا وہ تھوڑی ہی مدت میں اتر گیا۔ بعد میں ان مخالفین کے گروپ کے اتحاد کا شیرازہ بھی بکھر گیا۔ ان لوگوں میں سے صرف ایک شخص اشاعتی کاروبار میں کامیاب رہا ہے اور ان کا ادارہ بھی حیات ہے جبکہ باقی سب لوگوں کا کاروبار روبہ زوال ہے اور بعض اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو معاف فرمائے، اور درویش کی دُعا کیا ہے؟

چوہدری ظفر اقبال ورک اور چوہدری خضر اقبال ورک جو چوہدری دسوندھی خاں کے صاحبزادے ہیں یہ میرے محسن کے بیٹے ہیں، ان کے ساتھ میرے برادرانہ تعلقات قائم ہیں۔ ظفر اقبال ورک سے تو اتنی بے تکلفی ہے کہ وہ جب کبھی میرے پاس آتے ہیں تو فوراً ہی دکان

Marfat.com

کے کسی لڑکے کو قلاقند لانے کا آرڈر دے دیتے ہیں اور پھر آدھا کلو قلاقند چند لمحوں میں ہی ان کے شکم شریف میں چلی جاتی ہے۔ خضر اقبال ورک ایک بڑے ریٹائرڈ آفیسر اور سیاسی سوجھ بوجھ کے مالک ہیں۔ وہ اپنے والد صاحب کی طرح اپنے علاقے کے عوام کا بہت خیال رکھتے ہیں اور رفاہ عامہ کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ مجھے بھی کئی دفعہ "تبلیغ" کر چکے ہیں کہ اپنے گاؤں کی گلیاں پکی بنوادوں، مسجد میں پنکھے اور گاؤں میں پانی کے نلکے لگوادوں...... بہبود عامہ کے کاموں کی ایک لمبی فہرست ان کے پاس موجود رہتی ہے اور وہ ان کی تکمیل کے لئے وسائل تلاش کرتے رہتے ہیں۔ وہ دنیا کی بہبود کے کام انجام دے کر اپنی آخرت سنوار رہے ہیں۔

ایک ناکام کاروباری کوشش:

رسالہ "چودھویں صدی" کے زمانہ میں ہی اپنے ایک دوست مرغوب احمد فیاضی کے ساتھ مل کر میں نے بیڈن روڈ پر کرایہ کی دکان میں "بستان ادب" کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا۔ اور خواجہ احمد عباس کا ناول "چار دل چار راہیں" شائع کیا (بمبئی میں اس ناول پر فلم بھی بنی تھی)۔ ہم نے بازار سے کافی کتابیں خرید کر باقاعدہ ایک شوروم بنالیا تھا لیکن کاروبار نہ چل سکے۔

مولانا صلاح الدین احمد:

ملک کی عظیم ادبی شخصیت مولانا صلاح الدین احمد ایڈیٹر "ادبی دنیا" کا دفتر قریب ہی مال روڈ پر واقع تھا۔ مولانا "بستان ادب" پر اکثر تشریف لاتے اور دیر تک بیٹھ کر ہماری حوصلہ افزائی کرتے۔ کئی دفعہ مجھے ان کے دفتر میں بھی ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ وزیر آغا صاحب کا نیاز بھی ان کے دفتر میں ہی ہوا لیکن ان سے اشاعتی تعلق قائم نہ ہوسکا۔ ان کی کتابیں مولانا صلاح الدین احمد اپنے اشاعتی ادارے سے چھاپتے تھے اور ہمیں وہیں سے فروخت کے لئے مل جاتی تھیں۔

Marfat.com

Marfat.com

نظر بد دور

اللہ کی رحمت سے میرے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ تینوں ایم ، بی ، بی ، ایس ڈاکٹر ہیں۔ میری ایک بہو اور میرا داماد بھی ڈاکٹر ہے۔ کتنا دلچسپ اتفاق ہے کہ ایک معمولی تعلیم کے بندے کو اللہ تعالیٰ نے کتابوں کے کاروبار میں سرفراز فرمایا اور پھر میرا کنبہ ڈاکٹروں کا خاندان بن گیا ہے۔ بڑے بیٹے کی اہلیہ میری قریبی عزیزہ ہے۔ وہ بھی پڑھی لکھی ہے۔ میرے بچوں کی مادرِ محترم ان کے حق میں دعائیں کرنے کو سلامت ہے۔ کنبے کے سربراہ کی حیثیت میں راقم الحروف موجود ہے۔ میرا گھرانہ خوشحال بھی ہے اور سکھی بھی۔ ان عنایات کی فراوانی پر عجز وانکساری سے اللہ تعالیٰ کے سامنے سر جھکاتا ہوں اور سجدۂ شکر بجالاتا ہوں۔

میری تاریخ پیدائش 22 جنوری 1930ء ہے۔ اس وقت میری عمر 76 برس سے متجاوز ہے اللہ کے فضل وکرم سے گزشتہ 35 سال میں کبھی بیمار نہیں پڑا۔ جسم کے تمام کثافتی مادے اور پرانی بیماریوں کی آلائشیں میں نے لوئی کوہنی (مشہور جرمن قدرتی طریقۂ علاج کے ماہر) کے پانی کے غسلوں کے علاج سے اپنے جسم سے خارج کردی ہیں۔ اب اگر کبھی نزلہ زکام ہو جائے تو میں ایک آدھ غسل سے ہی اپنا علاج کر لیتا ہوں۔ میں نے کئی پونڈ وزن کم کر کے اپنے آپ کو ''سمارٹ'' بنالیا ہے۔ میرے جسم پر چربی اور موٹاپے کا بوجھ نہیں ہے اس لئے مجھے اب بھی سارا دن کام کرنے کے بعد تھکن نہیں ہوتی۔

بیرون لوہاری دروازہ سرکلر روڈ پر اپنے اس بنیادی ادارے ''مقبول اکیڈمی'' پر میں خود بیٹھتا ہوں۔ پریس کا نظم وضبط اور دفتری خانے کی نگرانی میری ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ پریس کے انتظام میں میرے دوست شیخ اعظم صاحب میرے معاون ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے پر بھرپور

Marfat.com

اعتماد ہے۔ کبھی ایک دوسرے سے شکایت نہیں ہوئی۔ مصنفین اوران کی کتب کی اشاعت کے تمام معاملات میں طے کرتا ہوں۔ دکانداروں، کتب خانوں اور لائبریریوں کو کتب کی فراہمی اور لین دین کا کام میرے ماموں زاد بھائی حاجی محمد سرور کی تحویل میں ہے اور وہ اس کام کو ذمہ داری سے نبھا رہے ہیں۔ ماشاءاللہ حاجی صاحب بڑے خوبصورت اور نیک انسان ہیں۔ وہ کسی کا دل نہیں دُکھاتے، کوئی افسر ہو یا چپڑاسی یا گاہک وہ سب کو خوش رکھتے ہیں۔

مجھے اپنے اس کاروبار میں دیرینہ دوست عبدالمجید ساگر اور شیخ محمد اعظم کا تعاون بھی برسوں سے حاصل ہے۔ میرے بچے بھی میرے ان تعلقات کو اہمیت دیتے ہیں اور ان کا احترام کرتے ہیں۔ اس عمر میں کھانے کی نسبت ادویات کا خرچ زیادہ ہوتا ہے لیکن میں نے جسٹس بی زیڈ کیکاؤس کی طرح پانی کے علاج سے ادویات کی ضرورت ہی ختم کر دی ہے۔ میں اپنے کاروبار سے حاصل ہونے والے فوائد کو اپنی کوشش سے اور اپنی سوچ کے تحت اپنی اولاد میں حسب ضرورت تقسیم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ خاندان میں کسی بچے یا بڑے کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ اگر خدانخواستہ گھر کا کوئی فرد کسی تکلیف میں مبتلا ہو ہی جائے تو میری بے کلی دیدنی ہوتی ہے۔ میں پریشان ہو جاتا ہوں اور کوئی بھی کام کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ جب تک وہ تندرست نہ ہو جائے میں اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے دُعائیں مانگتا رہتا ہوں۔

خورشید بیگم

مثل مشہور ہے کہ ہر کامیاب شخص کی پشت پر کسی خاتون کا ہاتھ ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ اچھی خاتون اپنے فرائضِ خانہ اس خوبی سے ادا کرتی ہے کہ وہ مرد کے لئے مسائل پیدا نہیں ہونے دیتی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میری پشت پر بھی میری اہلیہ کا ہاتھ ہے۔ الحمدللہ کہ وہ اب بھی میری غمگسار، مشیر، دوست اور سب کچھ ہے۔ میری عملی کشمکش اور جدوجہد کے کٹھن دور میں اس نے ہر قسم کی قربانی دے کر میری مشکلات کو آسان بنانے کی کوشش کی۔ تنگ دستی کے باوجود اس نے بچوں کی تعلیم و تربیت پر بھرپور توجہ دی۔ مجھے وہ وقت بھی یاد ہے جب میرے بچوں کے پاس

Marfat.com

کپڑوں کا صرف ایک آدھ جوڑا ہوتا تھا۔ میری بیوی روزانہ ان جوڑروں کو دھوتی، استری کرتی اور بچوں کو پہنا کر سکول بھیجتی۔ ہر نازک موقعے پر اس نے میرا ساتھ دیا، میری حمایت کی اور میری محنت کی تعریف کی۔ عورت ہو نے کے باوجود اس نے میرے دوش بدوش گھر کی چار دیواری میں ''مردانہ وار'' میری رفاقت نبھائی اور سدا مسکرائی اور اچھے دنوں کی آمد کی توقع سے سرشار رہی۔ میں اسے اکثر یاد دلاتا ہوں کہ وہ میرے گھر میں عزم و ہمت کا خورشید (اس کا نام ہی خورشید ہے) بن کر چمکتی رہی ہے۔

میری بیوی آہستہ بولنے کی عادی ہے۔ اسے چیخنا چلانا اور گڑ بڑا جانا آتا ہی نہیں۔ ہر وقت مصروف وہ کچھ نہ کچھ کرتی نظر آتی ہے۔ حوصلہ مند ہونے کے ساتھ عقل مند بھی ہے۔ کئی معاشرتی معاملات میں اس کے مشورے صائب نکلے۔

ڈاکٹر ظفر مقبول

ظفر مقبول میرا بڑا بیٹا ہے۔ اس نے گورنمنٹ سنٹرل ماڈل سکول سے میٹرک کا امتحان اتنے اچھے نمبر لے کر پاس کیا کہ اسے گورنمنٹ کالج لاہور میں (جواب گورنمنٹ کالج یونیورسٹی ہے) پری میڈیکل میں داخلہ مل گیا۔ ایف ایس سی بھی اس نے اعلیٰ نمبروں سے پاس کی کہ اسے میرٹ پر علامہ اقبال میڈیکل کالج میں داخل کر لیا گیا۔ اس نے ایم بی بی ایس کی ڈگری لے کر دکھی انسانیت کی خدمت کے لئے سرکاری ملازمت کرنے کی بجائے اپنا ذاتی کلینک کھول لیا لیکن کچھ عرصے کے بعد وہ لوگوں کے جسمانی علاج کی بجائے ان کے ذہنی اور روحانی علاج کی طرف راغب اور کتابوں کے اشاعتی کاروبار میں شامل ہو گیا۔ اس دکان پر اس کا بچپن گزرا تھا یہیں جوان ہوا تھا اس لئے اشاعتی کاروبار کے امور سمجھنے میں اس نے دیر نہ کی۔ اس کا ذہن بڑا تخلیقی ہے۔ وہ میرے ساتھ ''مقبول اکیڈمی'' سرکلر روڈ پر بیٹھنے لگا۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ اب زمانہ بہت بدل گیا ہے۔ ہر بات میں ندرت اور کمال کو فوقیت دی جا رہی ہے لہٰذا ہم بھی کتب کی ظاہری شکل اور صورت کو سنواریں، اچھی کتابت اور اعلیٰ طباعت کرائیں۔ آرائش کے لئے تصویریں

Marfat.com

شامل کریں۔اس کا یہ مشورہ بہت اچھا تھا اور یہ بے حد کامیاب ثابت ہوا۔کتاب کی معنوی خوبیوں کے ساتھ اس کی صوری خوبیوں پر ظفر مقبول نے بھرپور توجہ دی۔

ڈاکٹر ظفر مقبول بہت شریف اور دھیمے مزاج کا حامل ہے کہ وہ ہر کسی سے انکسار سے بات کرتا ہے۔اللہ نے اس کو ایک بیٹا اکبر مقبول اور ایک بیٹی عاصمہ مقبول عطا کی ہے۔یوں سمجھئے کہ وہ ''دو بچے خوشحال گھرانہ'' کی مثال ہے۔

ڈاکٹر ارشد مقبول

ارشد مقبول میرا چھوٹا بیٹا ہے۔اس نے بھی سنٹرل ماڈل سکول میں تعلیم پانے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور سے ایف ایس سی (پری میڈیکل) میں اعلیٰ نمبر حاصل کرنے کے بعد میرٹ پر میڈیکل کالج میں داخلہ حاصل کیا اور ایم بی بی ایس کرنے کے بعد عملی زندگی کا آغاز جنرل ہسپتال میں ملازمت سے کیا۔اس کی بیگم بھی ایم بی بی ایس ہے۔وہ بھی جنرل ہسپتال میں اس کے ساتھ ہی کام کرتی تھی لیکن صرف ڈیڑھ سال کے بعد ملازمت چھوڑ دی اور ارشد مقبول بھی میرے ساتھ اشاعتی کاروبار میں شامل ہو گیا۔

بچوں کی ''کلرڈ سٹوری بکس'' اور تاریخی کتب ''مقبول کلاسیک'' کا اجراء اور اشاعت ڈاکٹر ارشد مقبول کا کارنامہ ہے۔اس سلسلے میں اس نے مشاہیر اسلام پر باتصویر خوبصورت کتب شائع کی ہیں۔وہ ایک ماہر فوٹو گرافر ہونے کے علاوہ ایک اچھا آرٹسٹ بھی ہے۔ہماری متعدد کتابوں کے دیدہ زیب سرورق اس نے خود بنائے ہیں۔وہ دنیا بھر میں ہونے والے کتاب میلوں پر جاتا ہے اور طباعت میں جدید رجحانات کا مطالعہ کرتا ہے۔اس نے کئی کامیاب تجربات پبلشنگ کی صنعت میں کیے ہیں۔مقبول اکیڈمی نے بچوں کے لئے انوکھی اور بڑی تقطیع کی مصور ایسی کتب شائع کی ہیں جنہیں کسی بھی ملک کی بہترین کتابوں کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔ان کتابوں کے موضوعات میں تاریخی، ادبی، قصہ کہانی، مہم جوئی، تعمیر شخصیت، نفسیات، ملکی و غیر ملکی معاشرت وغیرہ سب شامل ہیں۔یہ سب ارشد مقبول کے شوقِ فراواں کا نتیجہ ہیں۔دوسری طرف اسے دین

Marfat.com

کی دولت بھی حاصل ہے۔ غیر ملکی دورے میں وہ سپین گیا تو غرناطہ میں اسے الحمرا کے پاس ایک مسجد میں امامت کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ مجھے اقبال کی شاعری سے ابتدا میں ہی گہری دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ سپین جانے کا اتفاق تو نہیں ہوا۔ لیکن میرا بیٹا جب سپین گیا تو مجھے اقبال کے یہ اشعار بہت یاد آئے۔

ہسپانیہ تو خونِ مسلماں کا امیں ہے
مانندِ حرم پاک ہے تو میری نظر میں
پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں
خاموش اذانیں ہیں تری بادِ سحر میں

ڈاکٹر ارشد کا گھر میں اپنے بچوں کے ساتھ دوستانہ، بے تکلفی اور ہنسی مذاق کا ماحول ہے...... ہمارے اکبر چوک والے سابقہ گھر میں مناسب شکل وصورت کی ایک عورت کام کرتی تھی، جس کا نام نسیم ہے۔ تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد راستے میں کہیں ڈاکٹر ارشد نے اسے دیکھا اور گھر آ کر بتایا کہ میں نے نسیم کو کسی جگہ دیکھا ہے۔ بچوں کے ساتھ گپ شپ کے دوران کسی بات پر ڈاکٹر ارشد نے یہ ڈائیلاگ بولا کہ "میں بھی انسان ہوں، میرے بھی کچھ جذبات ہیں" یہ سن کر اس کی چھوٹی بیٹی "ارم" نے فوراً کہا "لگتا ہے واقعی آج آپ نسیم سے مل کر آئے ہیں"۔

ڈاکٹر ارشد مقبول کو اللہ نے دو بیٹیاں (مدیحہ مقبول اور ارم مقبول) اور ایک بیٹا (بابر مقبول) عطا کیا ہے۔ ان کا گھرانہ بھی خوشحال اور پرسکون ہے۔

ابتدائی عمر میں، میں نے اپنے بچوں کی کڑی نگرانی کی ہے۔ چھوٹے بیٹے ارشد مقبول پر مجھے زیادہ توجہ دینی پڑی کیونکہ اس کا رجحان لڑکوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کی طرف زیادہ تھا۔ خطرہ تھا کہ غلط صحبت میں نہ پڑ جائے۔ میرے سامنے ہمیشہ یہ مقولہ رہا کہ

صحبت صالح تُرا صالح کند، صحبت طالح ترا طالح کند

خدا کا شکر ہے کہ وہ "بُرے" لوگوں کو چھوڑ گیا اور اپنے بڑے بھائی ظفر کی طرح خوب

Marfat.com

محنت کی اور اچھے نمبروں سے امتحانات پاس کئے۔اب اپنے کاروبار میں نمایاں کامیابیاں حاصل کر رہا ہے۔زندگی کے دوسرے صحت بخش مشاغل میں بھی بھرپور حصہ لے رہا ہے اور متعدد زاویوں سے اپنی کاروباری سرگرمیوں میں معروف ہے۔اپنے بیوی بچوں کو وقت دیتا ہے۔تاہم کھانے پینے میں احتیاط نہ برتنا اس کی کمزوری ہے۔اسے ورزش اور سیر سے کوئی دلچسپی نہیں۔میں اسے پہلے بھی سمجھاتا رہا ہوں اور اب بھی اسے حکماء کے اس قول کی طرف متوجہ کراتا ہوں کہ "جان ہے تو جہان ہے،،اور جان کے لئے جسمانی اور ذہنی صحت کی پرواہ کرنا ضروری ہے۔غالبؔ مرحوم بھی فرماتے ہیں۔

تنگدستی اگر نہ ہو غالب
تندرستی ہزار نعمت ہے

خدا نے اپنی رحمتوں سے میرے بچوں کو تنگدستی نہیں دی لیکن اپنے تن کو انہوں نے خود درست رکھنا ہے۔

پتے کی بات

صحت کے حوالے سے لکھی گئی دنیا بھر کی تمام کتابوں میں ورزش اور سیر کی تائید کی گئی ہے۔موٹاپا گلے میں بندر باندھ کر جسم کو اٹھائے اٹھائے پھرنے کے مترادف ہے۔میرے دوسرے بیٹے ظفر مقبول اور پوتے بابر مقبول کا بھی یہی حال ہے۔وہ بھی بدپرہیز ہیں۔ہماری صحت کی زبوں حالی اور موذی امراض کا سب سے بڑا سبب سہل پسندی اور آرام طلبی ہے،حرکت میں زندگی ہے صبح کی سیر اگر نہیں کر سکتے تو گھر میں ہی یوگا کی کچھ ورزش تو ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر شہنیلا مقبول

شہنیلا مقبول میری بیٹی ہے۔اس نے گورنمنٹ گرلز ہائی سکول سمن آباد سے میٹرک، گورنمنٹ گرلز کالج سے ایف ایس سی کرنے کے بعد علامہ اقبال میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کی ڈگری لی۔عملی زندگی کی ابتدا سرکاری ملازمت سے کی لیکن پھر اپنا کلینک کھول لیا۔شہنیلا شادی

Marfat.com

کے بعد ''شہنیلا وحید'' ہو کر اب روایتی اعتبار سے ''پرائی'' ہو چکی ہے لیکن میری جانِ جگر ہے۔ اس کی بیٹیاں ''بینا'' اور ''ماریہ'' مجھے ابا کہتی ہیں، وہ مجھے اپنی بیٹی شہنیلا سے بھی زیادہ پیاری لگتی ہیں۔ جب میں ان سے ملتا ہوں، تو مجھے پورا وقت دیتی ہیں۔ ڈاکٹر شہنیلا اپنی صحت کی پرواہ کیے بغیر اپنی بچیوں کی پڑھائی پر بھرپور توجہ دیتی ہے ان کو سکول چھوڑنے اور وہاں سے واپس گھر لانے کی پوری ڈیوٹی ادا کرتی ہے، گھر کے تمام کام کاج کے ساتھ کتابوں کے اپنے ذاتی کاروبار میں اپنے شوہر کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ صفائی اور سلیقہ مندی میں اپنی ماں سے بھی چار ہاتھ آگے ہی ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ماں کا رنگ بیٹی پر بہت چڑھتا ہے، خصوصاً جب وہ اکلوتی ہو۔ شہنیلا کی بڑی بیٹی، بینا نے اس سال 2006ء کے او (O) لیول کے امتحان میں پانچ ''اے A'' لے کر نمایاں پوزیشن حاصل کی ہے (ماشاءاللہ)۔

ڈاکٹر عبدالوحید

میری ڈاکٹر بیٹی شہنیلا کا شوہر میاں عبدالوحید بھی ڈاکٹر ہے۔ وہ گورنمنٹ سروس سے استعفےٰ دے کر اب مستقل طور پر مقبول بکس ماڈل ٹاؤن لنک روڈ پر کتابوں کے کاروبار میں بھرپور دلچسپی لے رہا ہے۔ عبدالوحید درویش طبع انسان ہے۔ کام کاج سے فارغ ہو جانے کے بعد سیدھا گھر آتا ہے۔ جب کلینک کرتا تھا تو کسی مریض سے پانچ روپے سے زیادہ فیس نہیں لیتا تھا۔ اس کی بے نیاز طبیعت کی یہ استغنا پسندی اب بھی قائم ہے۔ وہ دوکان پر آنے والے بچوں کے چہروں میں ان کی معاشی حالت پہچان جاتا ہے اور ان کو کتابوں کی خریداری میں معمول سے زیادہ رعایت کر دیتا ہے۔ وہ بزرگ خریداروں کی بہت پذیرائی کرتا ہے۔ خلیق اور ملنسار ہے۔ شستہ زبان اور بہترین اطوار کا مالک ہے۔

مول سے بیاج پیارا

میں اپنے پوتے پوتیوں اور نواسیوں سے بڑی محبت کرتا ہوں۔ پرانی کہاوت سچ ہی

Marfat.com

ہے کہ مول سے بیاج پیارا ہوتا ہے۔ میری محبت یک طرفہ نہیں ہے جیسا کہ عموماً ہوتا ہے۔ بچے بھی مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ میری نواسیاں بینا اور ماریہ تو علامہ اقبال کے اس شعر کی چلتی پھرتی تصاویر ہیں۔

جھپٹنا ، پلٹنا ، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

ماریہ چھوٹی ہے وہ اپنی بڑی بہن بینا پر جھپٹتی رہتی ہے۔ اس کے بال نوچتی اور کھینچتی ہے اور پھر اپنی ماں سے پھینٹی کھاتی ہے مگر اس کا پلٹنا اور جھپٹنا ختم نہیں ہوتا۔ معمولی سی بات پر ان کی جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ بینا بھی کوئی کم لڑاکی نہیں ہے مگر وہ بہن کے مقابلے میں قدم نہیں جما سکتی۔ ماریہ بہت چالاک ہے۔ ایک روز بینا نے ماریہ سے کہا کہ ابا سے کہتے ہیں کہ وہ ہمیں نیا کمپیوٹر لے دیں۔ ماریہ نے اس کی مخالفت کی کہ ابا سے کیوں کہیں، ہم کوئی بھکاری ہیں؟ ہم امی سے کہیں گے کہ وہ لے دیں۔

ماریہ ابھی چھوٹی سی تھی۔ تینوں ماں بیٹیاں ایک سڑک کے کنارے کنارے چل رہی تھیں، سڑک پر ایک کتا بیٹھا تھا اس نے بھونکنا شروع کر دیا۔ ماریہ نے اپنی ماں سے کہا۔ ''ممی! لگتا ہے کہ ہم کسی مصیبت میں پھنس گئے ہیں،، اس کے باوجود اس کے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ ڈرتی بہت کم ہے۔ دماغ پر بوجھ نہیں ڈالتی۔ بازار جائیں تو کوئی کپڑا پسند نہیں کرتی، کہتی ہے کہ جو بینا کو پسند ہے وہ ہی اسے پسند ہے۔

میں شطرنج کا اچھا کھلاڑی تھا، اب اس عمر میں میرے دوست میرے بچے ہی ہیں۔ میں کبھی کبھار اپنی پوتی ''مانو'' (مدیحہ) اور نواسی گوشی (بینا) سے شطرنج کی بازی لگاتا ہوں۔ ان کی حوصلہ افزائی اور خوشی کے لئے جان بوجھ کر ہار جاتا ہوں۔ ان کی خوشی دیدنی ہوتی ہے۔ کبھی کبھار وہ حقیقتاً جیت بھی جاتی ہیں اور میری شکست کا گھر بھر میں خوب چرچا کرتی ہیں۔ اپنے آپ پر فخر ان الفاظ میں کرتی ہیں کہ ہم نے دادا ابو کو (ابا کو) شکست دی۔ میری نواسی مجھے ''ابا'' کہتی ہے۔

Marfat.com

دونوں ہی اچھا کھیلتی ہیں لیکن میری پوتی ''مانو'' تو ماشاء اللہ خاصی ''شاطر'' ہوگئی ہے۔ اللہ اسے نظر بد سے بچائے۔ آمین

میں نے ایک زمانے میں ہسپتال قائم کرنے کا منصوبہ بھی بنایا تھا اور علامہ اقبال ٹاؤن میں گلشن پارک کے قریب ایک کنال اراضی بھی خرید لی تھی لیکن میرے بچے اس منصوبے کی تکمیل میں معاونت پر آمادہ نہ ہوئے۔ وجہ شاید یہ ہے کہ وہ کتابوں کے کام میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔

اپنے بیٹوں کی وسعت طبع دیکھ کر میں نے 1986ء میں ان کے لیے دیال سنگھ مینشن مال روڈ پر ایک دکان حاصل کی اور وہاں تو انہوں نے کمال کر دکھایا۔ ایسے لگتا تھا کہ یہ میڈیکل میں نہیں پڑھتے رہے بلکہ کتب کی تیاری، خرید و فروخت، آرائش اور فروختگی کی تعلیم یورپ کی کسی درسگاہ سے حاصل کرتے رہے ہیں۔ اس دکان کی آرائش و زیبائش اور اس میں رکھی جانے والی کتب کے انتخاب کے لیے میں نے اپنے بیٹے ظفر مقبول کے ساتھ 1988ء میں انگلستان کا سفر اختیار کیا جو ہمارے لئے تجرباتی اور معلوماتی لحاظ سے بہت سودمند ثابت ہوا۔ ہم نے اپنی مال روڈ کی نئی دکان کے لئے مختلف پبلشروں سے کتب خریدیں۔ پرانے دوستوں سے ملاقاتیں کیں اور کچھ نئے دوست بھی بنائے۔ یہاں دو دوستوں کا ذکر ضروری ہے۔

ڈار صاحب اور قریشی صاحب

سیالکوٹ کے رہنے والے اعجاز ڈار صاحب میرے اس دور کے دوست ہیں جب وہ یورپ جاتے اور آتے رہتے تھے۔ وہ بہت سی کتب پاکستانیوں کے لیے خرید کر لے جاتے تھے۔ اب وہ مانچسٹر میں مستقلاً قیام پذیر ہیں اور کتابوں کا ہی کاروبار کرتے ہیں۔ میں نے ان سے ملاقات کی اور ان کے طریقہ کار کا مطالعہ کیا۔ ڈار صاحب نے ایک ہوٹل میں ہماری پرتکلف دعوت کی، کھانے میں چنے کی دال کی ایک ڈش بھی شامل تھی جو اتنی لذیذ تھی کہ آج تک اتنی مزیدار دال کا ذائقہ بھول نہیں سکا۔ بریڈفورڈ میں میرے ایک دوست افتخار قریشی صاحب بھی ہیں۔ ان کا بھی وہاں کتابوں کا کاروبار ہے۔ وہ بھی سیالکوٹ کے رہنے والے ہیں۔ ان کے والد مرحوم کے ساتھ

Marfat.com

میرے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ان کی دکان کا نام بک سنٹر ہے۔ان سے بھی ملاقات رہی اور کافی معلومات حاصل ہوئیں۔موصوف نے بھی ہماری پُر تکلف دعوت فرمائی۔

مقبول بکس

اب میں عمر کے اس حصے میں، ہوں جہاں میرا کام صرف اکھاڑے کے باہر چار پائی پر بیٹھ کر اپنے بچوں کو کام کرتے اور کامیابیاں حاصل کرتے ہوئے دیکھنا ہے۔ اس وقت ''مقبول بکس'' ہمارے تجارتی تشخص کا نشان بن گیا ہے چنانچہ ''مقبول بکس'' کے نام سے میرے بچوں نے مختلف جگہوں پر کام شروع کر رکھا ہے۔ایک دکان ماڈل ٹاؤن لنک روڈ پر واقعہ ہے جس کا کنٹرول میرے داماد ڈاکٹر میاں عبدالوحید کے پاس ہے۔صدیق ٹریڈ سنٹر گلبرگ اور مین بلیوارڈ اقبال ٹاؤن میں بھی مقبول بکس کے نام سے دکانات واقع ہیں جو ڈاکٹر ارشد مقبول کے کنٹرول میں ہیں،، وحدت روڈ پر اس نام سے ایک کافی بڑی دکان تھی، جسے ڈاکٹر ظفر مقبول چلا رہا تھا لیکن بوجوہ یہ دکان بند کر دی گئی ہے۔ یہ دکان اب ایک بنک کو کرایہ پر دے دی گئی ہے۔دیال سنگھ مینشن مال روڈ پر مقبول اکیڈمی کے نام سے ایک اعلیٰ درجے کا شوروم قائم ہے جس کی نگرانی ڈاکٹر ارشد مقبول کے سپرد ہے۔

☆☆..........☆..........☆☆

Marfat.com

سفرِ سعادت

میں اپنے بچپن میں ایک نعت بڑے شوق سے سنتا تھا۔

"میرے مولا بلا لو مدینے مجھے"

اور پھر نعت خواں کے عقب میں لگی ہوئی دو تصویروں پر میری نظر دیر تک جمی رہتی، ایک تصویر مکہ معظمہ کی تھی، دوسری مدینہ منورہ کی تھی۔ جب بڑا ہوا تو یوں محسوس ہوا، یہ تصویریں میرے دل میں آویزاں ہیں اور حج کی خواہش روز افزوں ہے۔ لیکن حج کے لیے تو اللہ تعالیٰ کا بلاوا آتا ہے اور قسمت والے ہی حج کرتے ہیں۔ 1986ء میں حکومت نے حج کے لیے درخواستیں طلب کیں، تو میں نے بھی قسمت آزمائی کا ارادہ کر لیا، مسجد میں جا کر دو نفل نماز پڑھی حج کی درخواست ضابطے کے مطابق پر کی۔ قسمت کی یاوری دیکھیے کہ اللہ کے فضل و کرم سے قرعہ اندازی میں ہم دونوں میاں بیوی کامیاب ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے ہمیں مکے مدینے بلا لیا تھا۔ میں نے شکرانے کے نفل ادا کیے تو مسز بٹ صاحبہ تشریف لے آئیں، انہوں نے بھی ہمارے ساتھ ہی درخواست دی تھی، خوشی ان کے چہرے سے ٹپک رہی تھی۔ میری بیوی سمجھ گئی کہ ان کی حج کی درخواست منظور ہو گئی ہے۔ ہم نے انہیں اور انہوں نے ہمیں مبارکباد دی کہ ہم سب کامیاب افراد کی فہرست میں شامل تھے۔ مسز بٹ صاحبہ کی کامیابی کی خوشی میری بیوی کو بہت زیادہ ہوئی، کیونکہ ان کے ساتھ ہمارے گہرے مخلصانہ اور خاندانی تعلقات تھے۔ اب حج کی سعادت بھی ہمیں اکٹھے مل رہی تھی۔ ہم نے اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا۔ روانگی کی مقررہ تاریخ پر گھر سے غسل کیا، حج کی کامیابی کے لیے دعائیں کیں۔

Marfat.com

لاہور ائیر پورٹ پر پہنچ کر امیگریشن اور دیگر امور سے فراغت کے بعد ہدایات کے مطابق وضو کیا اور احرام باندھ کر دو نفل پڑھے اور عمرے کی نیت کی۔ ''اے اللہ میں عمرہ کی نیت کرتا ہوں، میرے لیے اسے آسان کر دے اور قبول فرمالے۔'' اس کے بعد تلبیہ

لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ ۔ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ ۔

اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ ۔ لَا شَرِيْكَ لَكَ ۔

تین مرتبہ پڑھا۔ اب ہم انتظار کرنے لگے کہ جہاز پر چڑھنے کا اعلان کب ہوتا ہے۔ لاؤنج میں ہر طرف سے عازمینِ حج نظر آرہے تھے، لاہور ائیر پورٹ کی پوری فضا مقدس محسوس ہو رہی تھی، جہاز پر چڑھنے کا اعلان ہوا تو ایک بزرگ نے قیادت سنبھال لی۔ وہ آگے آگے تلبیہ پڑھ رہے تھے، ہم ان کے پیچھے چل رہے تھے اور اونچی آواز میں تلبیہ پڑھ رہے تھے۔

لاہور سے جدہ تقریباً ساڑھے پانچ گھنٹے کا سفر ہے، جدہ ائیر پورٹ پر پہنچ کر سامان وصول کرنے کے بعد سارے مسافر قریب ہی حاجی کیمپ میں جمع ہوئے اور کسٹم و امیگریشن کی چیکنگ کے بعد ہمیں بسوں پر بٹھا کر مکہ لے جایا گیا۔ مکہ پہنچ کر معلم کا کارندہ حاجیوں کے پاسپورٹ چیک کر رہا تھا۔ ایک حاجی سے اس نے پوچھا کہ تمہاری بیوی کا کیا نام ہے، اس نے جواب دیا ''بیوی'' کارندے نے دو تین دفعہ پوچھا تو اس نے یہی جواب دیا۔ تنگ آکر اس کارندے نے غصے سے اس کا پاسپورٹ طلب کیا تو پاسپورٹ دیکھ کر ہنس دیا کیونکہ اس کی بیوی کا نام ہی ''بیوی'' تھا۔

مکہ میں جس بلڈنگ میں ہماری رہائش کا انتظام تھا، وہاں اپنا سامان رکھ کر ہم عمرہ کی ادائیگی کے لیے معلم کے کارندے کی راہنمائی میں حرم شریف چلے گئے۔ یہ یاد نہیں رہا کہ ہم کس دروازے سے داخل ہوئے، لیکن مجھے یہ یاد ہے کہ خانہ کعبہ پر پہلی نگاہ پڑتے ہی میرے جسم پر کپکپی طاری ہوگئی۔ کعبے کی ہیبت جسم و جاں پر طاری تھی پھر مجھے یاد آیا کہ خانہ کعبہ کو دیکھتے ہی جو دُعا کی

Marfat.com

جائے وہ قبول ہوتی ہے۔ دعا کے لیے ہاتھ اُٹھالیے اس وقت میرے ہاتھ کانپ رہے تھے اور زبان بھی ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ لیکن یہ بھی احساس تھا کہ میں اپنے اللہ کے حضور پیش ہوں اور اپنی زندگی کے اعمال نامے پر شرمسار بھی ہوں۔ اسی کیفیت میں ٹوٹے پھوٹے الفاظ زبان پر اُترنے لگے، میں نے سب سے پہلے اپنے وطن پاکستان کے تحفظ اور ترقی کے لیے دعا کی، پھر اپنے اہل وطن کی سلامتی کی دعا کی اور سب سے آخر میں اپنے والدین اور خاندان کے علاوہ اپنے ادارہ مقبول اکیڈمی کے ساتھ تعاون کرنے والے مصنفین کی زندگی اور صحت کی دُعا کی۔ دُعا کرتے کرتے میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور لب پر صرف یہ الفاظ تھے کہ ''میرے اللہ میری دُعا قبول فرما۔''

دُعا سے فارغ ہو کر تلبیہ پڑھتے ہوئے آرزوؤں اور اُمیدوں کے مرکز خانہ کعبہ کی طرف آئے، بیت اللہ پہنچ کر تلبیہ بند کر دیا۔ احرام کی چادر کو دائیں بغل کے نیچے سے نکال کر بائیں کندھے پر ڈال لیا، گویا دایاں کندھا ننگا ہو گیا، یوں اضطباع کی حالت میں حجر اسود کے سامنے سیاہ لکیر پر پاؤں رکھے اور طواف کی نیت کی۔ ''اے اللہ میں تیرے مقدس گھر کے طواف کی نیت کرتا ہوں، میرے لیے اسے آسان فرما دے اور قبول فرمالے'' اس کے بعد

بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ

کہہ کر حجر اسود کو بوسہ دیا۔ میں نے سُن رکھا تھا کہ حج کے دنوں میں حرم شریف میں طواف کرنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ حجر اسود کو بوسہ دینا ممکن ہی نہیں ہوتا اور صرف دور سے اشاروں پر ہی اکتفا کرنا پڑتا ہے، یہ میری خوش قسمتی تھی کہ جب میں معینہ مقام پر پہنچا تو پیچھے سے ہجوم کے ریلے نے مجھے دھکا دیا اور حجر اسود کے ساتھ جا ٹکرایا اور مجھے بوسہ کا موقعہ خود بخود مل گیا۔ اس کے ساتھ ہی طواف شروع ہو گیا۔ پہلے تین شوط (چکر) اضطباع اور رمل کے ساتھ کئے باقی چار چکر عام چال سے چلے۔ رکن یمانی سے حجر اسود تک

Marfat.com

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ہ

دُعا پڑھنے کا حکم ہے۔ علاوہ ازیں درود شریف اور مختلف دُعائیں جو یاد کی تھیں وہ پڑھتے رہے۔ سات چکر مکمل کرنے پر ایک بار پھر حجر اسود کی طرف ہاتھ اُٹھا کر استلام کیا اور ملتزم کی طرف آئے لیکن وہاں حجاج کا رش بہت تھا۔ اس لیے کوشش کے باوجود وہاں کھڑے ہو کر دُعا نہ مانگ سکے، لہٰذا دُور کھڑے ہو کر منہ ملتزم کی طرف کر کے دُعا مانگ لی، یہاں بھی میں نے پہلے پاکستان کی سلامتی اور ترقی کی دُعا کی، اس کے بعد اپنے والدین اور دیگر افرادِ خانہ کے علاوہ جتنے دوستوں کے نام یاد آ گئے، سب کے لیے دُعا کی۔ اپنی گنہگاری کا اعتراف کیا اور ربِّ کعبہ سے معافی مانگی، لیکن ندامت کا احساس بھی تھا۔ جو غالب نے دل میں محسوس کیا تو یہ شعر کہا تھا:

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

لیکن یہ گنہگار بندہ ربِّ کعبہ کے حضور میں پہنچ چکا تھا اور اپنی قسمت پر فخر کر رہا تھا۔ دُعا سے فارغ ہو کر مقامِ ابراہیم کے پاس آ کر دو رکعت نماز واجب طواف ادا کی اور نیچے اتر کر کنویں پر تین سانسوں میں پیٹ بھر کر آبِ زم زم پیا۔ اب میرا شوق فراواں مجھے صفاء کی طرف لے جا رہا تھا، جہاں پہنچ کر میں نے سعی کی نیت کی اور صفا مردہ کے سات چکر مکمل کیے، سعی سے فارغ ہو کر میں نے پہلے اپنی بیوی ''خورشید'' کی چوٹی کے بال ایک پور کے برابر خود کاٹے۔ اس دوران صبح کی نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ خانہ کعبہ کے بلند مینار سے صبح کی اذان بلند ہو رہی تھی، اس لیے ہم حرم شریف میں ہی رُک گئے اور صبح کی پہلی نماز امامِ کعبہ کی قیادت میں ادا کی اور حرم شریف سے نکل کر میں نے حجام سے اپنے سر کے بال کٹوائے، اب عمرہ کے تمام واجبات مکمل ہو چکے تھے لہٰذا اپنی

Marfat.com

بلڈنگ میں آ کر احرام اُتار کر سادہ کپڑے پہن لیے۔

رہائش کے لیے جو کمرہ ہمیں الاٹ ہوا تھا، اس میں آٹھ دس فوم کے گدے بچھے ہوئے تھے، ہر حاجی کے لیے ایک گدہ تھا اور تمام گدے ساتھ ساتھ ملے ہوئے تھے، کہیں کہیں تقریباً ڈیڑھ فٹ جگہ سامان رکھنے کے لیے بھی تھی۔ غسل خانہ دو تین کمروں کا مشترکہ تھا، اس تمام ماحول کو دیکھ کر میرے تو اعصاب شکستہ ہونے لگے، اس کمرے کے ساتھی ہمارے لیے اجنبی تھے مسز بٹ صاحبہ سے مشورہ کے بعد ہم نے رہائش کے لیے اپنا الگ انتظام کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت لاہور کے ایک بزرگ اپنی اہلیہ کے ساتھ اسی کمرے میں موجود تھے، وہ بھی ہماری طرح پریشان تھے۔ ہمارے اس فیصلے پر کہ ہم رہائش کا اپنا انتظام خود کر رہے ہیں، وہ بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گئے۔ ہم کمرے سے نکل کر نیچے بازار میں آئے اور کچھ لوگوں سے کرائے کی رہائش کے بارے میں پوچھا تو ہمیں بتایا گیا کہ محلّہ مسفلہ میں مناسب رہائش گاہ مل سکتی ہے، ہم نے محلّہ مسفلہ میں ایک عمارت کی پہلی منزل میں ایک کمرہ دیکھا جو کافی کشادہ تھا اس کا غسل خانہ صاف ستھرا اور جدید تھا۔ ساتھ ہی چھوٹا سا صحن بھی تھا، جہاں ہمیں گھر جیسا ماحول نظر آیا۔ لہٰذا سرکاری کمرے سے سامان اُٹھا کر ہم کرائے کے اس مکان میں منتقل ہو گئے۔ اس مکان کی بڑی خوبی یہ تھی کہ حرم شریف کے قریب تھا۔ ہم اذان کی آواز سن کر حرم شریف میں پہنچ جاتے اور باجماعت نماز ادا کرنے کے بعد روزانہ بہت سے طواف بھی کر لیتے۔ دراصل حرم شریف کا ماحول اتنا مقدس، دلفریب اور روح پرور ہے کہ خواہ مخواہ آدمی کا دل چاہتا ہے کہ میں طواف کرتا رہوں اور بیٹھ کر بیت اللہ کو دیکھتا رہوں۔

اس دوران ہم نے جنت المعلیٰ میں حاضری دی، حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہ اور دیگر بزرگوں کے مزارات پر فاتحہ خوانی کی۔ اس وقت جنت المعلیٰ میں مزارات قائم تھے۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہ کے مزار کے نقوش تو آج بھی میرے ذہن پر نقش ہیں۔

اب حج کا وقت قریب آ رہا تھا، اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے دل تڑپ رہا تھا اور

Marfat.com

نمازوں میں ایک خاص کیفیت پیدا ہو گئی تھی، جسے میں اب بھی محسوس تو کر سکتا ہوں، لیکن بیان نہیں کر سکتا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں کبھی پہنچوں گا، لیکن اب میں کعبۃ اللہ کی عظمت و جلال میں ہر وقت حاضر تھا۔

آخر 8 ذی الحجہ کا دن آ گیا۔ صبح اُٹھ کر غسل کیا، فجر کی نماز سے فارغ ہو کر احرام باندھا اور حج کی نیت کی ''اے اللہ میں حج کی نیت کرتا ہوں، اس کو میرے لیے آسان فرما، میرے حج کو قبول کر اور اسے میرے لیے دُنیا و آخرت میں خیر و برکت کا وسیلہ بنا۔'' اس کے بعد تلبیہ اور درود شریف پڑھتے ہوئے منیٰ کی طرف روانہ ہوئے۔ مناسک حج کے مطابق آج ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور 9 ذی الحجہ کی صبح کی نمازیں منیٰ میں ادا کیں۔ ان نمازوں کے دوران مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میرا قلب ذکر الٰہی میں مصروف ہے۔ آسمان سے سکون و قرار کی بوندیں میرے بدن پر گر رہی ہیں اور جیسے میرے گناہ دُھلتے جاتے ہیں۔

رات منیٰ میں بسر کی اور 9 ذی الحجہ کو نماز فجر کے بعد سورج نکلنے پر عرفات کو روانہ ہوئے۔ یہ سفر بھی عجیب صبر و تحمل کا سفر تھا، لاکھوں لوگ مکہ سے منیٰ اور منیٰ سے عرفات کی طرف کاروں، بسوں اور ویگنوں میں سفر کر رہے تھے، لوگوں کا تانتا بندھا ہوا تھا لیکن رفتار چیونٹی کی رفتار سے بھی کم تھی، بہت سے لوگ پیدل جا رہے تھے اور ہم انہیں اپنی گاڑی میں بیٹھے رشک سے دیکھ رہے تھے، کہ وہ متحرک تھے جبکہ ہمارے آگے گاڑیوں کی قطار رکی کھڑی تھی، جن لوگوں نے پہلے حج کیا ہوا تھا، انہوں نے ہمیں بتایا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں، سب لوگ میدان عرفات میں معینہ وقت پر پہنچ جائیں گے اور مناسک حج قلبی سکون سے ادا کر سکیں گے۔ خوش قسمتی سے میدان عرفات میں ہمیں مسجد نمرہ کے قریب ہی جگہ مل گئی، زوال کے بعد امام کے پیچھے ظہر اور عصر کی نماز با جماعت ادا کی۔ اپنے خیمہ میں واپس آئے تو معلم کے کارندوں نے سب حاجیوں کو کھانا تقسیم کیا۔ میدان عرفات میں ہر طرف خیمے ہی خیمے نظر آتے تھے۔ یہ دنیا کا عظیم ترین اجتماع تھا جس میں دنیا کے کونے کونے سے ہر رنگ اور نسل کے لوگ جمع تھے اور سب ذکر الٰہی میں

Marfat.com

مصروف تھے۔ایسا روح پرور منظر میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ بے شمار لوگ صحرا میں اپنے خیموں کے باہر چھتریاں سر پر تانے دُعائیں مانگ رہے تھے۔ مجھ پر کئی مرتبہ رقت طاری ہوگئی اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ آخر شام قریب آگئی اور سورج غروب ہوا تو گاڑیاں مزدلفہ کے لیے روانہ ہوئیں۔ بے شمار لوگ پا پیادہ ہی تھے اور مل کر تلبیہ پکار رہے تھے۔ ہم اپنی گاڑی میں ان کے ساتھ ہی تلبیہ پڑھ رہے تھے اور خدائی عظمت و جبروت پر لبیک کہہ رہے تھے۔

مزدلفہ میں پہنچ کر کھلے آسمان کے نیچے تاروں کی چھاؤں میں ایک کھلی جگہ ہمیں مل گئی۔ یہاں دری بچھا کر اپنا چھوٹا سا بیگ رکھا اور مغرب اور عشاء دونوں نمازیں ملا کر ادا کیں۔ نمازیں ادا کرنے کے بعد چائے کی طلب ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ مختلف جگہوں پر کچھ لوگ چائے کی بڑی بڑی کیتلیاں رکھ کر بیٹھے تھے اور حاجی ان سے چائے لے کر پی رہے تھے۔ میں نے ایک دکاندار سے چائے طلب کی اور پانچوں انگلیاں دکھا کر پیالوں کی تعداد بتائی۔ چائے بڑی لذیذ محسوس ہوئی اور اس نے ہمیں تازہ دم کر دیا۔ اس کے بعد ہم نے شیطانوں کو مارنے کے لیے کنکریاں تلاش کر لیں اور پانچ تھیلیوں میں الگ الگ رکھ لیں۔ اب کھلے آسمان کے نیچے سونا تھا لیکن صبح جلدی اٹھ گئے۔ فجر کی نماز پڑھ کر تھوڑی دیر وقوف کیا اور پھر پیدل ہی منیٰ کو روانہ ہو گئے اور وادی محسر (جہاں اصحاب فیل ہلاک ہوئے تھے) سے تیزی سے گزر کر منیٰ میں پہنچ گئے۔

آج صرف بڑے شیطان کو کنکریاں مارنی تھیں، حجاج کا ہجوم بہت زیادہ تھا اور بے نظم تھا۔ وہاں قطار میں چلنے کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ پل پر سے گزرتے ہوئے میں حبشیوں کے ایک ریلے کی زد میں آگیا اور زمین پر گر گیا لیکن اللہ کے فضل و کرم سے بچ گیا۔ خدا کا شکر ادا کیا پھر کنکریاں ماریں۔ فریضہ حج بخیر و خوبی ادا ہو گیا۔ اب سنت ابراہیمی کے مطابق قربانی کرنی تھی، جس کے لیے ہم نے رقم پہلے ہی جمع کروا دی تھی۔ لہٰذا بال کٹوا کر احرام کھول دیئے۔ روزمرہ کا لباس پہن کر طواف زیارت کے لیے مکہ چلے گئے۔ ہمارے پہلے طواف میں حاجیوں کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی تھی، اس لیے ہم بیت اللہ کے قریب ترین طواف کر لیتے تھے لیکن آج ہجوم بے پناہ تھا

Marfat.com

اس لیے برآمدوں کے ساتھ طواف کرنے کا موقعہ ملا۔ اس میں کافی وقت لگا۔ طواف زیارت اور صفاء ومروہ کے درمیان سعی کر کے ہم واپس منیٰ آ گئے۔ گیارہ اور بارہ ذی الحجہ کو تینوں شیطانوں کو کنکریاں مار کر مکہ میں اپنی قیام گاہ پر آ گئے۔ اس کے بعد طواف وداع کیا اور دل کھول کر اپنے لیے، اپنے والدین کے لیے اپنے عزیز وقارب اور دوستوں کے لیے اور ملک وقوم کے لیے دُعائیں مانگیں اور حج کی سعادت اور خوش نصیبی پر اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔

بَلَغَ العُلیٰ بِکَمَالِہٖ
کَشَفَ الدُّجیٰ بِجَمَالِہٖ
حَسُنَتْ جَمِیْعُ خِصَالِہٖ
صَلُّوْا عَلَیْہِ وَآلِہٖ

Marfat.com

دربارِ نبی ﷺ میں حاضری

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

میرا دل مکہ معظمہ میں ہر وقت یاد کراتا کہ اے اللہ کے گنہگار بندے تجھے اذنِ حضوری نبی اکرم ﷺ نے عطا کیا ہے۔ حج کا فریضہ ادا کرنے کے بعد دل گنبد خضرا کی زیارت کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ آخر وہ دن آ گیا کہ ہم مدینہ منورہ کی جانب روانہ تھے۔ میرا یہ سفر بڑا جذباتی تھا۔ میں اپنی زندگی کے مقدس ترین سفر کی تکمیل کر رہا تھا راستہ بھر درود سلام پڑھتا رہا اور مدینہ منورہ کی تصویر جو میں نے پاکستان میں دیکھی تھی اپنے دل کی آنکھوں کے سامنے لاتا رہا۔ آخر ہم مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ دور سے نظر گنبد خضرا پر پڑی تو میں نے سلام حضوری پیش کیا درود پڑھا اور آ کر سامان اپنی رہائش گاہ پاکستانی ہاؤس میں رکھا۔ غسل کیا کپڑے تبدیل کئے اور مسجد نبوی ﷺ میں داخل ہو کر پہلے تحیۃ المسجد کی دو رکعت پڑھیں اور روضۂ اقدس ﷺ کے پاس حاضر ہو کر نہایت خاموشی اور ادب واحترام کے ساتھ سلام عرض کیا۔

آپ ﷺ پر لاکھوں درود اور کروڑوں سلام ہوں۔

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

ذرا دائیں طرف ہٹ کر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور پھر حضرت عمر فاروق

Marfat.com

رضی اللہ عنہ کو سلام پیش کیا۔

اس وقت خواتین کے لیے زیارت اور نماز کا الگ الگ جگہ کا انتظام نہ تھا۔ لہٰذا خواتین وحضرات اکٹھے ہی مسجد میں عبادت کرتے تھے۔

مسجد نبوی ﷺ کے مشرق کی جانب جہاں آج کل بڑی بڑی بلڈنگیں کھڑی ہیں وہاں اس وقت بازار تھا اور بازار کے جنوب کی طرف ''باتھ روم'' بنے ہوئے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دکاندار کے پاس ایک صاحب کھجوریں خرید رہے تھے، میں بھی وہاں کھڑا ہو گیا۔ وہ صاحب کھجوریں لے کر چلے گئے تو میں نے اس دکاندار سے کھجوریں طلب کیں۔ دکاندار کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور اس نے پہلے والے خریدار کی نسبت مجھے کافی زیادہ ریٹ بتائے اور شاید پاکستانی سمجھ کر نفرت کا اظہار کیا۔ مجھے اچانک محسوس ہوا کہ غصہ میرے دل میں ابل رہا ہے لیکن پھر فوراً خیال آیا کہ میں مدینۃ النبی ﷺ میں کھڑا ہوں۔ یہ دکاندار اگر پاکستانیوں کے ساتھ مناسب سلوک نہیں کر رہا تو اے مقبول احمد تو صبر کر، تحمل کر اور اس حریص دکاندار کو اس کے حال پر چھوڑ دے۔ یہ خیال آتے ہی میرا غصہ ختم ہو گیا۔ لیکن میں نے اس دکاندار سے کھجوریں نہ خریدیں۔

مسجد نبوی ﷺ کے جنوب مشرق کی طرف کافی بازار تھے۔ جن میں پاکستانیوں کے ہوٹل بھی تھے جہاں حلوہ پوری کے علاوہ ہر قسم کے پاکستانی کھانے دستیاب تھے۔ چائے کا کپ، جوس اور سیون اَپ وغیرہ کی قیمت ایک ریال تھی، جو آج بیس سال کے بعد بھی وہی ایک ریال ہے۔

مدینہ منورہ میں ہم نے چالیس نمازیں ادا کرنی تھیں، گویا اس مقدس شہر میں ہمارا کم از کم قیام آٹھ دن کا ضرور تھا۔ لہٰذا ہم نے حصول ثواب کے لیے ریاض الجنہ میں جگہ بدل بدل کر نوافل ادا کیے۔ مسجد قباء جہاں دو رکعت نماز پڑھنے کا ثواب عمرہ کے برابر ہے، بار بار حاضری دی اور نوافل ادا کیے۔ مسجد قبلتین جس میں تحویل قبلہ کا حکم ہوا تھا اور جبل احد جہاں کفار کے ساتھ صبر آزما جنگ ہوئی تھی اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ سمیت ستر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین شہید

Marfat.com

ہوئے، وہاں بھی حاضری دی اور فاتحہ خوانی کی۔ جنت البقیع جس میں اہل بیت کے علاوہ بہت سے آئمہ کرام اور بزرگ ہستیاں آرام فرما ہیں، وہاں ہم سب نے فاتحہ خوانی کی اور مساجد خمسہ میں بھی ہر مسجد میں جا کر نفل پڑھے۔

مسجد نبوی ﷺ میں ہم نے چالیس نمازیں پڑھ لیں، روضۂ اقدس پر آخری بار حاضری دی، سلام عرض کیا اور دل گرفتگی کے عالم میں باہر نکلے۔ واپسی کی مقررہ تاریخ پر مدینہ ایئر پورٹ سے اپنی کنفرم فلائٹ پر ہم واپس وطن روانہ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے اتنی بڑی نعمت اور سعادت سے بہرہ مند فرمایا۔۔۔۔ (الحمدللہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے کہ "بار بار حج اور عمرے کرو، یہ فقر اور گناہوں کو اس طرح دور کرتے ہیں جیسے بھٹی سونے چاندی کے میل کو" لیکن یہ سعادت اس وقت تک نصیب نہیں ہوتی جب تک خدائے بخشندہ عطا نہ کرے۔ حج تو زندگی میں ایک بار ہی فرض ہے، لیکن جو شخص ایک دفعہ وہاں سے ہو آئے، بار بار وہاں جانے کے لیے اس کا دل مچلتا رہتا ہے، دراصل نماز پڑھنے اور عبادت کا وہاں ایک خاص لطف اور سرور ہے اور پھر وہ دلفریب اور روحانیت افروز مناظر، کہ انسان پر ایک کیف طاری ہو جاتا ہے۔

2002ء میں مجھے دوسری دفعہ سپانسر شپ سکیم کے تحت اپنی اہلیہ کے ہمراہ حج کی سعادت نصیب ہوئی۔ قربانی کے لیے مقررہ رقم ہم نے بنک میں جمع کروا دی اور ضرورت سے زیادہ نقدی مدرسہ صولتیہ میں امانت رکھوا دی، سولہ برس کے بعد حج کے واقعات اور معمولات قریباً وہی تھے جن کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں، البتہ دوسرے حج کے دوران ہمیں کچھ اچھے ساتھی مل گئے، ان میں محمد یونس صاحب خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے انتہائی شریفانہ رویے اور نیک کردار نے ہمیں بہت متاثر کیا اور ابتدائی معمولی شناسائی مستقل دوستی میں بدل گئی۔ عبدالحکیم خاں اور ان کی اہلیہ "سارہ" سے تو گھریلو تعلقات قائم ہو گئے جو حج سے واپسی پر مضبوط ہوتے چلے گئے۔ اب

Marfat.com

ایسا لگتا ہے، جیسے ہم قریبی رشتہ دار ہوں، سارہ اکثر کوئی مزیدار کھانا پکا کر ہمارے گھر لے آتی ہے اور سب اکٹھے بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ عبدالحکیم خاں صوابی (سرحد) کے رہنے والے ہیں، ایک بہت بڑے بین الاقوامی ادارے کے لاہور آفس کے انچارج ہیں۔ چپل کباب کے بہت شوقین ہیں اور بڑی فراوانی سے کھاتے ہیں۔ اس شوق کی وجہ سے ہی انہیں دل کی تکلیف ہوگئی، لیکن خدا کا شکر ہے کہ اب ٹھیک ہیں، تاہم دوائیاں مسلسل کھاتے رہتے ہیں اور چپل کباب سے مکمل پرہیز ہے۔ دوستوں اور عزیزوں کے بچوں سے بہت زیادہ پیار کرتے ہیں لیکن خود اس نعمت کے لیے امید لگائے بیٹھے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو اس نعمت سے بہرہ مند فرمائے۔ (آمین)

یہاں یہ عرض کرنا بھی مناسب ہے کہ جس ''حج عمرہ سروسز'' کے ذریعے ہم 2002ء میں حج کے لیے گئے تھے، اس نجی ادارے نے ہمیں حرم شریف سے کافی دور ''عزیزیہ'' میں ٹھہرایا تھا۔ ہم سے الگ الگ بھاری رقمیں وصول کی تھیں، لیکن مکہ معظمہ جا کر سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا اور خاصی بدسلوکی کا مظاہرہ کیا۔ کئی لوگوں کو تو کمروں میں جگہ نہ ملی اور وہ مارے مارے پھرتے رہے لیکن حج ایجنٹ کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔

یہ لوگ حج و عمرہ کے اشتہارات میں حاجیوں کی خدمت کا بہت دعویٰ کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے حج کو دکانداری بنالیا ہے اور وہ صرف اپنے پیٹ کی خدمت ہی کرتے ہیں۔

''عزیزیہ'' کی جس بلڈنگ میں حاجیوں کی رہائش تھی، وہاں عورتوں اور مردوں کا الگ الگ کمروں میں انتظام تھا۔ ایک روز میں باہر جانے کے لیے کمرے سے نکلا تو یونس صاحب کی بیگم نے میری اہلیہ خورشید سے کہا کہ وہ دیکھو دولہا میاں آرہے ہیں۔ یہ دلکش بات سن کر میرا دل باغ باغ ہوگیا اور بیگم یونس کے لیے دل سے دُعا نکلی جس نے میری شادی کے دن کی تجدید کردی تھی۔ مجھے اپنا بڑھاپا بھی عزیز محسوس ہوا کہ اس عمر میں بھی مجھے کوئی دولہا کہہ رہا تھا۔

اس دوسرے حج کے دوران ہم ٹیکسی لے کر جنت المعلیٰ فاتحہ خوانی کے لیے گئے تو وہاں

Marfat.com

کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ سب قبروں کا نام ونشان مٹا دیا گیا۔ سامنے صرف ایک چٹیل میدان تھا۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی، سعودی حکومت نہ جانے کیوں بزرگوں کے سارے نشانات مٹاتی جا رہی تھی۔

حج اور عمرے کا بلاوا مکے اور مدینے کی طرف سے آتا ہے اور یہ قسمت والوں ہی کو ملتا ہے، میری خوش قسمتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نہایت فضل وکرم سے پچھلے بیس اکیس سالوں میں مجھے اور میری بیوی کو بہت دفعہ مکے مدینے میں حاضر ہونے کی سعادت عطا فرمائی۔

2006ء میں جب مجھے حج کا بلاوا آیا۔ تو اس بار میری بیگم گھٹنے کی تکلیف کی وجہ سے میرے ساتھ نہ جا سکی۔ انٹرنیشنل پاسپورٹ کے ذریعے ویزے وغیرہ کا سارا انتظام میرے ایک بزرگ دوست چوہدری نوید منظور نے کیا اور انہیں کے ساتھ ہی میں حج کے سفر پر روانہ ہوا اور حج کے سارے مناسک بھی ان کی ہمراہی میں ادا کیے۔ چوہدری صاحب بہت اچھے اور نیک انسان ہیں اُنہوں نے اس دوران میرا بہت خیال رکھا، اللہ انہیں خوش رکھے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ”رمضان مبارک کے ایک عمرہ کا حج کے برابر ثواب ہے“ ایک روایت کے مطابق آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ”رمضان میں عمرہ کرنا میرے ساتھ حج کرنے کے برابر ہے“ اللہ کے فضل وکرم سے دو تین دفعہ رمضان مبارک میں ہمیں یہ سعادت بھی نصیب ہوئی ہے۔

رمضان شریف میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں بڑا روح پرور اور ایمان افروز ماحول ہوتا ہے۔ افطاری کے وقت دستر خوان لگ جاتے ہیں، انواع واقسام کے کھانے اور مشروبات پیش کیے جاتے ہیں اور لوگ منتوں اور کوششوں کے ساتھ روزہ داروں کو اپنے ساتھ کھانے کے لیے مدعو کرتے ہیں۔ اور کھانے کے بعد خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور ان کا شکریہ بھی ادا کرتے ہیں۔

Marfat.com

Marfat.com

چند حادثے زندگی کے

انسان یہ بات نہیں مانتا کہ زندگی بذات خود ایک حادثہ ہے اور انسان کا زندہ رہنا بھی معجزہ ہے۔ پھر بعض اوقات ایسی صورتِ حال بھی اچانک پیدا ہو جاتی ہے کہ انسان زندگی سے ہی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور ناگہانی حادثے سے بچ جائے تو ذہن ماؤف ہو جاتا ہے۔ اپنی زندگی میں مجھے بھی چند ایسے ہی واقعات کا سامنا کرنا پڑا جن میں موت جیسی دہشت طاری ہو جاتی رہی لیکن اللہ کا شکر ہے کہ زندگی محفوظ رہی۔

پہلا حادثہ

یہ قومی حادثہ ہم سب کے لئے دُکھ کا باعث تھا۔ اس میں ہمارے دشمن ملک کی سازش شامل تھی اور اس میں ہمارے بہت سے جری جوانوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا اور وطن عزیز کی حفاظت کی۔ میں اس حادثے کا ذکر اپنے ذاتی حوالے سے پیش کر رہا ہوں۔ 6 ستمبر 1965ء کو سحر سے ذرا پہلے غیر علانیہ بھارتی فوج نے پاکستان پر یلغار کر دی تھی۔ اچانک سرحد کی لکیر پر مسلسل ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ بھارتی ٹینک بلا روک ٹوک بی۔ آر۔ بی نہر کے مشرقی کنارے تک پہنچ گئے تھے۔ مغربی پاکستان کی دوسری تمام سرحدیں بھی لاہور کی سرحد کی مانند بیدار ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ہی پاکستانی فوج دفاع کے لئے پہنچ گئی اور پاکستان کے تمام جنگی سیکٹروں میں بھارتی فوج کی پیش قدمی رک گئی۔ اس جارحیت کے تحت جنرل چودھری لاہور کے جم خانے میں شام کے پانچ بجے فتح کا جام نہ پی سکا۔

Marfat.com

ہمارا گاؤں دیو وال سیالکوٹ کی سرحد پر واقع تھا جو بھارتی قبضے میں چلا گیا۔ قبضے کے فوراً بعد بھارتیوں نے گاؤں میں رہ جانے والے افراد کو قیدی بنالیا۔ ان میں میری عمر رسیدہ بڑی پھوپھی بھی تھیں جو لمبے عرصے سے بیمار چلی آرہی تھیں۔ اگرچہ ہم لاہور میں تھے اور نسبتاً محفوظ تھے لیکن گاؤں میں رہنے والے عزیز و اقارب کی خیریت معلوم کرنے کے لئے ہمیں بھی پریشانی تھی۔ بہت سے عزیز تو پاکستان کے مختلف علاقوں میں محفوظ مقامات پر چلے گئے اور ان کی اطلاع بھی ہمیں مل گئی لیکن پھوپھو کی گرفتاری نے ہمیں پریشان کر دیا تھا۔

بھارتی فوج کے قبضے میں آجانے والے پاکستانی دیہات کو بھارتی فوج اور عوام نے بری طرح لوٹا، قبضے میں آنے والی سرکاری تنصیبات کو ہی نہیں، پاکستان کے عوام کے مکانوں کے دروازے، کھڑکیاں، مشینری، لوہے کے ٹاور، بجلی کی تاریں اور ٹین وغیرہ کے علاوہ اینٹ اور روڑے بھی اٹھالے گئے۔ ہمارے گھر کے دروازوں کی چوبی چوکاٹھیں بھی اکھاڑ کر لے گئے اور گھر میں جو کنواں تھا اسے مٹی روڑے سے بھر دیا۔

قریبی گاؤں باجڑہ گڑھی...... میں ایک چار منزلہ تاریخی عمارت تھی، اس متروکہ عمارت کو پاکستان نے اس کی تاریخی حیثیت کے تحت محفوظ رکھا تھا۔ اس میں طالبات کا پرائمری سکول، پٹوار خانہ، ڈسٹرکٹ بورڈ کی ڈسپنسری، معائنے اور سرکاری دوروں پر آنے والے افسران کی رہائش گاہ بنادی تھی۔ سب سے اوپر کی منزل میں مڈل سکول کے ہیڈ ماسٹر کی رہائش گاہ تھی، بھارتی دشمن فوجیوں نے اس کا صفایا کر دیا اور ڈسپنسری کی ادویات بھی اٹھالے گئے۔

اس تباہی پر سب کو تشویش تھی لیکن ہمیں اپنی پھوپھو کے قیدی بنائے جانے کا بہت غم تھا۔ تین ماہ کے بعد اچانک یہ خبر آئی کہ پھوپھو کو مریضہ ہونے کی وجہ سے رہا کر دیا گیا ہے۔ مریضہ کی رہائی کی خبر اخبار میں پڑھ کر ہم ان کو والٹن کے ہسپتال سے لے آئے۔ ظالموں نے ان کا سر استرے سے مونڈ دیا تھا۔ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں میں واپس آجانے کے باوجود ان کا دماغی توازن قائم نہیں رہا تھا۔ وہ بہت پریشان تھیں کہ ان پر یہ سب کچھ کیسے بیت گیا۔ باقی ماندہ زندگی

Marfat.com

انہوں نے اس اختلال دماغ ہی میں گزاری۔ بھارتی بربریت اور بہیمیت کا یہ واقعہ میری زندگی کا ایک حقیقی سانحہ ہے جو میں کبھی بھلا نہ سکا۔

دوسرا حادثہ

مجھے اپنی گاڑی بہت تیز چلانے کی عادت تھی۔ میں اسے اپنی خامی سمجھتا تھا۔ لیکن جب ڈرائیور کی نشست پر سٹیرنگ ہاتھ میں ہوتا تو پاؤں ایکسلیٹر دباتے چلے جاتے۔ گاڑی جتنی تیز دوڑتی، مجھے اتنا ہی مزا آتا تھا۔ بلاشبہ بعض اوقات مجھے یہ اشعار بھی یاد آتے جن میں تیز رفتاری کی بجائے سست روی اور اعتدال پسندی کی تلقین کی گئی ہے اور استقلال کا سبق بھی دیا گیا ہے۔

تیزی نہیں منجملہ اوصاف کمال
کچھ عیب نہیں اگر چلو دھیمی چال
خرگوش سے لے گیا کچھوا بازی
ہاں راہ طلب میں شرط ہے استقلال

لیکن میں اپنی اس عادت پر قابو نہ پا سکا۔ ایک دفعہ میں اپنے کسی کاروباری سلسلہ میں بہاولپور گیا ہوا تھا۔ واپسی پر میں ملتان اور ساہیوال کے درمیان سڑک پر کار دوڑا رہا تھا۔ ایک نہر کے پل سے گزر کر گاڑی سیدھی جانے کی بجائے اچانک ایک سمت کو مڑ گئی۔ اس وقت گاڑی کی رفتار تیز تھی۔ نہر کے پل پر سے گزرتے وقت میں گاڑی کی رفتار پر قابو نہ رکھ سکا، دوسرے جدھر کو سڑک مڑتی تھی، میں اس سمت میں گاڑی کو موڑ بھی نہ سکا۔ بدحواسی کے عالم میں میں نے سٹیرنگ پر اپنی گرفت چھوڑ دی اور سمجھ گیا کہ گاڑی سیدھی جا کر کسی کھڈ میں جا گرے گی یا کسی درخت سے ٹکرا جائے گی لیکن خدا کا کرنا یہ ہوا کہ گاڑی کھڈ میں گری اور نہ ہی درخت سے ٹکرائی بلکہ وہ خود ہی سڑک کی سمت پر مڑ گئی اور سڑک پر چلنے لگی۔ میرے حواس بجا ہوئے تو میں نے گاڑی کی رفتار دھیمی کر دی۔ اللہ کو میری زندگی منظور تھی۔ اس کے مقرر کردہ فرشتوں نے میری حفاظت فرمائی تھی۔ اب میں سٹیرنگ پر اپنی گرفت مضبوط کر چکا تھا۔ میں نے تھوڑا سا آگے جا کر گاڑی روکی اور ننگی زمین پر

Marfat.com

سر بجود ہو گیا۔ اللہ نے میری جان اپنے فضل وکرم سے بچائی تھی۔

تیسرا عظیم حادثہ

میں ''اپنی بے جی'' کے انتقال کو اپنی زندگی کا عظیم ترین حادثہ سمجھتا ہوں۔ مجھے یہ حادثہ 7 فروری 1979ء کے دن پیش آیا۔ اس روز میں خود پر قابو نہ رکھ سکا اور پھوٹ پھوٹ کر روتا رہا۔ اپنے کاروباری دور کے آغاز اور کامیابی کے لیے دوڑ دھوپ میں مشغول رہنے کی وجہ سے میں محسوس کرتا ہوں کہ میں اپنی والدہ محترمہ کی وہ خدمت نہیں کر سکا جو ان کا حق تھا۔ دنیا سے ان کے رخصت ہو جانے کے بعد پتہ چلا کہ وہ مجھ سے محبت نہیں بلکہ عشق کرتی تھیں۔ وہ ہر وقت مجھ ہی میں گم رہتی تھیں۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ میں بے لوث دعاؤں کے کتنے بڑے سرچشمے سے محروم ہو گیا تھا۔

''بے جی'' کے یکا یک گھر سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جانے سے میری حالت غیر ہو گئی۔ کئی سال تک جب وہ مجھے یاد آتیں تو بھی جذباتی ہو جاتا اور ڈھاریں مار مار کر رونے لگتا۔ وہ مجھے اب بھی خواب میں نظر آتی ہیں تو ان کی یادوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ میں اپنے عقیدے کے مطابق ان کی روح کے ایصال ثواب کیلئے کلام پاک کی تلاوت اور حتی المقدور خیرات کرتا ہوں تو دل کو سکون سا آجاتا ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ ان کی خوشبو میرے اردگرد پھیل گئی ہے اور وہ یہیں کہیں میرے قریب ہی موجود مجھے دعائیں دے رہی ہیں۔ ''بے جی'' سے محرومی میری زندگی کا سب سے بڑا حادثہ ہے۔

چوتھا حادثہ

یہ 1986ء کا سال تھا۔ میں اور میری اہلیہ حج بیت اللہ کے لیے گئے ہوئے تھے۔ میدان عرفات میں حاضری کے بعد ہم نے مزدلفہ میں بھی رات گزار لی تھی اور وہاں سے شیاطین کو منیٰ میں مارنے کے لیے کنکریاں بھی چن لی تھیں۔ جب ہم دونوں شیطانوں کو کنکریاں مارنے

Marfat.com

کے لیے جا رہے تھے تو ہجوم میں پیچھے سے قد آور حبشی حجاج کا ایک ریلا آیا۔ (جو لوگ حج بیت اللہ کر چکے ہیں وہ جانتے کہ حج کے لئے آئے ہوئے حبشی مرد اور خواتین کس طرح منظم ہو کر مناسک حج ادا کرتے ہیں۔ دوسرے ممالک کے لوگ خود بخود ان کی راہ چھوڑ دیتے ہیں ایسی ہی کیفیت بیماروں اور معذوروں کو پالکیوں میں طواف کرانے والوں کی بھی ہوتی ہے)۔

میں نے اس ریلے سے بچنے کی کوشش تو کی لیکن میں ان کے ساتھ ٹکرا جانے سے نیچے گر گیا۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ میں محسوس کر رہا تھا کہ میرا آخری وقت آ پہنچا ہے، لیکن میری یہ سوچ غلط تھی، میرا آخری وقت ابھی نہیں آیا تھا، میری حفاظت پر مامور فرشتوں نے مجھے اس طرح سنبھالا تھا کہ منیٰ کے میدان کے فرش پر چت گرنے اور کچلے جانے سے پہلے ہی میں پھر سے کھڑا ہو گیا تھا جبکہ منیٰ کے طوفانی ریلوں میں گرے ہوئے حاجی کے کھڑا ہو جانے کی روایت ہی نہیں ہے۔ میرا گر کر اٹھ جانا اور پھر میری جان کا بچ جانا ایک وقت میں قدرت کے دو معجزے تھے۔

پانچواں حادثہ

ابا جی (ملک لال دین) حیات تھے تو وہ میری والدہ محترمہ کی ان خدمات کا ذکر کرتے رہتے تھے جو انہوں نے اپنے چھوٹے سے کنبے کی اعلیٰ پرورش اور تربیت کے لئے انجام دی تھیں۔ میں اب اندازہ کر سکتا تھا کہ اہلیہ کی رحلت کے بعد شوہر کی کیا حالت ہو سکتی ہے۔ صداقت یہ ہے کہ وہ اپنی اہلیہ یعنی میری والدہ کی وفات کے بعد خود کو نامکمل بلکہ صفر محسوس کرتے تھے۔ وہ ہر وقت کھوئے کھوئے خلاؤں میں جھانکتے رہتے۔ جیسے اپنی کسی متاع گم گشتہ کو تلاش کر رہے ہوں۔ میں ان کی دلجوئی کرتا تو تلخی سے کہتے: ''اللہ نے تجھے بیوی بچے دیئے ہیں۔ تیرا جو کنبہ ہے وہ میرا بھی کنبہ ہے۔ لیکن بتا کیا ان سب کی موجودگی کے باوجود تو اپنی ماں کو بھول سکا ہے؟ وہ تیری ماں تھی جبکہ میری تو وہ واحد مشیر اور غمخوار تھی۔ میں اسے کسی آن نہیں بھول سکتا حالانکہ تو اس کی مجسم نشانی میرے پاس ہے''۔ 1988ء کی ابتدا میں وہ کچھ علیل رہنے لگے تھے۔ ان کے علاج معالجے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی۔ میرے سب بچے بھی ان کی خدمت کرتے رہے لیکن ''بے جی'' کی طرح

Marfat.com

ان کا آخری معین وقت بھی آ پہنچا اور وہ یکم مارچ 1988ء کو ہمیں چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔ والدہ کی وفات کے بعد والد کی رحلت میرے لئے جانکاہ حادثہ تھی۔ میں ایک سایہ دار شجر سے محروم ہو گیا تھا جس کے سائے میں ساری زندگی گزاری تھی۔ اب میرے سامنے صحرا تھا اور میں تنہا مسافر تھا۔

موت وحیات کا سلسلہ اللہ تعالیٰ نے اپنے قبضے میں رکھا ہے۔ میں یا کوئی اور اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ جو ذی روح اس دنیا میں آیا ہے اس نے ایک نہ ایک دن جانا ہی ہوتا ہے۔ موت اس کا مقدر ہے۔ میں اپنے کنبے کے دائمی طور پر رخصت ہو جانے والے بھائی، والدین اور دیگر عزیز واقرباء کو یاد کرتا اور ان کی ارواح کے سکون اور درجات کی بلندی کے لیے تلاوت کلام پاک کرتا ہوں اور مغرب کی نماز کے بعد نوافل پڑھ کر ایک بار سورۃ فاتحہ اور تین دفعہ سورۃ اخلاص اور ایک دفعہ درود ابراہیمی پڑھ کر مرحومین کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہوں۔

وراثت میں ملنے والی گاؤں کی زمین کی آمدن یا ٹھیکہ سے میں نے کبھی کچھ نہیں لیا تھا۔ میرے تایا زاد محمد ناظر ہی اس سے اپنی گزر بسر کرتے تھے۔ میری پھوپھی کا پوتا حاجی محمد اسحاق دیندار اور متشرع انسان ہے۔ گاؤں کی مسجد کا انتظام وانصرام وہی کرتا ہے۔ اب زمین کی ذمہ داری میں نے اس کو سونپ دی ہے کہ اس کی آمدن وہ مسجد کی ضروریات پر خرچ کرتا رہے۔ میں نے مسجد کے ساتھ ایک لائبریری بھی قائم کی ہے جس میں بچوں اور بڑوں کے مطالعے کے لیے تمام علوم کی کتابیں رکھی گئی ہیں۔

ہماری حویلی کو 1965ء کی جنگ میں بھارتی فوجیوں نے تباہ کر دیا تھا۔ جنگ کے بعد اس مقام پر نیا مکان بنایا گیا جس میں میرے تایا کا بیٹا محمد ناظر رہتا ہے۔ زمین کی کاشت بھی وہی کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ معاہدہ ہے کہ وہ ایک طے شدہ رقم حاجی اسحاق صاحب کو دے گا کہ وہ مسجد پر خرچ کریں۔ اللہ میری اس حقیری خدمت کو قبول فرمائے اور میرے والدین کی روح کو ثواب پہنچے۔

Marfat.com

گھر پر ڈاکہ

میری رہائش 350۔گلشن پارک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور میں تھی۔یہ علاقہ خاصا پُرسکون تھا۔ماحول دیدہ زیب تھا۔میرے مزاج کے مطابق گلشن پارک بھی ساتھ ہی تھا۔ہم جب چاہتے سیر وتفریح کے لئے پارک میں چلے جاتے۔

10 دسمبر 1989ء کی شام کو ہمارے گھر کے دروازے کی گھنٹی کسی شخص نے بجائی۔گھر میں کام کرنے والی ملازمہ صفیہ نے برآمدے میں کھلنے والا کمرے کا دروازہ کھولا تو اس کے ساتھی دوسرے شیطان نے، جو پہلے ہی دیوار پھلانگ کر اندر آ چکا تھا، اپنے پستول کا بٹ ملازمہ کے سر پر دے مارا۔ملازمہ کے گر جانے پر وہ اندرونی کمرے میں گھس آیا۔اس وقت میری بہو جو اپنے چھوٹے سے بچے کو گود میں اٹھائے ہوئے سلا یا بہلا رہی تھی۔اس شیطان نے اس کی کنپٹی پر پستول رکھ دیا۔دوسرے ہاتھ سے اس نے سامنے نظر آنے والی الماری کا تالہ کھولنے کے لئے چابی طلب کی۔سہمی ہوئی بہو ابھی اس کو کوئی جواب نہ دے پائی تھی کہ اس کا دوسرا ساتھی بھی کمرے میں پہنچ گیا۔اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ایک بڑے پیچ کس سے تالے سمیت الماری کے کنڈے ہی کو اکھاڑ ڈالا۔وی سی آر اور الماری میں رکھے ہوئے زیوارات اور نقدی کو لے کر وہ دونوں کھلے دروازے سے فرار ہو گئے۔

ملازمہ کے سر سے کافی خون بہہ گیا تھا۔اسے ہسپتال لے جایا گیا۔اس ڈاکے کی رپورٹ پولیس تھانہ میں درج کروائی گئی۔پولیس آئی، رسمی طور پر تفتیش بھی ہوئی لیکن آج تک مجرم پکڑے گئے اور نہ ہی مال برآمد ہوا۔ہمیں ملا تو بس دہشت اور خوف ہی ملا۔حالانکہ حکومت پنجاب نے مجرموں کو پکڑنے کے واضح احکامات جاری کیے تھے تقی الدین پال افسر بکار خاص (ہوم) کا مراسلہ جو ہمیں موصول ہوا اس کا عکس اگلے صفحے پر پیش ہے:

اس ڈاکے کے بعد وہ گھر جو ہمیں ہر لحاظ سے پیارا لگتا تھا اب ہمیں ڈرانے لگا۔اس کے در و دیوار پر خوف کے سائے لہراتے رہتے۔خوف سے نجات حاصل کرنے کیلئے ہم نے وہ گھر

Marfat.com

GOVERNMENT OF THE PUNJAB
HOME DEPARTMENT
LAHORE

No. PA/OSD(H)2-11/89

February 6, 1990.

To

Dr. Arshad Maqbool,
350-Gultion Block,
Allama Iqbal Town,
LAHORE:

Subject:- DACOITY IN THE HOUSE OF DR. ARSHAD MAQBUL, 350-GULTION BLOCK, ALLAMA IQBAL TOWN, LAHORE

Please refer to your application dated nil to the address of Home Secretary, Punjab, on the above subject.

2- The Senior Superintendent of Police, Lahore, has reported that an F.I.R No.125 dated 10-12-89 U/S 17/66/99 Islamic Law, Police Station, Allama Iqbal Town, Lahore, has been registered. Necessary investigations have been started and the S.H.O of the Police Station has been directed to trace the culprits on priority basis.

(TAQI-UD-DIN PAL)
OFFICER ON SPECIAL DUTY(Home)

Marfat.com

بیچ ڈالا اور فوری طور پر کرائے کے مکان میں ماڈل ٹاؤن آ گئے۔ کچھ عرصہ بعد اللہ نے توفیق بخشی اور ہم نے ایک کنال کا مکان جوہر ٹاؤن میں خرید لیا۔ لیکن ستمبر 2006ء میں اپنے بیٹے ظفر مقبول کی خواہش پر میں نے یہ مکان بیچ کر وحدت روڈ پر دس مرلے کا پلاٹ خریدا اور اس پلاٹ پر دوکان کی تعمیر کی۔ میرے بیٹے ظفر مقبول نے وہاں ہی مقبول بکس کے نام سے اپنے کاروبار کا آغاز کیا۔ ڈاکے کے اس حادثے نے ہمیں خوف و ہراس میں مبتلا کر دیا تھا لیکن اب لاہور ڈاکوؤں کی ''جنت،، بن گئی ہے اور روزانہ آٹھ دس ڈاکے اور قتل ہونے لگے ہیں تو مجھے اپنا یہ واقعہ معمولی نظر آنے لگا ہے۔ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے میرے خاندان کی عزت اور زندگی محفوظ رکھی۔

کچھ واقعات بنیادی طور پر حادثہ ہی ہوتے ہیں لیکن ان کے نتیجے توقع کے خلاف مختلف نکلتے ہیں ____ ''جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے،،

پیپر مِل لگانے میں ناکامی

نومبر 1990ء میں مَیں نے رائے ونڈ کے قریب 113 کنال اراضی اس مقصد کے لئے خریدی کہ وہاں پر کاغذ بنانے کی فیکٹری لگائی جائے۔ اس سلسلے میں ایک فرم تشکیل دی گئی جس کا نام ''مقبول پیپر اینڈ بورڈ ملز (پرائیویٹ) لمیٹڈ'' تجویز ہوا۔ میرے اپنے ہی کنبے کے پانچ افراد اس فرم کے ڈائریکٹر تھے۔ فرم کے نام کا بنک کھاتہ بھی کھولا گیا اور منصوبے کے قابل عمل ہونے کی رپورٹ (فزیبلٹی) بھی تیار کر لی گئیں۔ تعمیری کام کی ابتدا کرنے کی تیاریاں مکمل کر لی گئیں۔ ایک مکمل واقفیت نامہ بھی چھپ کر تیار ہو گیا۔ مل کی مشینری کے سلسلے میں بیرونِ ملک کے ایجنٹوں سے رابطے کے لیے ان کے پتے حاصل کیے گئے۔ مشینری کی تنصیب کے لیے بعض ممالک کی طرف سے پمفلٹ، مشینری کی تصاویر اور ان کی قیمتوں کی تفصیل حاصل کر لی۔ حتیٰ کہ انگلینڈ سے ایک بروکر صاحب مشینری کے سودے کے سلسلہ میں لاہور تشریف لائے۔ ان سے تفصیلاً بات چیت بھی ہوئی۔

Marfat.com

سرمائے کا مسئلہ ہمیشہ بڑا مسئلہ ہوتا ہے۔ کاغذی طور پر منصوبے کے خدوخال تیار کرنے سے پہلے ہم نے اس معاملے پر بھی غور کرلیا تھا۔ بنک نے ہمیں یقین دلایا تھا کہ منصوبے کی نوعیت ترقیاتی اور حکومتِ پاکستان کے منشا کے عین مطابق ہے لہٰذا ہمیں قرضہ بھی مل جائے گا۔ ہمارے اور بنک کے درمیان یہ بات زبانی طے پا چکی تھی کہ منصوبے کو ٹھوس شکل دینے سے پہلے ہی قرضہ دستیاب ہوگا لیکن جب وقت آیا تو جو بات طے نہ کی تھی وہ سامنے آ گئی۔ ہم قرضے کی منظوری دینے والے افسران کے ''معیار'' پر پورا نہ اتر سکے تھے لہٰذا ہمارا منصوبہ لٹک کر رہ گیا۔ مئی 2002ء میں جو اراضی مقبول پیپر اینڈ بورڈ ملز (پرائیویٹ) لمٹیڈ کے لیے خریدی گئی تھی اسے بیچ دیا گیا اور متعلقہ محکمہ جات کو اپنا منصوبہ ترک کردینے کی اطلاعات بھیج دی گئیں۔

میرا یہ ترقیاتی منصوبہ امید وبیم کی حالت میں لٹکا رہا۔ میں متعلقہ افسران سے ان کی مرضی کے کچھ ''خاص معاملات'' طے کرنے میں ہمیشہ ناکام ہی رہا ہوں اور خدا کا شکر بجالاتا ہوں کہ میں سرکاری افسروں کی ترغیب کا شکار نہیں ہوا۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں صرف ایک کتب شائع کرنے، کتابیں فروخت کرنے والا محنت کش انسان ہوں، ادیب، شاعر یا دانشور نہیں۔ پھر بھی میں ہمیشہ ''گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل'' کی کیفیت سے دوچار رہتا ہوں اور اپنے خالق کے حضور میں سربسجود ہو کر شکر بجالاتا ہوں کہ اس نے میری محنت کو برکتوں سے سرفراز کیا۔ ضمنی طور پر اس بات کا اظہار بھی مناسب ہے کہ 1999ء میں مارکوئیس پبلشنگ بورڈ نے میرا نام اپنی سالانہ کتاب Who's Who in the World میں شائع کیا۔ اس سرٹیفکیٹ کی نقل یہاں پیش کی جاتی ہے۔ میرے بعض دوست مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میں نے تعلیم اور تجربہ نہ ہونے کے باوجود اپنی خاندانی اور کاروباری زندگی میں یہ کمال کیسے حاصل کیا تو میں آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر کہتا ہوں کہ میں کیا میری محنت کیا؟ یہ سب اللہ کریم کی کرم نوازی ہے!۔

Marfat.com

The Marquis Who's Who Publications Board

Certifies that

Maqbool Ahmed Malik

is a subject of biographical record in

Who's Who in the World
Sixteenth Edition
1999

inclusion in which is limited to those individuals who have demonstrated outstanding achievement in their own fields of endeavor and who have, thereby, contributed significantly to the betterment of contemporary society.

Publisher

Marfat.com

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

میں اپنے دوستوں سے اپنی سوچوں کے تناظر میں حقیقت تک پہنچنے کے لئے بالعموم فارسی، عربی اور اُردو ادب کی کتابوں کے مطالعے کا ذکر کرتا ہوں۔ ان کو اللہ تعالیٰ سے ناطہ جوڑنے اور ماں باپ کی دعائیں لینے کا مشورہ دیتا ہوں۔ تحمل، بردباری، راستی اور ہر کہ ومہ سے نیکی کرنے کی تاکید کے علاوہ اپنے ضمیر پر بوجھ ڈالنے سے گریز کرنے کو کہتا ہوں۔ اور دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سب کو کامیابیاں عطا کرے اور نیک اعمال، خدمت خلق اور خدمت دین کی توفیق فرمائے۔

میرا تشنۂ تکمیل منصوبہ

میں نسل انسانی کی فلاح و بہبود اور بے غرض خدمت کا ایک منصوبہ اب بھی اٹھائے اٹھائے پھر رہا ہوں۔ یہ خالصتاً انسانی بنیادوں پر ''ٹرسٹ'' قائم کرنے کا منصوبہ ہے۔ میں اس منصوبے کی کاغذی تیاریاں مکمل کر چکا تو میرے بچوں نے بوجوہ اس منصوبے کی تائید نہیں کی۔ اس منصوبے میں سرمائے کی بھی ضرورت ہے اور افرادی قوت کی بھی...... بچوں کے عدم تعاون کے باوجود یہ منصوبہ میرے ذہن میں زندہ ہے اور میں اپنے اس تصور کو عملی صورت دینے کے لیے کوشاں ہوں۔ موقع ملا تو میں اسے ضرور قائم کروں گا۔ انشاءاللہ۔

چھوٹے چھوٹے اہم واقعات

زندگی واقعات سے عبارت ہے۔ مختلف اقسام کے واقعات رونما نہ ہوں تو زندگی کی اہمیت کا احساس ہی نہ ہو۔ بعض واقعات حادثات میں تبدیل ہو جاتے ہیں تو وہ بڑے تواتر سے یاد آتے ہیں لیکن جب اللہ کی مہربانی سے یہ واقعات خوشگوار صورت اختیار کر جاتے ہیں ان کی یاد آنے پر مَیں پروردگار کے سامنے دوزانو ہو کر دو نوافل ادا کرتا ہوں۔ اب مجھے یاد آرہا ہے کہ ایک دفعہ چھوٹا بیٹا ارشد مقبول انارکلی میں ہم سے بچھڑ گیا۔ گو وہ ایک گھنٹے بعد میری بہن کو ایک دکان سے

Marfat.com

مل گیا لیکن اس ایک گھنٹے میں مجھ پر قیامت گزر گئی۔ ایک مرتبہ بہت چھوٹی عمر میں ایک بچے نے غلطی سے مٹی کا تیل پی لیا اور اس کی جان کے لالے پڑ گئے۔ جب تک وہ تندرست نہیں ہوا میں اور اہل خانہ پریشانی کے عالم میں شدت سے بدحواس اور بے کل رہے۔

ابتدائی کلاسوں میں میرے بچے ادبستان صوفیہ میں پڑھتے تھے۔ ایک دفعہ میرے بڑے بیٹے ظفر مقبول کا کھیل کے دوران بازو ٹوٹ گیا، لیکن وہ رویا نہیں۔ اسی حالت میں اس کا دادا اسے گھر لے آیا لیکن وہ گھر آ کر بھی بالکل نہیں رویا۔ پھر ہم اسے لوہاری دروازہ کے پاس ہڈیاں جوڑنے والے ایک پہلوان کے پاس لے گئے۔ جب اس پہلوان نے ٹوٹی ہوئی ہڈی کو درست کیا تو ظفر مقبول کو زیادہ تکلیف ہوئی اور وہ رونے لگا۔ لیکن بازو بالکل ٹھیک ہو گیا حالانکہ دو جگہ سے ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ ہم نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ معصوم بچوں کو ایسے چھوٹے چھوٹے خطرناک واقعات سے اللہ کی عنایت ہی بچا سکتی ہے تاہم والدین کو ہر وقت بچوں کے تحفظ کی تدابیر کرتے رہنا اور خدا سے ان کی عافیت طلب کرتے رہنا چاہیے۔

☆☆..........☆..........☆☆

Marfat.com

Marfat.com

چند مصنفین کا تذکرہ

Marfat.com

Marfat.com

مقبول اکیڈمی ایک اشاعتی دارہ ہے۔ اس کا قیام کتابوں کی اشاعت کے لئے عمل میں لایا گیا تھا، یہ بات بھی میرے پیش نظر تھی کہ مصنف اور ناشر کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ مصنف کتاب تخلیق کرتا ہے اور ناشر اسے زیور طباعت سے آراستہ کر کے قاری تک پہنچاتا اور مصنف کی ادبی اور تخلیقی ساکھ قائم کرتا ہے۔ مصنف ناشر کے کاروبار کا ایک اہم حصہ ہے اور وہ مصنف کی قدر و منزلت دل و جان سے کرتا ہے۔ اب میں اپنے ادارے کے چند مصنفین کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جن کی کتابیں شائع کر کے مجھے روحانی اور قلبی خوشی ہوئی۔ مقبول اکیڈمی کی وجہ سے جن ادیبوں سے دوستی کا تعلق پیدا ہوا ان کا ذکر بھی شامل ہے۔

Marfat.com

Marfat.com

احسان دانش

احسان دانش ادبی دُنیا میں ایک مزدور شاعر کی حیثیت میں شہرت رکھتے تھے وہ اپنی محفل میں شاگردوں اور سینئر ادیبوں کے سامنے کہتے تھے کہ بچپن میں انہیں والد نے بکریاں پال کر دی تھیں، وہ انہیں چرانے کے لئے جنگل میں لے جاتے۔ بکریاں چرتی رہتیں اور احسان دانش کتاب پڑھتے رہے۔ کاندھلہ ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے۔ پرائمری تک تعلیم مقامی مدرسے میں حاصل کی اور اتنی استعداد حاصل کرلی کہ ''قصۂ حاتم طائی''، ''باغ و بہار'' اور ''آبِ حیات'' پڑھنے لگے۔ دہلی میں ایک پریس میں نوکری کرلی۔ دل نہ لگا تو لاہور آ گئے۔ ان دنوں پنجاب یونیورسٹی کی عمارت بن رہی تھی۔ احسان دانش نے اس تعمیر میں اینٹیں ڈھوئیں اور گارا بنایا۔

ان کا پہلا مجموعۂ کلام ۱۹۳۱ء میں ''حدیثِ ادب'' کے نام سے چھپا اور پھر ان کی شاعری کی ستائش و تعریف اور ان کے ذہنی اور فنی مرتبے کا اعتراف سب نے کیا، لیکن احسان دانش نے سادگی اور درویشی کو اپنی زندگی کا شعار بنایا۔ انہوں نے اپنے کردار سے ایک بااخلاق انسان ہونے کا ثبوت دیا۔ ان کی شاعری کی کتاب ''نفیرِ فطرت'' شائع ہوئی تو وہ خود میرے دفتر تشریف لائے اور اس کی خوبصورت پیشکش کی تعریف کی۔ پروفیسر سجاد حارث نے ان کے فن پر ''عوامی شاعر اور اس کا فن'' کے نام سے ایک معرکہ آرا کتاب لکھی، جسے میں نے بڑی عقیدت اور اہتمام سے شائع کیا..... احسان دانش صاحب سے عقیدت کا یہ تعلق ان کی زندگی کے آخری ایام تک قائم رہا۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے۔ (آمین)

Marfat.com

رئیس احمد جعفری

رئیس احمد جعفری میرے ادبی رہنما تھے، میں ان کے اس احسان کو بھول نہیں سکتا کہ انہوں نے میرا ہاتھ اس وقت پکڑا جب میں اشاعتی میدان میں نووارد تھا۔ جعفری صاحب کی شفقت نے میرے ادارہ مقبول اکیڈمی کو ابتداء میں ہی مضبوط بنیاد فراہم کی اور ابوالکلام آزاد کی ''انڈیا ونز فریڈم'' کے ترجمہ ''آزادی ہند'' کی اشاعت کے بعد ''قائداعظم اور ان کا عہد'' ''خطبات قائداعظم''، ''خون کی ہولی''، ''خلیفہ ہارون رشید اور اس کا عہد'' اور کئی معاشرتی اور تاریخی ناول اشاعت کے لئے دیئے۔

رئیس احمد جعفری بلاشبہ ایک بڑے انسان تھے۔ محبت کرنا ان کی عادت تھی، انسان دوستی ان کی فطرت میں تھی۔ وہ سیاست آشنا ادیب تھے لیکن کبھی کسی مخالفت پر منفی تنقید نہیں کی۔ پاکستان کو مسلمانوں کی آخری پناہ گاہ سمجھتے تھے اور قائداعظم کے اس احسانِ عظیم کا تذکرہ کرتے کہ وہ آزاد وطن لے کر دے گئے ہیں تو ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی لیکن ملال کرتے کہ سیاستدانوں نے اس ملک کی حفاظت کا حق ادا نہیں کیا۔ جعفری صاحب کو اپنے ملک سے بے پناہ محبت تھی اور وہ اس آرزو میں ہی اس دُنیا سے اُٹھ گئے کہ کشمیر کو آزاد دیکھ سکیں۔

میں آج اپنے محسن کو یاد کر رہا ہوں تو دل خوش ہو رہا ہے۔ اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

احسان الحق سلیمانی

احسان الحق سلیمانی کا تعلق ضلع گجرات کے مشہور قصبہ کنجاہ سے تھا۔ سلیمانی صاحب محکمہ تعلیم میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے، وہ بے حد دیانت دار اور بااصول افسر تھے، بہت بڑے عالم

Marfat.com

اور علم دوست تھے، پاکیزہ اطوار اور سچے مسلمان تھے...... میں نے ''سیرت ابن ہشام'' کا ترجمہ احسان الحق سلیمانی صاحب سے کروایا تو اس کے بعد سلیمانی صاحب سے محبت کا تعلق پیدا ہوا تو یہ بڑھتا چلا گیا اور میں نے ان کی متعدد کتابیں شائع کیں۔ ان کی لکھی ہوئی کتاب ''رسولِ مبین'' پر انہیں صدارتی ایوارڈ ملا اور آزاد کشمیر گورنمنٹ نے بھی اسے ایوارڈ سے نوازا۔ اس کے علاوہ ''قرآنِ حکیم اور ہماری زندگی''، ''مسلمان یورپ میں'' اور ''بہتر تدریس بہتر تعلیم'' بھی سلیمانی صاحب کی تالیفات ہیں جو مقبول اکیڈمی سے شائع ہوئیں۔

میرزا ادیب

رئیس احمد جعفری، احسان الحق سلیمانی اور محمد سعید کے بعد مقبول اکیڈمی کے مصنفین میں سرفہرست میرزا ادیب ہیں۔ میں نے ان کی کتاب ''صحرانورد کے خطوط'' پڑھی تو مصنفین کو ایک ماورائی مخلوق خیال کرنے لگا۔ میرزا ادیب کو دیکھنے کی خواہش تو دل میں ہمہ وقت بیدار رہتی۔ ان سے ملاقات ہوئی تو میں ان کی سادگی سے بہت متاثر ہوا اور حیرت زدہ رہ گیا کہ ''صحرانورد کے خطوط'' کیا انہوں نے ہی لکھی ہے؟ اس پہلی ملاقات نے ان سے میرے برادرانہ تعلقات کی بنیاد پیدا کر دی۔ میرزا ادیب کے بیٹے ڈاکٹر تحسین میرزا میرے بڑے بیٹے ڈاکٹر ظفر مقبول کے میڈیکل کے کلاس فیلو ہیں۔ اس تعلق نے میرزا صاحب سے میری شناسائی کو نیازمندی کا درجہ دے دیا۔ اُردو ادب کی قد آور شخصیت ہونے کے باوجود ان کا منکسر المزاج ہونا ان کی عظمت کا مظہر تھا۔ وہ اگلے زمانے کی شرافت کے عملی پیکر تھے۔

ان کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید نے ان کی برسی کے موقع پر اخبار ''نوائے وقت'' میں ایک طویل مضمون لکھا تھا۔ میں اس مضمون کا ایک اقتباس پیش کرتا ہوں جس کا تعلق مقبول اکیڈمی اور اس کے حوالے سے اس ناچیز سے بھی ہے۔

''انارکلی کے راستے میں وہ (میرزا ادیب) مقبول اکادمی پر رک جاتے

Marfat.com

ہیں۔ملک مقبول احمد انہیں ''صحرانورد کے خطوط'' کا گولڈن جوبلی ایڈیشن اور ان کی سوانح عمری ''مٹی کا دیا'' پیش کر رہے ہیں۔ میرزا صاحب کی آنکھوں میں طمانیت کی لازوال چمک ابھرتی نظر آ رہی ہے۔ چلنے لگتے ہیں تو ملک مقبول احمد انہیں روک کر کہتے ہیں: ''پروفیسر رشید امجد نے آپ کے فکر و فن پر ایک جامع کتاب مرتب کی ہے۔ یہ کتاب آج ہی چھپ کر آئی ہے''

میرزا ادیب نے یہ کتاب دونوں ہاتھوں میں تھام رکھی ہے۔ وہ اس کتاب کو استعجاب سے دیکھتے ہیں پھر ان کی مطمئن نظریں آسمان کی طرف اٹھ جاتی ہیں اور وہ بے اختیار ملک مقبول احمد سے بغلگیر ہو جاتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

''میری ادبی زندگی کا یہ سب سے بڑا ایوارڈ ہے'' اس وقت مٹی کے دیئے کی لو بلند ہو رہی تھی، اس کی شعاعیں تا آسمان سفر کر رہی تھیں، زمین کا سورج ہفت افلاک کو منور کر رہا تھا۔ بلاشبہ یہ سعادت بزور بازو نہیں بلکہ خدائے بخشندہ کی عطا تھی۔ بلاشبہ مٹی کے دیئے کی لو روشن ہے۔''

''صحرانوردرد کے خطوط،، سے لے کر ''مٹی کا دیا'' تک میرزا ادیب کی جو کتابیں مقبول اکیڈمی سے شائع ہوئیں ان میں 'متاع دل' 'صحرانورد کے رومان' حسرت تعمیر' پس پردہ' 'بچوں کا ادب' 'شیشہ و سنگ' لہو اور قالین' وغیرہ شامل ہیں۔ میرزا صاحب نے اپنی کتابوں کے جملہ حقوق اشاعت مقبول اکیڈمی کے سپرد کر دیئے تھے۔ میرزا ادیب اب اس دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں لیکن میری کتابوں کی دنیا میں وہ زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ میرزا ادیب کے گھر پر ایک تقریب میں میری ملاقات جناب اصغر ندیم سیّد سے ہوئی۔ عالمی شہرت کے ڈرامہ نویس اور کالم نگار ہونے کے باوجود اصغر ندیم سیّد صاحب کا مزاج بھی میرزا ادیب ہی کی طرح نرم ہے۔ وہ نہایت شریف النفس انسان ہیں۔

Marfat.com

اے حمید

اے حمید سے میری پہلی ملاقات کو نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے' لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اردو کے اس نامور ناول نگار سے میری پہلی ملاقات ابھی ختم نہیں ہوئی' ہمارے درمیان باتوں کا سلسلہ جاری ہے۔ بلاشبہ وہ تخلیق کار ہیں اور میں ان کی کتابوں کا ناشر ہوں لیکن ہمارے درمیان جو رشتہ قائم ہے وہ محبت کا ہے اور یہ ایسی محبت ہے جو پہلی نظر میں ہی ہو جاتی ہے اور پھر ساری عمر اپنا جادو پھیلاتی رہتی ہے۔ اور دوسرا بندہ اس جادو کے اثر سے اس کی محبت میں گرفتار ہوتا چلا جاتا ہے۔

مقبول اکیڈمی نے ان کے پچاس سے زائد ناول شائع کئے ہیں۔ اس وقت بھی ان کی کتابوں کے کئی مسودے اشاعت کے لئے میرے پاس پڑے ہیں۔ ان کی بہت سی پرانی کتابوں کے کئی ایڈیشن چھپ کر ختم ہو چکے ہیں۔ آپ مقبول اکیڈمی کے اولین دور کے سرپرستوں میں سے ہیں۔ ان کی معرکہ آرا تصانیف ''کمانڈو'' ''بھارت کے فرعون'' ''وطن کے سرفروش'' ''کشمیر کے شاہین'' ''خزاں کی بارش'' اور ''کمانڈو کی بیٹی'' کی سیریز کو بہت پسند کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر طارق عزیز

ڈاکٹر طارق عزیز نرم دل' نرم خو' نرم مزاج اور حقیقی معنوں میں شریف النفس انسان ہیں۔ انہوں نے دوست نوازی کی صفات اپنے والد محترم سے ورثے میں پائیں اور ان کی تربیت کا فریضہ ان کی والدہ نے ادا کیا۔ میں جب کبھی انہیں ملنے کے لئے گیا وہ ہمیشہ خندہ پیشانی سے ملے اور پہلے سوال میں میری' میرے اہل و عیال کی اور میرے ادارے مقبول اکیڈمی کی خیریت دریافت کرتے اور اس کی ترقی کا حال پوچھتے ہیں۔ میں جب اپنی نئی کتابیں پیش کرتا ہوں تو ان کا چہرہ گلاب کے پھول کی طرح کھل اٹھتا ہے؟ اور صاف نظر آتا ہے کہ کتاب ان کی پہلی اور آخری

Marfat.com

محبت ہے۔ مجھے اس بات پر بھی فخر ہے کہ میری کتاب ''سفر جاری ہے'' کا نام انہوں نے ہی تجویز کیا تھا اور دلیل یہ دی تھی کہ اس نام میں زندگی بھی ہے' اور تحرک بھی اور مقبول اکیڈمی کا سفر ابھی جاری ہے۔ ''سکڑتا ہوا آدمی''، ''بسیرا'' اور ''نئی ادبی جہتیں'' ان کی گراں قدر تصانیف ہیں، جو مقبول اکیڈمی نے شائع کی ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید

انور سدید انتہائی مخلص اور ہمدرد انسان ہیں۔ آپ ان سے پہلی مرتبہ ملیں تو ان سے جدا ہوتے وقت آپ کو احساس ہوگا کہ یہ شخص تو مدتوں سے آپ کے لاشعور میں موجود تھا۔ یہ ان کے انسانوں کے درمیان ''فرشتہ'' ہونے کی دلیل ہے۔ وہ مجھے بھائیوں جیسی محبت دیتے ہیں۔ بہت تقاضوں کے بعد سال میں ایک کتاب عطا فرماتے ہیں۔

انہوں نے اظہر جاوید صاحب کے رسالہ ''تخلیق'' کے پرنٹر عزیز بخاری کو ان کی وفات پر خراجِ تحسین پیش کیا تو ایک مقام پر اس ناچیز کے بارے میں بھی اظہار خیال کیا۔ انور سدید لکھتے ہیں۔

> ''میں کثیر الاشاعت مصنف نہیں ہوں، اس لئے میرا ربط و تعلق اردو بازار کے پیشہ ور ناشرین سے کبھی پیدا نہیں ہوا۔ مجھے صرف ملک مقبول احمد سے واسطہ پڑا تھا جو مقبول اکادمی کے مالک ہیں اور انہوں نے کاروباری امور ایک ہی مرتبہ اپنے اصولوں کے مطابق طے کر دیئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ گزشتہ ربع صدی کے دوران انہوں نے میری جتنی کتابیں شائع کی ہیں ان اُصولوں پر آنچ نہیں آنے دی، حتیٰ کہ اب یہ کاروباری تعلق دوستی میں تبدیل ہو گیا ہے۔ وہ کتاب چھاپنے میں دیر نہیں کرتے، نئی کتاب کا تقاضا بھی میرے غریب خانے پر آ کر کرتے ہیں اور اشاعتی حقوق بالالتزام ادا کرتے ہیں تو مجھے ان سے رقم لیتے ہوئے تامل ہی نہیں ہوتا بلکہ تعلق داری کے منافی بھی محسوس ہوتا ہے''

Marfat.com

وہ بنیادی طور پر انجینئر ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد صحافت کے شعبے میں آ گئے اور اب روزنامہ ''نوائے وقت'' سے وابستہ ہیں۔ ادب سے آپ کا گہرا شغف ہے۔ پچاس سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں اور ادب ہی ان کی پہچان ہے۔ میں نے اتنے شیریں طبع انسان کم دیکھے ہیں۔ ہر چھوٹا بڑا لکھنے والا ان کا نام تعظیم سے لیتا ہے جیسے وہ ان کا ''شاگرد'' رہا ہو۔

زندگی کی ہر جہت میں رواں دواں یہ بے غرض انسان میرے علم و یقین کے مطابق ہر محفل میں احترام اور عقیدت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ علم و ادب کی ہر صنف میں ہر فن مولا ہیں۔ خدا انہیں علم و ادب کی خدمت کے مزید مواقع عطا کرے۔ مقبول اکادمی نے ''جدید نظم کے ارباب اربعہ''، ''بر سبیل تنقید''، ''اُردو نثر کے آفاق''، ''شاعری کا دیار''، ''پرندہ سفر میں''، ''ایک صدی کے افسانے''، ''بیسویں صدی کی اُردو شاعری''، ''زندہ لوگ''، ''خطوط کے آئینے میں''، ''دلی دور نہیں''، ''اُردو افسانہ عہد بہ عہد'' اور ''دلا ور فگاریاں'' کے علاوہ ان کی متعدد کتابیں شائع کی ہیں۔

علی سفیان آفاقی

علی سفیان آفاقی بظاہر ایک شخص کا نام ہے، لیکن عملی زندگی میں وہ کثیر الجہات شخصیت ہیں اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ اعلیٰ درجے کے ادیب ہیں، سفرنامہ نگار ہیں، صحافی ہیں یا فلم ساز ہیں۔ ان کی شخصیت میں یہ سب شعبے درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے ہیں۔

مجھے ان کے سب سے زیادہ سفرنامے شائع کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ وہ خود اور ان کی اہلیہ محترمہ دونوں ہی خوش اخلاق انسان ہیں۔ میں جب بھی ان کے ہاں اپنے کام کی خاطر گیا ہوں ان کی تواضع سے فیض یاب ہوا۔ بھابھی بہترین قہوہ اور کافی بناتی ہیں اور اس میں چینی کی بجائے ''خلوص'' ملا دیتی ہیں۔ اللہ کریم ان کو خوش و خرم رکھے۔ آفاقی صاحب کی کتابیں ''پیرس کی گلیاں''، ''یورپ کا کوہ قاف''، ''خوابوں کی سرزمین''، ''دورانِ سفر''، ''یورپ کی الف لیلیٰ''، ''دیکھ لیا امریکہ''، ''طلسمات فرنگ'' وغیرہ مقبول اکیڈمی نے شائع کی ہیں۔

Marfat.com

طارق اسمٰعیل ساگر

ساگر جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں سمندر کو کہا جاتا ہے لیکن طارق اسمٰعیل کی طبع میں سمندر کی لہروں جیسی بلاخیز روانی اور تلاطم خیزی نام کو بھی نہیں ، وہ تالاب کے ساکن پانیوں جیسی شفاف اور ٹھہری ہوئی طبیعت کے مالک ہیں۔ ان کے ناولوں کو بہت پسند کیا جاتا ہے۔ کوئی صاحب ذوق جب کسی کتابوں کی دکان میں داخل ہو تو وہ شوکیس میں سجے ہوئے ساگر صاحب کے ناولوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ وہ معاملات کے کھرے ہیں اور پبلشروں پر الزام دھرنے کی عادت میں مبتلا نہیں۔ آخری سگنل کی کہانی، اپریشن بلیو سٹار، تھرڈ ایجنسی، آن دی ریکارڈ، پھندا، گرفت اور سازش، ان کی مشہور تصانیف مقبولؒ اکیڈمی نے شائع کی ہیں۔

حفیظ تائبؒ

حفیظ تائب نعتِ رسول مقبول ﷺ کہنے والوں میں ایک معتبر نام ہے۔ یوں تو ہر غزل نگار نعت بھی کہہ لیتا ہے لیکن حفیظ تائب نے جب نعت گوئی شروع کی تو غزل اور نظم کی شاعری ترک کر دی چنانچہ انہیں اس دور میں نعت گوئی کا امام تسلیم کر لیا گیا تھا۔ وہ صوفی منش انسان تھے اور درویشانہ مزاج رکھتے تھے۔ جب کبھی آپ اپنے بھائی عبدالمجید منہاس کے ہاں جاتے تو وہ اس طرح لپک کر آپ کی پذیرائی کرتے جیسے کوئی ولی اللہ ان کے گھر آ گیا ہو۔ جو شخص "بعد از خدا بزرگ......کی دن رات نعت کہتا ہو، وہ اللہ کا دوست ہوتا ہی ہے۔

سرطان جیسے مہلک مرض کے دوران میں منہاس صاحب حفیظ تائب کو اپنے گھر لے گئے۔ اس مرض سے جاں بر نہ ہو سکے تو منہاس صاحب کے گھر سے ہی ان کا جنازہ اٹھا۔ میں جب بھی ان سے ملنے جاتا تو میں ان کے پلنگ پر بیٹھ کر ان کی ٹانگیں دباتا اور دلی سرور حاصل کرتا لیکن وہ جذبات سے مغلوب ہو جاتے اور اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکتے۔ آخری دنوں میں رقت

Marfat.com

کی کیفیت ہر وقت طاری رہنے لگی۔ انہیں مسلسل تکلیف میں دیکھ کر میری اور منہاس صاحب کی آنکھیں آنسوؤں سے جھلک پڑتیں۔ آخر ایک دن زیرِ لب درود پڑھتے ہوئے دنیا سے اٹھ گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے (آمین)

ڈاکٹر صفدر محمود

ڈاکٹر صفدر محمود صاحب کو تاریخ پاکستان کا مؤرخ ہونے کا شرف حاصل ہے اور وہ پاکستان کی تاریخ و سیاست پر ایک درجن سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ انہوں نے حکومت پاکستان کے بڑے بڑے عہدوں پر ایمانداری اور فرض شناسی سے خدمات انجام دیں اور نیک نامی کمائی۔ تاریخ و سیاست کے حوالے سے ان کی کتابوں کو بہت مقبولیت حاصل ہے۔ ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر حکومت نے انہیں ستارہ حسن کارکردگی عطا کیا۔ ڈاکٹر صاحب ایک معروف کالم نگار بھی ہیں اور قومی خدمت سے سرشار ہیں۔ میں ان کے علم و فضل اور اعلیٰ علمی و ادبی صلاحیتوں کا مداح ہوں، ڈاکٹر صاحب کی ایک کتاب ''پاکستان کی اہم سیاسی جماعتیں'' مقبول اکیڈمی نے شائع کی تھی۔

شعیب بن عزیز

اب اُداس پھرتے ہو، سردیوں کی شاموں میں
اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں

اس شعر کے خالق شعیب بن عزیز ہیں۔ وہ دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے بھی ...ست شمار ہوتے ہیں۔ اعلیٰ سرکاری افسر ہیں اور اب بھی ایک بڑے عہدے پر فائز ہیں لیکن ...اور محبت ان کے ذاتی تشخص کی پہچان ہے۔ دفتری کام کے علاوہ آپ کو صرف اور صرف ...م و ادب سے لگاؤ ہے۔

Marfat.com

امجد اسلام امجد

ٹی وی ڈرامہ ''وارث'' کے لکھنے والے امجد اسلام امجد صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ہر پڑھا لکھا آدمی آپ کے نام سے بخوبی واقف ہے۔ میرا ان سے ذاتی تعارف نہیں ہے، میرے بیٹے ڈاکٹر ارشد مقبول سے ان کے تعلقات ہیں۔ ''کہکشاں'' کے نام سے انہوں نے شاعری کا ایک انتخاب کیا ہے جسے شائع کرنے کا شرف مقبول اکیڈمی کو حاصل ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی

ڈاکٹر وحید قریشی اردو زبان و ادب کے نامور محقق، ممتاز تنقید نگار، شاعر اور دانشور تھے۔ میں ان کا شمار ایسی ادبی شخصیات میں کرتا ہوں جن کا نام لیتے ہی گردن ادب سے جھک جاتی ہے اور جن کی مجالس میں بیٹھنے والوں کو ان کی باتیں سن کر ان کی اپنے ذہن پر روشنی پھیلتی چلی جاتی ہے۔ انہیں استادالاساتذہ تسلیم کیا جاتا ہے تو اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان سے تعلیم حاصل کرنے والے بھی اب خود اساتذہ کے درجے پر فائز ہیں اور علم کی دولت کو پھیلا رہے ہیں۔ میں جب کبھی ان سے ملاقات کے لئے حاضر ہوا تو بھاری بھرکم وجود کے ساتھ کرسی سے اٹھ کھڑے ہوتے اور بڑی محبت سے کبھی مصافحہ اور کبھی معانقہ کرتے۔ مقبول اکیڈمی کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے ڈاکٹر صاحب کی کتابیں ''جدیدیت کی تلاش میں'' ''افسانوی ادب'' اور ''پیش دستیاں'' شائع کی ہیں۔

مولانا حامد علی خان

مولانا حامد علی خان کے ساتھ میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب مقبول اکیڈمی لاہور میں اپنا مقام بنا چکی تھی اور اس کی چھپی ہوئی کتابوں پر ملک کے طول و عرض کے ادبی رسائل میں شاندار تبصرے چھپ رہے تھے۔ مولانا حامد علی خان سادہ طبع انسان اور ہمدرد خلائق شخصیت تھے۔ مقبول اکیڈمی کی چھپی ہوئی کتابوں کی انہوں نے ہمیشہ قدر افزائی کی اور کتاب چھپ کر آتی تو

Marfat.com

اس کی تحسین خط لکھ کر کرتے۔ میں کبھی دفتر میں حاضر ہوتا تو اٹھ کر ملتے اور جتنی دیر وہاں بیٹھتا صرف کاروباری باتیں ہی کرتے۔ دفتر کے اوقات میں گپ شپ لگانا ان کے لئے کفر تھا۔ تاہم وہ تنگ مزاج یا تنگ نظر نہیں تھے۔ مسکراتے تو ان کی خوشی کا سامنے بیٹھے ہوئے شخص کو احساس ہو جاتا۔ میں نے ان کو قہقہہ مارتے کبھی نہیں دیکھا۔

مکتبہ فرینکلن نے امریکی کتابوں کے تراجم مقامی ناشرین کے تعاون سے چھاپنے شروع کئے تو مولانا حامد علی خان نے ہمارے استحقاق پر اس ادارے کی کتابیں ہمیں بھی شاعت کے لئے دیں۔ ایک سال مقبول اکیڈمی نے سب سے زیادہ کتابیں شائع کیں تو مولانا نے اس کی تحسین ایک خط سے کی جو اس کتاب میں درج ہے۔ ان کا یہ خط ہمارے لئے تمغۂ امتیاز ہے۔

سید قاسم محمود

میرے بڑے پرانے اور پیارے دوست ہیں۔ بڑے ذہین اور عظیم دانشور ہیں۔ علم و ادب کے فروغ کے لئے نئی نئی سکیمیں سوچتے رہتے ہیں۔ وہ چلتی پھرتی انسائیکلو پیڈیا ہیں۔ کراچی میں رہائش پذیری کے دوران جب کبھی لاہور آتے تو ضرور شرف ملاقات بخشتے اور اپنے قیمتی مشوروں سے مستفید کرتے۔ لیکن جب سے لاہور مستقل قیام پذیر ہوئے ہیں تو ان کی مصروفیات بہت بڑھ گئی ہیں اور ان کے چاہنے والے ان کی صورت دیکھنے کو ترس گئے ہیں۔ تاہم ان کا تصنیفی، تالیفی اور ادارتی کام ہر ماہ منظر عام پر آ جاتا ہے اور ان کی یادیں تازہ کر دیتا ہے۔

بلاشبہ سید قاسم محمود انسائیکلو پیڈیائی قلم کار تھے لیکن انہوں نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا تخلیق کاری سے کی۔ افسانے اور ناول میں نام پیدا کیا۔ اس کے ساتھ ہی ترجمہ نگاری کی طرف آ گئے اور انگریزی کے کئی شاہکار ناول اور کتابیں اردو میں پیش کر دیں۔

Marfat.com

عبدالعزیز خالد

عبدالعزیز خالد انکم ٹیکس کے افسر تھے اور اس محکمے میں اعلیٰ ترین عہدے پر پہنچ کر ریٹائر ہوئے لیکن ان کی شہرت کی وجہ یہ ہے کہ وہ اعلیٰ درجے کے ادیب اور بلند پایہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مخلص اور بے غرض انسان بھی ہیں۔ انگریزی کے علاوہ کئی مشرقی زبانوں پر عبور رکھتے ہیں۔ جب کوئی قاری ان کی کتاب طلب کرتا ہے تو ساتھ ہی مختلف زبانوں کی لغت بھی طلب کرتا ہے کیونکہ ان کے کلام کی پوری تفہیم کے لئے عبدالعزیز خالد صاحب جیسا عالم ہونا ضروری ہے۔

خالد صاحب کو مجھ سے گلہ ہے کہ میں ان کی کتب کی مشتہری نہیں کرتا حالانکہ میں نے اس میں کبھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ میں ان کا بہت نیاز مند اور ممنون احسان ہوں۔ ان کی متعدد کتابیں شائع کرنے کا اعزاز مقبول اکیڈمی کو حاصل ہے۔ ان میں سخن ہائے آشنا، فرقان جاوید، شعلہ چنار، دشت شام، زرداغ دل، ماذ ماذ، کے علاوہ ''مہابھارت کتھن مالا'' بھی شامل ہے۔

ڈاکٹر علی محمد خان

ڈاکٹر صاحب کئی درسی اور تاریخی کتابوں کے مصنف ہیں۔ وہ شعبۂ تعلیم سے وابستہ ہیں، ان کے طلباان کا بہت احترام کرتے ہیں، اخلاق ومحبت سے پیش آنے والے اس بہت ہی پیارے اور مخلص انسان کی زندگی کتابوں سے عبارت ہے۔ طلباء میں آپ کی تصانیف کی بہت مانگ رہتی ہے۔ مقبول اکیڈمی نے ان کی جو کتابیں شائع کی ہیں، ان میں ''لاہور کا دبستانِ شاعری''، ''خواجہ حسن نظامی کے مضامین'' اور ''مضامین سرسید احمد خان'' قابل ذکر ہے۔

اظہر جاوید

اظہر جاوید صاحب رسالہ ''تخلیق'' کے ایڈیٹر ہیں۔ ان سے میرا کبھی کوئی کاروباری تعلق نہیں رہا۔ میں ان کی محبت اور خلوص کا اسیر ہوں۔ ان سے دوستی کا یہ رشتہ سالہا سال سے چل

Marfat.com

رہا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ان کا احسان مند ہوں کہ انہوں نے مقبول اکیڈمی کو کئی نامور مصنفین سے متعارف کرایا اور میرے حلقۂ مصنفین میں بے پناہ اضافہ کیا۔ بلاشبہ وہ مقبول اکیڈمی کی کامیابیوں میں ہمیشہ شامل رہے۔

ظفر علی راجا

ظفر علی راجا صاحب قانون کے ماہر ہیں لیکن علم و ادب سے بھی ان کا گہرا تعلق ہے۔ شاعری ان کی فطرتِ ثانیہ اور طنز و مزاح ان کی طبیعت کو تازگی عطا کرتا ہے۔ تعلقات نبھانے میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ میرا ان سے دوستانہ تعلق مرحوم خالد محمود (مشرق) کے توسط سے ہوا تھا جو آج تک قائم ہے۔ اور ان شاء اللہ ہمیشہ قائم رہے گا آپ حیران ہوں گے کہ ان کی کوئی کتاب شائع کرنے کا شرف مقبول اکیڈمی کو حاصل نہیں ہوا۔

قمر نقوی نقشبند

قمر نقوی ایک بلند پایہ ادیب، خوش گو شاعر، مستند عالم دین اور ماہر شکاریات ہیں۔ وہ بڑے زندہ دل اور ہنس مکھ انسان ہیں۔ آج کل وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ امریکہ میں مقیم ہیں اور وہاں سے ایک پرچہ ''روشنی'' کے نام سے جاری کیا ہوا ہے۔ چند برس قبل تک صرف قمر نقوی تھے لیکن ان کے نام کا ایک مقدس لاحقہ ''نقشبند،، بھی ہے۔ اس تقدس کے باوجود وہ کسی بھی شکار کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ شکار ان کی فطرت ثانیہ ہے وہ اسے ترک نہیں کر سکتے۔ اس ضمن میں ان کے کئی مسودات مجھے موصول ہو چکے ہیں، صحائف انبیاء، تین عظیم فلسفی، امریکہ میں شکار، شکار نامہ، شکار شاہکار، شکار بیتی، بھگت گڑھ کا آدم خور، عجیب لڑکی، راحلہ، مسافر اور اُردو شاعری کی آخری کتاب، مقبول اکیڈمی سے شائع ہو چکی ہیں۔ قمر نقوی صاحب نے مجھے ایک خط امریکہ سے منظوم لکھا تھا۔ یہ ان کی قادر الکلامی کا اعلیٰ نمونہ ہے اور اس کتاب کے آخر میں شامل ہے۔

Marfat.com

خواتین کی طرح وہ اپنی عمر کسی کو نہیں بتاتے، ہم نے ایک دفعہ بڑے ادب سے ان کی عمر کے بارے میں پوچھا۔ ہنس کر بولے: ''ابھی تو میں جوان ہوں'' اور اپنی تازہ ترین تصویر دکھائی جس میں وہ جوان بلکہ نوجوان نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر اللہ بخش ملک

ڈاکٹر اللہ بخش ملک صاحب بڑے عالی حوصلہ، بلند نظر، کشادہ ظرف اور مضبوط کردار کے سی ایس پی افسر ہیں۔ وہ خوش اخلاق، ملنسار اور عجز و انکسار کا مجسمہ اور غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک ایک عظیم انسان ہیں۔ ان سے ملیں تو یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ آپ کوئی بہت بڑے افسر ہیں۔ بلکہ ان کی شانِ بے نیازی سے ان کی داخلی عظمت کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی تین کتابیں شائع کرنے کا مقبول اکیڈمی کو شرف حاصل ہے۔ ''روشن چراغ''۔

The Higher Education in Pakistan

The Human Development Nexus

Freedom of Choice

راجا رشید محمود

راجا صاحب کافی عرصہ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ میں کام کرتے رہے ہیں۔ تاریخ اسلام ان کا خاص موضوع ہے۔ نعت رسول مقبول ﷺ داخلی عقیدت سے کہتے ہیں۔ نیک اور ہنس مکھ انسان ہیں۔ لوگ تو چائے میں چینی ڈال کر پیتے ہیں وہ چینی میں چائے ڈال کر نوشِ جان کرتے ہیں۔ ان کی کتاب نعت خاتم المرسلین ﷺ کے علاوہ ان کی بیٹی شہناز کوثر کی صدارتی ایوارڈ یافتہ کتاب ''حضور ﷺ کا بچپن'' بھی شائع کرنے کا شرف ہمیں حاصل ہے۔

Marfat.com

قاضی ذوالفقار احمد

قاضی صاحب میرے ہم عمر ہیں۔ میں جن فضاؤں میں پلا بڑھا وہ بھی انہی فضاؤں کے باسی ہیں۔ تمام زندگی درس و تدریس میں گزاری۔ اب محکمہ تعلیم سے ریٹائر ہو گئے ہیں اور کتابوں کی دنیا آباد کر لی ہے۔ اس دنیا میں مقبول اکیڈمی بھی ان کا ایک محبوب جزیرہ ہے۔ میں نے ان سے کلام اقبال کی شرحیں اور شرح دیوان غالب کے علاوہ ایک کتاب

افسوس یہ ہے کہ اپنے دور اقتدار میں اپنے ایک دوست چودھری حمید اللہ سے مل کر میرے مخالفوں کی اعانت کرتے رہے۔ مقبول اکیڈمی کی کبھی اخلاقی مدد بھی نہ کی۔ حالاں کہ مدرسی کے حوالے سے وہ میرے پیٹی بھائی بھی تھے۔ اس منفی رویے کے باوجود مجھے ان سے محبت ہے اور میں ان کا احترام کرتا ہوں وہ جب بھی اُردو بازار یا لوہاری گیٹ کسی کام کے سلسلہ میں آتے ہیں تو مقبول اکیڈمی ضرور آتے ہیں اور میری پیشکش پر بغیر چینی کی چائے پیتے ہیں۔ اللہ ان کو خوش رکھے۔

رحمان مذنب

رحمان مذنب کا نام میں نے پہلی دفعہ سنا تو سوچ میں پڑ گیا کہ یہ کیسا شخص ہے کہ ایک طرف اس کا نام "رحمان" سے شروع ہوتا ہے' دوسری طرف وہ خود اپنے "مذنب" ہونے کا اعلان کر رہا ہے۔ ان سے ملاقات ہوئی تو یہ سوال کرنے کی جرأت ان سے نہ ہوئی لیکن ان کی باتوں سے جو انکسار جھلکتا تھا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ از سر تا پا مسکین طبع انسان ہیں۔ اللہ کی ایک صفت عالیہ ان کی شخصیت کا حصہ ہے' لیکن دوسری طرف بندہ ہونے کے ناطے اپنے گناہگار ہونے کا اعتراف بھی کرتے ہیں۔

رحمان مذنب صاحب ایک اعلیٰ درجے کے ادیب، افسانہ نویس اور ڈرامہ نگار تھے وہ بے حد خوش خلق انسان تھے۔ ان کے ظاہر اور باطن اور قول و فعل میں تضاد نہیں تھا۔ جیسے صاف گو اور مخلص نظر آتے تھے، ویسا ہی ان کا داخلی کردار تھا۔ مقبول اکیڈمی پر تشریف لاتے تو چائے کی

Marfat.com

بجائے مالٹے کا رس طلب فرماتے۔ مجھے ان کی بے تکلفی اچھی لگتی تھی۔ تہذیب وتمدن اور اسلام اور بچوں کی الف لیلہ، وغیرہ کئی کتب شائع کرنے کا مقبول اکیڈمی کو اعزاز حاصل ہے۔

ساغر صدیقی

صحن چمن میں ساغر کس نے
پھینک دیئے ہیں پھول مسل کے

اس شعر کا خالق ساغر صدیقی غزل کا ایک مشہور شاعر تھا۔ اس کی شاعری میں زندگی کا حقیقی تجربہ موجود تھا۔ اس کی غزل نوائے سروش تھی۔ زندگی کے راستے سے اکھڑا تو ساغر صدیقی کی زندگی سگریٹ کا ایک کش بن کر رہ گئی۔ وہ زندگی کے آخری ایام میں گیلانی پریس کے مالک سید مبارک علی شاہ کے صاحبزادوں کے ہاں بوریا بچھا کر وقت گزارتا تھا اس کا یہ مسکن چونکہ مقبول اکیڈمی کے قریب تھا۔ اس لئے آتے جاتے اپنی فقیرانہ اور درویشانہ صدا بلند کرتا اور اپنی موجودگی کا احساس دلاتا۔

زندگی جبرِ مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

قلندر ساغر صدیقی اس قسم کا شعر گنگناتا ہوا آتا اور ہمیشہ بیس روپے کا مطالبہ کرتا۔ نہ کم نہ زیادہ۔ اتنی رقم میں اس کا کام چل جاتا تھا، اسے تھوڑی سی پینی اور کچھ کھانا ہوتا تھا تاکہ اس کے اعصاب کو سکون ملے اور زمین پر بچھی چٹائی پر اس کی ہڈیاں چٹخیں تو درد نہ کریں اور نہ اپنے خلاف ہونے والی باتیں اسے سنائی دیں۔ ساغر صدیقی نے صرف ایک مرتبہ مجھ سے سو روپے طلب کیے۔ میں نے اس کی فرمائش پوری کر دی۔ اس رقم کو معاوضہ شمار کرتے ہوئے وہ مجھے اپنی ایک چھوٹی سی کتاب ''ناقۂ لیلیٰ'' اشاعت کے لئے دے گیا۔ گویا اس نے میرا احسان قبول نہ کیا۔

Marfat.com

ناصر نقوی

ناصر نقوی بنیادی طور پر سیاستدان ہیں لیکن وہ سیاست کے پیشے میں نہیں آئے اور اس کے برعکس صحافت کو اپنی زندگی کا وسیلہ بنایا جو سیاستدانوں کی بدعنوانیوں اور عوام دشمن حرکات کو بے نقاب کرتی ہے۔ ناصر نقوی میرے بڑے بے تکلف دوست ہیں۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ڈرامے لکھتے ہیں اور ڈرموں میں خود کام بھی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ کرتے ہیں۔ آپ ان سے ملیں تو آپ یہی محسوس کریں گے کہ وہ شاید کچھ بھی نہیں کرتے۔ انتہائی سادہ مزاج اور زندہ دل انسان ہیں۔ ان کی کتابیں ''عالمی معلومات''، ''اسلامی ممالک'' ''معلومات پاکستان''، ''اسلامی معلومات'' اور ''تحریک پاکستان'' مقبول اکیڈمی نے شائع کی ہیں۔

سید واجد رضوی

سید واجد رضوی پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے، لیکن ان کی زندگی کا نصب العین دین اسلام کی اقدار اور اسوۂ رسول اکرم کا فروغ تھا۔ اس مقصد کے حصول کیلئے انہوں نے تبلیغ کا روایتی طریقہ اختیار نہیں کیا بلکہ وہ پڑھے لکھے لوگوں کے بند ذہنوں کے بند دروازوں پر دستک دینے اور ان کی عقل سلیم کو جگانے کیلئے تصنیف و تالیف کی طرف آ گئے۔ اس مقصد کے حصول کیلئے ہی انہوں نے تعلیمی اداروں کی سرپرستی اختیار کی اور اتحاد ملی کے لئے فلاحی ادارے قائم کئے۔ اور ان کی آبیاری میں اپنی جائز آمدنی کا بیشتر حصہ صرف کر دیا اور نقصان مایہ کی پروا نہ کی۔

کسی زمانے میں آپ ''تحریک استقلال'' کے سیکرٹری بھی رہے ہیں۔ مذہب و ملت اور ملک و وطن کی بہبود و بہتری کے موضوعات پر کئی اُردو انگریزی کتب کے مصنف تھے۔ انہوں نے دو تین ٹرسٹ قسم کے اداروں اور فلاح و بہبود کی انجمنوں، تنظیموں وغیرہ کی سرپرستی کی۔ آپ کے اپنے ادارے ''اتحادِ ملی پاکستان'' کی ملک کے اندر اور باہر کئی شاخیں قائم ہیں اور اتحاد ملت کے لئے کام کر رہی ہیں۔ وہ انتہائی شریف اور مخلص انسان تھے۔ مذہب و ملت کی خدمت ہی ان کا

Marfat.com

اوڑھنا بچھونا تھا۔ ''پیغمبر رحمت صلی اللہ علیہ وسلم''، ''ذوقِ جہاد''، ''زوالِ ملت'' اور ''نشاۃ ثانیہ''، ''احسن طرز حکمرانی''، ''نظریہ پاکستان''۔

- ☆ Islam & Good Governance.
- ☆ War & The Laws of War in Islam
- ☆ The Basic Problems of Mankind

شائع کرنے کا شرف مقبول اکیڈمی کو حاصل ہے۔

ابوالامتیاز ع، س، مسلم

ان کا پورا نام عبد الستار مسلم ہے۔ پہلے کراچی میں قیام تھا، اور ایک ادبی رسالہ ''نیا راہی'' نکالتے تھے۔ پھر اپنے بچوں کے پاس دوبئی چلے گئے۔ تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے ہیں اور ادب میں اعلیٰ مقام حاصل کر چکے ہیں۔ خدمت خلق کے کئی اداروں سے منسلک ہیں۔

فلاح عامہ کے کاموں میں بھرپور حصہ لیتے ہیں۔ حمد و نعت اور بے شمار اسلامی کتب کے مصنف ہیں۔ ان کتابوں میں سے ''اللہ و رسول ﷺ'' کعبہ و طیبہ، زمزمۂ اسلام، زمزمہ درود، حمد و نعت، کاروان حرم، برگ تر، کی اشاعت کا شرف مقبول اکیڈمی کو حاصل ہے۔

غلام الثقلین نقوی

سفرنامہ ''چل بابا اگلے شہر'' کے خالق غلام الثقلین نقوی صاحب اُردو کے بلند پایہ افسانہ نگار تھے۔ قدرت نے انہیں نفسِ مطمئنہ عطا کیا تھا اور وہ اغراض و مفادات سے پاک اس دنیا میں بے لوث زندگی گزار گئے۔ مقبول اکیڈمی پر تشریف لاتے تو دل کو ایک عجیب سی فرحت محسوس ہوتی۔ میں نے ان جیسے شریف انسان کم دیکھے ہیں۔ ان کے افسانوں کے کردار بھی شرافت با مجسم اور اقدار کے محافظ نظر آتے ہیں۔

Marfat.com

ڈاکٹر مسکین علی حجازی

مسکین علی حجازی مرنجاں مرنج قسم کے انسان تھے۔ ایک شگفتہ مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر ہمہ وقت طاری رہتی۔ ایک سچے پاکستانی کی حیثیت میں انہوں نے اقبال اور قائداعظم کے افکار اپنے شاگردوں کے دل میں اُتارنے کی کوشش کی اور انہیں ایک مخلص پاکستانی بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ مسکین حجازی طلبا کو تعلیم بھی دیتے تھے اور ان کی شخصیت سازی اور کردار سازی بھی کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب سے میرے تعلقات خالد محمود صاب کے ذریعے سے قائم ہوئے اور پھر ان سے محبت کا سلسلہ بڑھتا چلا گیا۔ حجازی صاحب ہمدرد اور دوست نواز انسان تھے۔ میں انہیں اپنے محسنوں میں شمار کرتا ہوں۔ 1965ء کی جنگ پر میں نے ان کی ایک کتاب ''آزمائش کی گھڑی'' شائع کی تھی۔

پروفیسر رفیع اللہ شہاب

وہ بڑے عالم فاضل اور محقق تھے۔ اپنے مخصوص مسلک کے باوجود بڑے معتدل انسان تھے۔ آخر دم تک ان سے ہمارے تعلقات نہایت خوش گوار رہے۔ معاملے کے بہت کھرے تھے۔ ایک دفعہ جو معاملہ طے ہو گیا آخر تک اس پر عمل ہوتا رہا۔ دوستانہ ماحول میں اگر انہیں کسی وقت کچھ روپوں کی ضرورت پڑی، تو میں نے ''حساب دوستاں در دل'' کے مصداق پیش کر دیئے۔ ان کی بہت سی کتب شائع کرنے کا مقبول اکیڈمی کو شرف حاصل ہے۔ چند کتب یہ ہیں ''سیرت ابن اسحاق'' پیارے رسولؐ، پیغمبر اسلام ﷺ، راہنمائے تلاوت قرآن، عورتوں کے اسلامی حقوق، پاکستان کے پچاس سال، وغیرہ اس کے علاوہ میں نے ان کی چند انگریزی کتب بھی شائع کی ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں۔

Marfat.com

Fifty Years of Pakistan-- Eminent Sihaba Islamic Civilization-- Allama Iqbal on Islamic Thought-- Genesis of Pakistan

ڈاکٹر ایم۔ایس۔ناز

ڈاکٹر ایم۔ایس۔ناز میرے بہت ہی پیارے اور دیرینہ دوست ہیں۔وہ عالم فاضل اور باکمال افراد میں شامل ہیں۔اپنی کتابوں کی تصنیف و تالیف پر پوری توجہ دیتے ہیں اور تحقیق سے کام لینے کی عادت نے انہیں منفرد بنا دیا ہے۔ان کی تصنیفات اور تالیفات سند کا درجہ رکھتی ہیں۔اپنی تمام تر انسانی خوبیوں کے باوجود ابنائے عہد اور آپس کے معاملات کو کبھی کبھی نظر انداز کر دیتے ہیں حالانکہ وہ لازمی طور پر ان کی اہمیت سے آگاہ ہوں گے۔ڈاکٹر ناز صاحب کی کئی کتابیں مقبول اکیڈمی نے شائع کی ہیں۔ان میں شاہ ولی اللہ، علم حدیث، ارمغان مجدد، شاہ فیصل شہید، انسائیکلو پیڈیا اصحاب النبیؐ، حضرت اویس قرنیؓ، تصویر کشمیر، کشمیر عہد بہ عہد، کلام اقبال اور تحریک آزادی، لاہور نامہ اور ذوالفقار علی بھٹو وغیرہ شامل ہیں۔ڈاکٹر ناز کی کتاب ذوالفقار علی بھٹو کی رونمائی مولانا کوثر نیازی نے کی تھی جس میں کئی نامور ہستیوں نے شرکت کی۔

حمید کاشمیری

حمید کاشمیری سے میرے تعلقات بڑے گہرے اور پرخلوص تھے۔میں کراچی جاتا تو ان کی میزبانی سے فیضیاب ہوتا۔وہ انسانوں سے تعلقات خلوص و محبت کی بنا پر رکھنے والے انسان تھے۔انہوں نے اپنی کئی کتب مقبول اکیڈمی کو برائے اشاعت عطا فرمائیں۔

حمید کاشمیری صاحب کی وساطت سے میں محترمہ حسینہ معین اور ہاجرہ مسرور صاحبہ سے ملا۔ان خواتین نے میری پذیرائی انتہائی خلوص سے کی اور مجھے نوازنے میں بڑی فیاضی سے کام لیا۔حسینہ معین صاحبہ نے مجھے ''پل صراط کا سفر'' اور محترمہ حاجرہ

Marfat.com

مسرور نے "سب افسانے میرے" شائع کرنے کے لیے مرحمت فرمائیں۔ حمید کاشمیری صاحب کے حوالہ سے ہی میں فاطمہ ثریا بجیا صاحبہ کے گھر بھی گیا۔ وہ بڑے اخلاق اور محبت سے پیش آئیں، ان دنوں ثریا بجیا کا ایک ناول قسط وار ایک ڈائجسٹ رسالے میں چھپا تھا۔ میں نے یہ ناول اشاعت کے لئے حاصل کرنا چاہا لیکن وہ افسوس کرنے لگیں کہ اس کی نقل دستیاب نہیں تھی۔ حمید کاشمیری کی جو کتب ہمارے ادارے سے شائع ہوئیں، ان میں "سرحدیں" دیواریں" "ادھورے خواب" کافی ہاؤس اور "منٹو ادبی عدالت میں" شامل ہیں۔

زاہد حسین انجم

انجم صاحب ایک نہایت اچھے انسان اور اعلیٰ پائے کے مدون ہیں۔ انہوں نے بڑی قیمتی کتب مرتب کی ہیں۔ جو اب بھی حوالے کا کام دیتی ہیں۔ وہ جس کام کی حامی بھرتے ہیں اسے محنت سے سرانجام دیتے ہیں۔ کسی بھی عنوان اور موضوع کے تحت متعدد [illegible] کی کتاب مرتب کرنا ان کا کمال ہے۔ مقبول اکیڈمی کے لئے انہوں نے ایک ضخیم "قائداعظم انسائیکلوپیڈیا" مرتب کی تھی۔

اختر شمار

ڈاکٹر اختر شمار ملتان سے لاہور وارد ہوئے تو سب سے پہلے انہوں نے مقبول اکیڈمی میں قدم رنجہ فرمایا اور مجھ سے ملنے کے لئے تشریف لائے۔ لاہور میں ہی "بجنگ آمد" کا نعرہ لگا کر معرکے مارنے لگے۔ شاعری کے کئی میدان سر کئے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کے بعد تو اختر شمار ستاروں پر کمندیں ڈالنے لگے ہیں۔ میرے ساتھ ان کا خلوص کا رشتہ قائم ہے۔

ڈاکٹر اختر شمار معاشرے کو تنقیدی آنکھ سے دیکھنے والے ادیب ہیں، وہ مثبت نقطہ نظر کے دانشور ہیں اور تعمیری تنقید میں یقین رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے تہذیبی اور معاشرتی تصورات کو اپنے کالموں میں پیش کیا۔ ان کی تین کتابیں "میں بھی پاکستان ہوں" "ہم زندہ قوم ہیں" اور

Marfat.com

''خطوں میں دفن محبت'' مقبول اکیڈمی سے شائع ہوئی ہیں۔

اعتبار ساجد

اعتبار ساجد اردو ادب میں استقلال اور مسلسل محنت کی مثال ہیں۔ میں نے انہیں جب بھی دیکھا کتاب در بغل اور نئی کتاب کا مسودہ در دست ہی دیکھا۔ اور میں یہ فیصلہ نہ کر سکتا کہ وہ پڑھتے زیادہ ہیں یا لکھتے زیادہ ہیں۔ لیکن ایک بات واضح ہے کہ انہوں نے اپنی بسیار نویسی کو اپنے معیار پر غالب نہیں آنے دیا۔ ان کی ہر کتاب معیار کے لحاظ سے ان کے ارتقاء کا اگلا قدم ہوتی ہے اور مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ مرزا غالب کے اس مصرعے کا تعاقب کر رہے ہیں:

''ہے کہاں تمنا کا آخری قدم یا رب؟''

اعتبار ساجد خوش مزاج اور زندہ دل انسان ہیں۔ انہوں نے مزاحیہ ادب میں نام پیدا کیا ہے۔ قاری کو ان کی نئی کتاب کا انتظار رہتا ہے۔ میرے ساتھ ان کے تعلقات برادرانہ ہیں۔ ان کی کتابیں ''کارستانیاں''، ''یہ عالم شوق کا'' اور ''آپ کا نیازمند'' قارئین نے بہت پسند کی ہیں۔

پروفیسر عبدالعلیم صدیقی

صدیقی صاحب جب گورنمنٹ کالج پلندری میں پرنسپل تھے تو اس وقت سے ان کے ساتھ میرے تعلقات ہیں۔ وہ بہت مخلص دوست اور قابل انسان ہیں۔ طبیعت میں شرافت اور انکساری کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ علامہ اقبال کی تمام فارسی کتب کا انہوں نے منظوم ترجمہ کیا ہے۔ کلیات اقبال (فارسی) کے منظوم ترجمہ پر آپ کو صدارتی ایوارڈ ملا ہے۔ کلیات اقبال (فارسی) کی تقریب رونمائی ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال کی زیر صدارت ہوئی۔ عبدالعلیم صدیقی صاحب کی جملہ کتب چھاپنے کا شرف مقبول اکیڈمی کو حاصل ہے۔

Marfat.com

منصور احمد بٹ

منصور احمد بٹ صاحب ایک نوجوان لیکن بہت محنتی قلم کار ہیں۔ وہ بڑی لگن سے کتاب مرتب کرتے ہیں۔ ان کی دو کتب پر ایوارڈ برائے حسن کارکردگی اور دو کتب پر صدارتی ایوارڈ مل چکے ہیں۔ مقبول اکیڈمی سے انہیں خاص لگاؤ ہے۔ اور مجھے بھی ان سے بڑی محبت ہے۔ "قائداعظم محمد علی جناح" "غزوات اسلام" "مسلمان سائنس دان" کے علاوہ انہوں نے بچوں کیلئے بھی کئی کتابیں لکھی ہیں جو مقبول اکیڈمی نے شائع کی ہیں۔

پروفیسر عثمان علی

پروفیسر صاحب گلگت میں مقیم ہیں۔ وہ ایک ممتاز ماہر تعلیم، مشہور قلم کار اور ایک محب وطن پاکستانی ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ ایک پر خلوص انسان ہیں۔ مقبول اکیڈمی کو ان کی کئی کتب مثلاً جلوۂ قراقرم، گلگت کی روگ کہانی، گلگت اور نظریہ آزادی، خطہ قراقرم شائع کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ مجھے ان کے برادرانہ تعلقات پر فخر ہے۔

ستار طاہر

ستار طاہر قلم کا مزدور تھا۔ بے تکان لکھنے والا مصنف اور ہر موضوع پر حاوی قلم کار ترجے کو تخلیقی درجہ دینے والا ادیب۔ ان سے بہت عرصہ تک ہمارے تعلقات استوار رہے اور بہت خوشگوار ماحول میں ہماری کاروباری دوستی قائم رہی۔ اپنی کتاب کی طے شدہ رائلٹی عام طور پر وہ پیشگی ہی لے جایا کرتے تھے لیکن ہمیشہ ضرورت مند رہتے تھے۔ اس لئے رائلٹی کے علاوہ بھی تقاضا کرتے تو میں نے کبھی انکار نہیں کیا۔ ان کی یہ کتب ہم نے شائع کی ہیں۔ عالم اسلام کا فکری انقلاب، پاکستان کا سیاسی سفرنامہ، تعزیت نامے، آزادی سے پہلے، محبت کے چار ناول اور غریب کی جورو۔

Marfat.com

خالد محمود

خالد محمود صاحب سے میرے تعلقات اس وقت پیدا ہوئے جب وہ روزنامہ ''کوہستان'' میں نسیم حجازی کے ساتھ کام کرتے تھے، وہ نہایت مخلص انسان اور بے حد دوست نواز تھے، مجھے یاد پڑتا ہے کہ روزنامہ کوہستان میں انہوں نے میرا ایک انٹرویو غالباً 66-1965ء میں بھی شائع کیا تھا۔ وہ مقبول اکیڈمی کے ابتدائی دور کے ساتھیوں میں سے تھے اور آخر دم تک ان سے تعلقات استوار رہے، انہیں کے ذریعے نسیم حجازی صاحب سے ملاقاتیں ہوتی رہیں، ظفر علی راجا صاحب سے بھی ان کی وساطت سے ہی تعلقات قائم ہوئے۔ جواب تک بڑی خوش اسلوبی سے چل رہے ہیں۔ خالد محمود مرحوم کی تصنیفات ''رن کچھ سے چونڈہ تک'' ''داتا گنج بخش اور ان کا عہد'' ''ملکہ بغداد'' اور ''آنگن پودے'' مقبول اکیڈمی سے شائع ہوئیں۔ ''رن کچھ سے چونڈہ تک'' کی اشاعت پر ائیر مارشل نور خان، کمانڈر انچیف پاکستان ایرفورس، کمانڈر انچیف پاکستان آرمی اور ڈیفنس منسٹر گورنمنٹ آف پاکستان کی طرف سے تعریفی خطوط موصول ہوئے۔

پروفیسر رشید احمد گوریجہ

رشید احمد گوریجہ جڑانوالہ سے تشریف لاتے تھے جہاں وہ اُردو کے پروفیسر تھے۔ بڑے خوش باش اور زندہ دل تھے۔ صحت کے معاملہ میں بڑے لاپرواہ تھے۔ میں نے ان سے کئی دفعہ کہا کہ اپنی صحت کا خیال رکھا کریں، آپ کا جسم بہت بڑھ گیا ہے۔ کچھ پرہیز کیا کریں کہ علاج سے پرہیز بہتر ہے۔ گوریجہ صاحب رس گلہ منہ میں ڈال کر جواب دیتے: ''پرہیز سے علاج بہتر ہے'' ان کی کتب ''بحث مباحثہ'' ''ملی تقریریں'' اور ''انعام یافتہ تقریریں'' ہم نے شائع کی ہیں۔

ایم اسلم

ایم اسلم اپنے زمانے میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے مصنف تھے۔ وہ ناول کثرت سے لکھتے اور چھاپنے والے کے لئے بھی نفع بخش ثابت ہوتے تھے۔ ان کے ناول لاہور کا صرف ایک

Marfat.com

ادارہ شائع کیا کرتا تھا۔جس سے ان کے تعلقات آخری دور میں کچھ کشیدہ ہو گئے تھے۔میں نے ایم اسلم صاحب سے رابطہ کیا تو میرے ساتھ انہوں نے چند ناولوں کا تحریری معاہدہ کیا اور اشاعت کے لئے جو پہلا ناول دیا اس کا نام ''صیاد'' تھا۔ان دنوں میں شاہ عالم مارکیٹ میں ہی کاروبار کر رہا تھا۔''صیاد،، کا ٹائٹل میں نے مشہور آرٹسٹ جالی صاحب سے بنوایا، کتاب کے نام کی مناسبت سے سرورق پر شکاری کے پاؤں کے نشانات تھے، کتاب چھپ گئی تو ایم اسلم تیسری منزل پر میرے دفتر میں تشریف لائے اور کتاب کا ٹائٹل دیکھتے ہی سیخ پا ہو گئے، غصے سے بولے،''میری کتاب اور اس کے اوپر جوتے، لاحول ولاقوۃ، لاحول ولاقوۃ،، کہتے ہوئے میاں صاحب سیڑھیاں اتر گئے اور پھر ان سے کبھی ملاقات نہ ہوئی۔

ایم اے راحت

ایم اے راحت زودنویسی کے حوالے سے ایک خودکار کمپیوٹر ہیں۔تخلیقی نثر لکھنے میں کوئی ان کے مقابل نہیں آسکتا۔مختلف ڈائجسٹ رسائل میں اُن کے ناولوں کی قسطیں شائع ہو رہی ہیں اور وہ بیک وقت مختلف النوع موضوعات پر ناول سوچتے اور لکھتے رہتے ہیں۔ان کی اس ذاتی صفت پر متحیر ہو کر بعض افراد تو کہتے ہیں کہ ان کے پاس کوئی جن ہے۔میں ایسا کہنے والوں کی تائید کرتا ہوں۔

مجھے ان کے متعدد ناول شائع کرنے کا شرف حاصل ہے۔ان کے شہرۂ آفاق ناولوں میں ''نامور'' سیریز۔''شہنشاہ'' سیریز ''ملکۂ صحرا'' سیریز کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

عشرت رحمانی

عشرت رحمانی صاحب بہت خوش اخلاق، ملنسار، عجز وانکساری کا مجسمہ تھے۔میرے ساتھ ان کے روابط گہرے تھے۔مجھے ان کی نیازمندی پر فخر تھا۔ان کی متواضع طبیعت کا عالم یہ تھا کہ میں جب کبھی ان کے پاس گیا، چائے پیے بغیر انہوں نے واپس نہیں آنے دیا۔ان کی چند کتابیں چھاپنے کا مجھے شرف حاصل ہے۔جن میں جنگ آزادی کے نامور مجاہدین، حیات جوہر، اور 'پاکستان سے پاکستان تک' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

Marfat.com

یونس ادیب

میں یونس ادیب کا شمار ایسے لوگوں میں کرتا ہوں جو پہلی ملاقات میں ہی دوسرے کے دل میں اپنا گھر بنا لیتے ہیں۔ خلوص اور سادگی ان کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ وہ درویش شاعر ساغر صدیقی کے سچے عاشق تھے اور ان کی وفات کے بعد ہر سال ان کا ''عرس'' منعقد کرتے تھے۔ اس عرس کے لئے چندہ کی ایک مخصوص رقم میرے ذمہ بھی واجب تھی جو میں ہر سال باقاعدگی سے ادا کرتا رہا۔ یونس ادیب کی سوالاً جواباً ''معلوماتِ قائداعظم'' اور ''معلومات اقبال'' میں نے شائع کی ہیں۔

پروفیسر جمیل آذر

پروفیسر جمیل آذر انگریزی ادب کے اُستاد، بلند پایہ نقاد اور انشائیہ کے ابتدائی تعارف نگاروں میں شامل ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے بعد اُردو انشائیہ میں ان کا نام اور کام سب سے اہم سمجھا جاتا ہے۔ ان کے انشائیوں کے تین مجموعے ''شاخ زیتون''، ''رت کے مہمان'' اور ''وقت اے وقت'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین کی کتاب ''انشائی تنقید'' چھاپنے کا اعزاز بھی مقبول اکیڈمی کو حاصل ہے۔

پروفیسر جمیل آذر کا ظاہر باطن ایک ہے اور وہ ایک نیک دل اور سادہ انسان ہیں۔ راولپنڈی، اسلام آباد کے جن دوستوں سے ان کا ذکر ہوتا ہے وہ ان کی تعریف میں رطب اللسان ہو جاتے ہیں، ان کی طبعی شرافت اور ادب میں ان کی گہری دلچسپی کی داد دیتے ہیں، بلکہ بعض لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ ریٹائرمنٹ کے بعد جمیل آذر ولی اللہ ہو گئے ہیں اور ان کو ملنا ثواب ہے، ان کو دیکھنا کسی ہمدم دیرینہ کو دیکھنا ہے جس کی ملاقات مسیحا و خضر کی ملاقات سے بہتر ہوتی ہے...... وہ اس اعزاز پر فخر کرتے ہیں کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے پانچ مرتبہ مکہ معظمہ آنے کا بلاوا بھیجا اور انہیں پانچ مرتبہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔

Marfat.com

پروفیسر جمیل آذر میرے بہترین دوست بلکہ کرم فرماؤں میں شامل ہیں، وہ میرے لئے خدائے بخشندہ کی عطا ہیں اور غیب سے غالب کے شعر کی طرح اترے ہیں، خدا انہیں شاد آباد اور صحت مند رکھے اور دین و دُنیا میں انہیں کامیابیاں اور کامرانیاں عطا فرمائے۔ (آمین)

سعید بدر

سعید بدر اس محنت کش انسان کا نام ہے جس نے اپنی ہمتوں کو کبھی پست نہیں ہونے دیا اور زندگی کی صعوبتوں کا مقابلہ کرنے سے کبھی گریز نہیں کیا' بلکہ یہ کہنا بھی مناسب ہے کہ جب وہ کسی مشکل میں گرفتار نہ ہوں اور وقت آسودگی سے گزر رہا ہو تو وہ اداس ہو جاتے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنی تمام قوت اسوۂ رسول کریمؐ سے حاصل کرتے ہیں جنہوں نے اپنی مکی زندگی میں اپنے مخالفین کا سامنا کیا اور بالآخر ہجرت کے بعد مکہ میں کامرانی سے داخل ہوئے۔ وہ شاعر ہیں لیکن انہوں نے غزل اور نظم کی شاعری نہیں کی۔ ان کا فن صرف حمد و نعت کے لئے وقف ہے۔ انہوں نے قلم و قرطاس سے رشتہ جوڑا تو صحافت کو اپنا پیشہ بنایا اور یہاں بھی انہوں نے آسان راہوں کو قبول کرنے کی بجائے مشکل راستے اختیار کئے اور ایسی تجرباتی صحافت کی جو آج کے نئے صحافیوں کے لئے مشعل راہ ہے۔ چنانچہ انہیں بلند پایہ نعت نگار کا درجہ حاصل ہے تو وہ صحافت میں ممتاز شمار کئے جاتے ہیں۔

سعید بدر کو علامہ اقبال کے کلام سے بے پناہ محبت پیدا ہے۔ علامہ اقبال کے کلام نے ہی ان کے دل میں مرشد رومی کی محبت پیدا کی۔ انہوں نے اپنی زندگی ان دونوں کے مطالعے کے لئے وقف کر دی اور ان پر کئی گراں قدر تحقیقی مقالے لکھے جو ملک کے معروف ادبی رسائل میں شائع ہو کر مقبول ہوئے۔ مجھے ان کی نعت کی ایک کتاب ''دِل دِل مدینہ'' چھاپنے کا اعزاز حاصل ہے۔

Marfat.com

ڈاکٹر رشید امجد

اس دور میں رشید امجد مسلسل محنت کی زندہ مثال ہے اور یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انسان اگر دیانتداری سے اپنا نصب العین حاصل کرنے کا ارادہ کرلے اور اس کے لئے کوشش پیہم عمل میں لائے تو کامیابی اس کے قدم چوم لیتی ہے۔ رشید امجد نے بہت نچلے درجے سے عملی زندگی شروع کی اور اب علمی، ادبی اور تعلیمی دنیا میں بہت اونچے مقام پر پہنچ چکے ہیں۔ یعنی اسلامی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر نشین ہیں۔ وہ ان افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے روایتی افسانے کی موضوعیت کو تبدیل کرنے میں ایک مجدد کا کردار ادا کیا۔ دوسرے لفظوں میں انہوں نے اپنی زندگی خود بنائی، معاشرے میں بلند مقام حاصل کیا اور افسانوی ادب میں طرح نو کا باعث بن گئے۔ سچ ہے کہ اللہ جسے چاہے عزت دیتا ہے۔ اور رشید امجد اللہ کے مرغوب بندوں میں شمار کئے جاسکتے ہیں۔ ان کی خوبیوں کو دیکھ کر صدر پاکستان نے انہیں ''پرائیڈ آف پرفارمنس'' سے سرفراز کیا ہے۔ مقبول اکیڈمی کو ان کی کتابیں ''بھاگے ہے بیاباں مجھ سے''، ''رویئے اور شناختیں''، ''میرزا ادیب شخصیت اور فن'' اور ''دشت نظر سے آگے'' چھاپنے کا اعزاز حاصل ہے۔

اسرار زیدی

اسرار زیدی کی زندگی کی متاع عزیز ان کا خلوص ہے۔ وہ کم گفتار انسان ہیں، لیکن دوسروں کی تمام باتیں غور سے سنتے ہیں۔ شاعری میں انہوں نے ہمیشہ انسان دوستی کے موضوعات کو اہمیت دی اور اپنی شاعری میں دکھی انسانیت سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی دانشوری اور ترقی پسند فکر کی تحسین تمام ادبی حلقوں میں کی جاتی ہے اور ان کی بزرگی کا احترام کیا جاتا ہے۔ لاہور میں سب ان کے دوست ہیں، سب ان کے خیر خواہ ہیں اور ان میں یہ ناچیز مقبول احمد بھی شامل ہے۔ مجھے ان کی ایک کتاب ''بام ودرجن سے روشن ہوئے'' شائع کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔

Marfat.com

پروفیسر تنویر حسین

پروفیسر تنویر حسین اُردو مزاح نگاروں کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں، جو مشتاق احمد یوسفی کے بعد روتے بسورتے اور سیاست و معاشرت کے مارے ہوئے لوگوں کو ہنسانے اور زندگی کے مثبت عمل میں شریک کرنے کی ترغیب پر مامور کی گئی ہے، ان کو دیکھیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی بم دھماکے سے جان بچا کر آئے ہیں، ان کی حالت دیکھ کر رحم آتا ہے لیکن یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ان کے اندر مزاح کا چشمہ ابل رہا ہے اور بم دھماکے سے پیدا ہونے والی سراسیمگی سے بھی مزاح کو اُبھار سکتے ہیں، اس لحاظ سے آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ فطری مزاح نگار ہیں، جو دُکھ بھری زندگی کو دیکھ کر اپنی آنکھوں سے آنسو بہاتا ہے، لیکن دوسروں کو مسکرانے کا موقع دیتا ہے۔ ان کی ''اصنافِ ادب اُردو'' کے علاوہ ''مزاج بخیر'' اور ''خوش آمدید'' مقبول اکیڈمی سے چھپ چکی ہیں۔

احمد پراچہ

احمد پراچہ صوبہ خیبر پختونخواہ کے وہ دانشور ہیں جنہوں نے اُردو ادب کی خدمت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا رکھا ہے اور اسے ہمیشہ وفاداری بشرطِ استواری کا درجہ دے کر اپنے شہر کوہاٹ کو اُردو ادب میں حیاتِ جاوید عطا کر دی ہے۔ انہوں نے صلہ و ستائش کی کبھی پروا نہیں کی اور ادب کے نام کو ہمیشہ زندگی کے دیگر امور پر فوقیت دی ہے۔ ان کی ایک کتاب ''پروین شاکر فکر و فن'' میرے ادارے مقبول اکیڈمی سے شائع ہوئی ہے۔ میں ان کی ادب دوستی کا اعتراف کرتا ہوں اور ان کی صحت کے لئے دُعا گو ہوں۔

پروفیسر نذیر احمد تشنہ

پروفیسر نذیر احمد تشنہ بنیادی طور پر تاریخ دان ہیں، لیکن زندگی کے تمام اہم موضوعات کو

Marfat.com

وہ اہمیت دیتے ہیں اور ان موضوعات پر اپنے مطالعے کو ''اپ ٹو ڈیٹ'' رکھنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ تشنہ ان کا تخلص ہے، لیکن درحقیقت یہ ان کی فطرت کی ایک علامت بھی ہے، جو ظاہر کرتی ہے کہ علم کی بہت سی دولت حاصل کر لینے کے باوجود ان کی تشنگی قائم ہے۔

نذیر احمد تشنہ بے حد مخلص انسان ہیں۔ ان کا خلوص ان کے چہرے سے عیاں ہے، سر کے سفید بال اور تراشیدہ داڑھی عمر ضعیفی کو ظاہر کرتی ہے، لیکن جس رفتار سے انہوں نے کتابیں لکھی ہیں وہ ظاہر کرتی ہیں کہ آتش ابھی جوان ہے۔ ان کی کتاب ''اُردو ضرب الامثال'' اور ''مطالعہ کشمیر'' مقبول اکیڈمی سے چھپ چکی ہیں۔

منشا یاد

منشا یاد اُردو کے ممتاز افسانہ نگار ہیں۔ اسلام آباد میں ان کی حیثیت وہی ہے، جو فیصل آباد میں گھنٹہ گھر کی ہے۔ دارالحکومت کے تمام ادبی اداروں کی مشاورت میں منشا یاد شامل ہوتے ہیں۔ اکادمی ادبیات اور مقتدرہ قومی زبان اور نشریات کے ادارے ریڈیو اور ٹیلی ویژن ان سے استفادہ کرتے ہیں۔ ادیبوں کا وفد ملک سے باہر جائے تو منشا یاد پاکستان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ چین، انڈیا، برطانیہ، امریکہ کی ادبی مجالس میں شرکت کر چکے ہیں۔ منشا یاد کسی ایک ملک کے کہانی نگار نہیں بلکہ پوری اُردو دُنیا کے افسانہ نگار ہیں۔

Marfat.com

مقبول اکیڈمی کی
چند خواتین قلمی معاونین

اب میں ان خواتین کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو معاشرتی، سماجی، نفسیاتی اور تہذیبی مسائل پر ادبی انداز اور اسلوب میں اظہار خیال کرنے کا سلیقہ رکھتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ عورتوں کے مسائل عورتیں ہی سمجھ سکتی ہیں اور پھر وہ ان کا حل بھی تلاش کر لیتی ہیں۔ مجھے فخر ہے کہ میں نے مقبول اکیڈمی کے لئے اُردو ادب کی چند نامور خواتین کا تعاون حاصل کیا اور معاشرتی، سماجی، اور گھر گرہستی کے مسائل پر ان سے ناول لکھوائے۔

بلقیس ریاض

بلقیس ریاض صاحبہ محترم چیف جسٹس (ر) شیخ ریاض احمد صاحب کی اہلیہ ہیں۔ میں نے اُن سا با اخلاق اور منکسر المزاج جوڑا دیکھا ہی نہیں۔ مقبول اکیڈمی کو باجی بلقیس ریاض کے کئی بہترین ناول شائع کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ طباعت کے لئے ان کے کئی مسودے ابھی تک میرے پاس پڑے ہیں۔

''عمر خیام کے دیس میں'' باجی بلقیس ریاض صاحبہ کا سفر نامہ ایران ہے۔ مشہور نقاد ڈاکٹر وحید قریشی نے اس پر اپنی رائے کا اظہار یوں کیا ہے۔

''بلقیس ریاض کی شہرت ایک ناول نگار اور سفر نامہ نگار کی ہے۔ انہوں نے کئی ملکوں کی سیر کی اور ژرف نگاہی سے مختلف ممالک کے باطن میں

Marfat.com

چھپی ہوئی کیفیات کو اجاگر کیا ہے۔ وہ پی آئی اے کی مشہد کے لئے پہلی پرواز میں بطور مہمان ایران روانہ ہوئیں۔ مختصر سے سفر میں کسی ملک کے باطن میں جھانک کر اس کے تشخص کی پہچان ممکن نہیں لیکن سرسری سفر میں زیرک سیاح کی طرح انہوں نے گردوپیش کا مشاہدہ ضرور کیا اور ایرانی خواتین کی نفسی کیفیات کو ہنر مندی سے بیان کر دیا ہے۔ طبقہ امرا کی خواتین کے دلوں میں احساس محرومی کے بعض پہلو انہیں اہم دکھائی دیے۔ 'حجاب' کے حوالے سے انہوں نے اس طبقے کے تاثرات کو بیان کر دیا ہے۔ ایرانیوں کی خوش خوری اور چلو کباب، ٹھنڈے نان اور تربوز کا بکثرت استعمال بھی انہیں اہم دکھائی دیے۔ اسی طرح تعلیم کے حوالے سے ایران اور پاکستان کا تقابل ان کی تحریر کا ضروری حصہ ہے۔"

ثریا خورشید

صدر آزاد کشمیر اور قائداعظم محمد علی جناح کے سیکرٹری "کے ایچ خورشید مرحوم" کی اہلیہ ثریا خورشید صاحبہ سے میرا تعارف کلیم اختر مرحوم (مصنف "جہانِ ظرافت") کی وساطت سے ہوا۔ ان کی ایک کتاب "چناروں کے سائے" مقبول اکیڈمی سے شائع ہو چکی ہے اور دوسری کتاب "جلتا ہوا کشمیر" زیر طبع ہے۔ محترمہ ثریا خورشید کو کشمیر سے بے پناہ محبت ہے، کشمیر کے حوالے سے انہوں نے متعدد مضامین لکھے ہیں۔ تحریک پاکستان اور قومی مسائل پر بھی ان کے مضامین "نوائے وقت" میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ آپ "تحریک کارکنانِ پاکستان" تنظیم کی ممبر ہیں، جس کے چیئرمین محترم مجید نظامی صاحب ہیں۔ ان کی کتاب "یادوں کی کہکشاں" پر پہلا صدارتی ایوارڈ ملا ہے۔

Marfat.com

ادا جعفری

میں اپنے کاروبار کے سلسلے میں کراچی جانے لگا تو میرزا ادیب میرے پاس بیٹھے تھے۔انہوں نے ہی مجھے محترمہ ادا جعفری کی کتابیں حاصل کرنے کا مشورہ دیا اور میں محترمہ کے پاس میرزا ادیب مرحوم کی چٹھی لے کر گیا۔انہوں نے میرزا صاحب کی چٹھی کی بہت قدر کی اور مجھے اپنے تمام شعری مجموعے شہر درد، غزالاں تم تو واقف ہو، ساز سخن بہانہ ہے، میں ساز ڈھونڈتی رہی، اشاعت کے لئے عطا کر دیئے اور کہا کہ ''اشاعت کے بعد ان کی پندرہ پندرہ جلدیں مجھے ارسال کی جائیں۔بس یہی میری کتابوں کی رائلٹی ہوگی''۔

محترمہ ادا جعفری کی یہ ایسی عظمت، شفقت و مروت تھی کہ میں ان کا ہمیشہ کے لئے ممنونِ احسان ہوگیا۔

سلمیٰ اعوان

محترمہ سلمیٰ اعوان ایک اعلیٰ پائے کے سکول کی سربراہ ہیں اور بہت اچھی ناول نویس بھی ہیں۔ برادری کے حوالے سے میری بہن ہیں لیکن کبھی کبھی معمولی سی بات پر مجھے ڈانٹ بھی پلا دیتی ہیں۔اس وقت ان کا روپ مصنفہ کا نہیں استانی کا ہوتا ہے۔ان کی جو کتابیں میں نے شائع کی ہیں۔ان میں میرا گلگت وہنزہ اور تنہا، قابل ذکر ہیں۔

عذرا اصغر

محترمہ نشاط فاطمہ نے عذرا اصغر صاحبہ کی تعریف کی جو رسالہ ''تجدید نو'' کی ایڈیٹر ہیں۔ میں نشاط فاطمہ صاحبہ سے ان کا پتہ لے کر اسلام آباد چلا گیا اور محترمہ عذرا اصغر سے ملا۔ انہوں نے میری بڑی آؤ بھگت کی اور پہلی ملاقات میں ہی اشاعت کے لئے تین کتابیں عنایت کر دیں۔

Marfat.com

اللہ کریم نے ان کو حُسنِ صورت کے ساتھ حُسنِ سیرت سے بھی نوازا ہے۔ نشاط فاطمہ نے ان کی تعریف بلاوجہ نہیں کی تھی۔ ہمارے ادارے سے ان کی کتب بیسویں صدی کی لڑکی، دل کے رشتے، اور تنہا برگد کا دکھ، شائع ہوئی ہیں۔

شبانہ یونس

محترمہ شبانہ یونس سے میری عقیدت اس وقت سے ہے جب میں ''چودھویں صدی'' شائع کرتا تھا۔ آپ بڑی نیک، شریف اور باکردار خاتون ہیں۔ مقبول اکیڈمی نے ان کے متعدد ناول شائع کیے ہیں۔ ان میں سے ''تم کو خبر ہونے تک' خاک ہو جائیں گے، ویرانے کے پھول، شکستہ سفینے، کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔

رضیہ فصیح احمد

رضیہ فصیح احمد پہلے افسانہ نگار کی حیثیت میں متعارف ہوئیں پھر اعلیٰ درجے کی ناول نگار تسلیم کی گئیں۔ مقبول اکیڈمی نے محترمہ کے کئی ناول شائع کیے۔ ان کے ایک ناول ''آبلہ پا'' کو آدم جی انعام ملا۔ میں نے اس کا دوسرا ایڈیشن ایک ہزار کی تعداد میں شائع کیا تو کراچی سے محترمہ رضیہ فصیح احمد کا فون آیا کہ اس شہر کے دکانداروں نے ان کو بتایا کہ صرف کراچی میں پانچ ہزار کتابیں فروخت ہو چکی ہیں۔

اس بات سے اندازہ کیجئے کہ مصنف کو ناشر پر کتنی بداعتمادی ہوتی ہے۔ یعنی کتاب تو صرف ایک ہزار کی تعداد میں چھپی ہے اور ابھی ساری فروخت بھی نہیں ہوئی لیکن مصنفہ صاحبہ فرما رہی ہیں کہ صرف کراچی کے دکاندار پانچ ہزار کتابیں فروخت کر چکے ہیں۔ اس اطلاع سے مجھے افسوس تو ہوا لیکن میں نے مصنفہ کی بدگمانی رفع کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور اپنی دیانت کو پورا تحفظ دیا۔

Marfat.com

رئیس احمد جعفری

احسان دانش

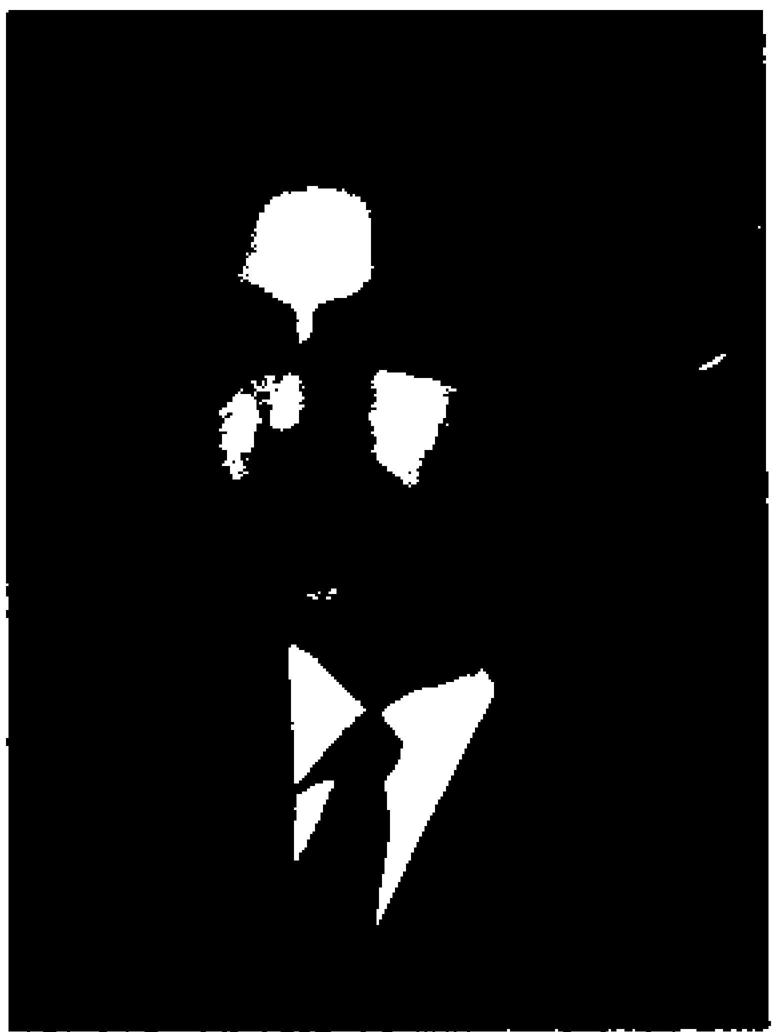

محمد احسان الحق سلیمانی

میرزا ادیب

اے حمید

ڈاکٹر عادل عزیز

ڈاکٹر انور سدید

Marfat.com

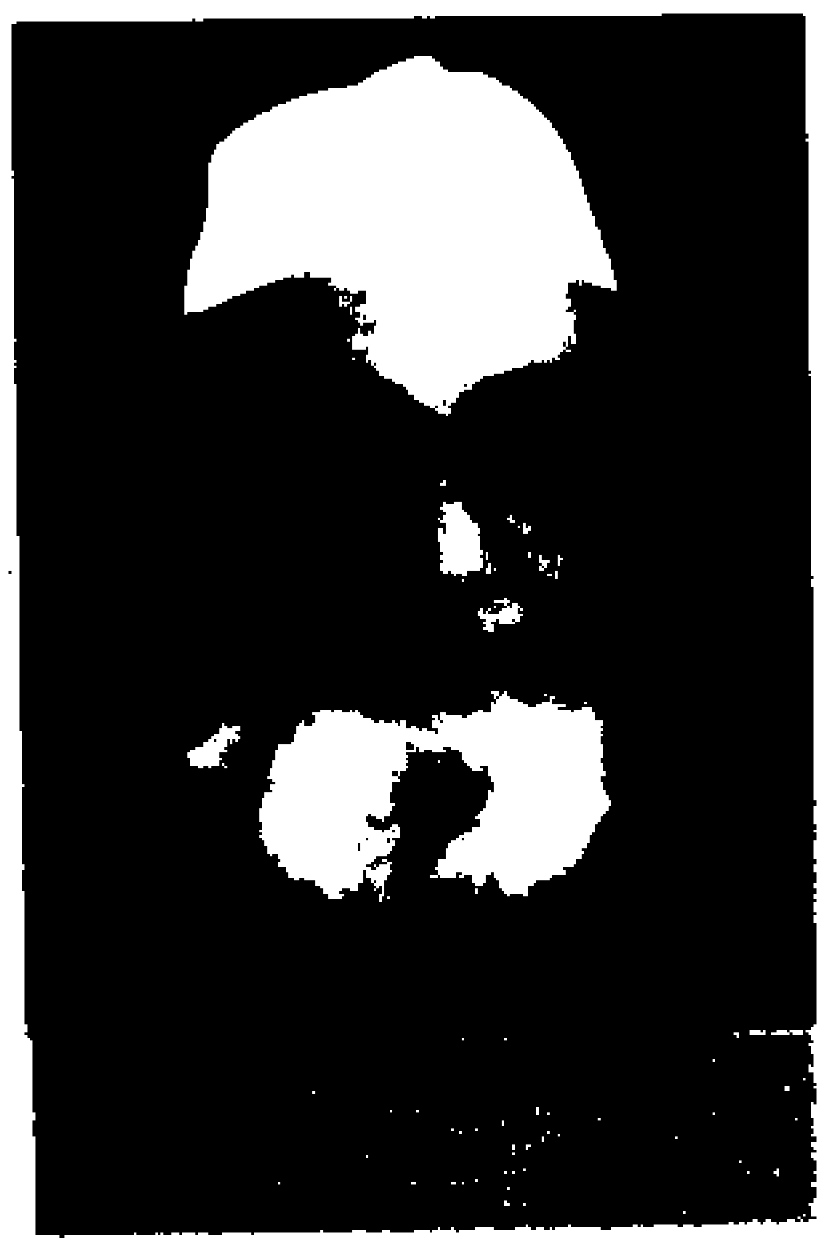

Marfat.com

ڈاکٹر وحید قریشی

مولانا حامد علی خان

سید قاسم محمود

عبدالعزیز خالد

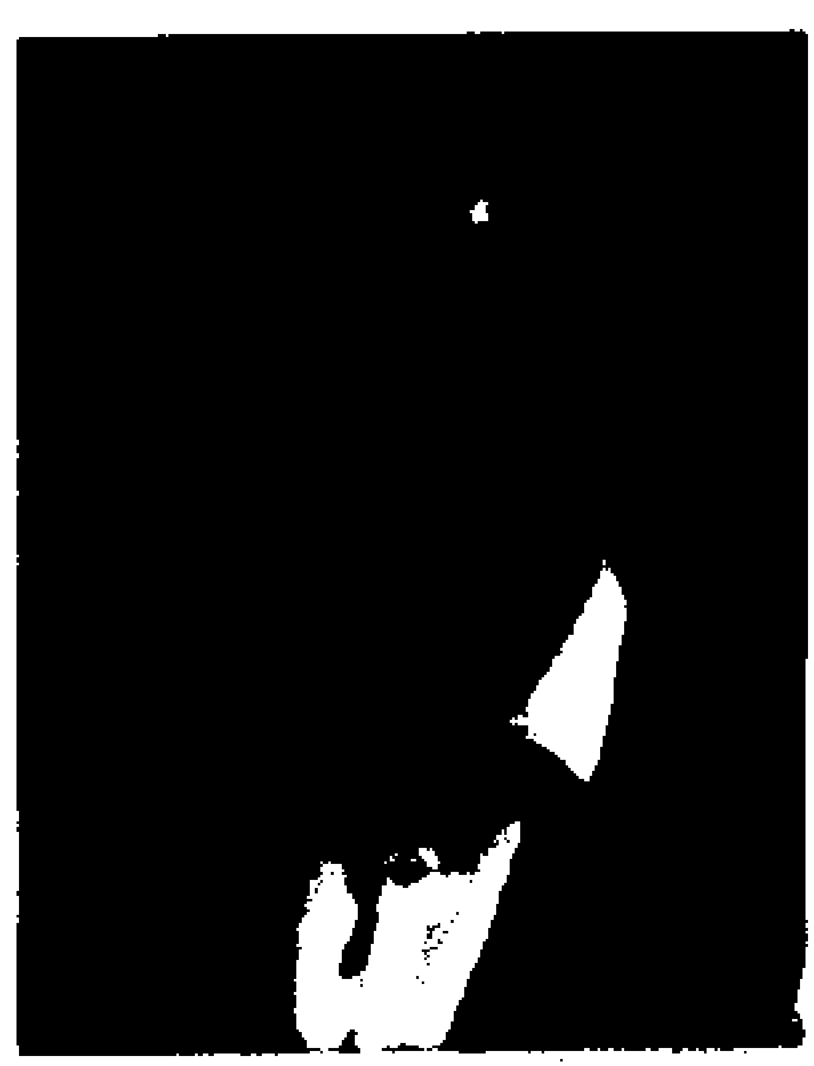

ڈاکٹر علی محمد خان

اظہر جاوید

Marfat.com

قمر لدھیانوی

اللہ بخش ملک

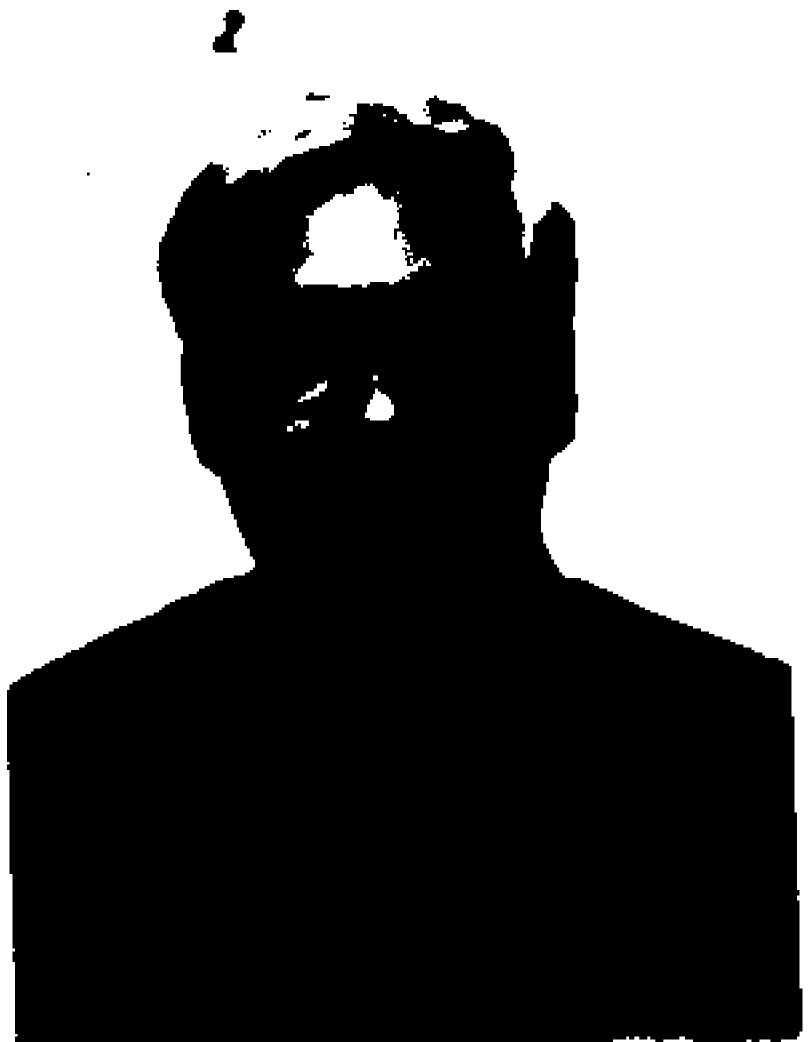

راجا رشید محمود

قاضی ذوالفقار احمد

رحمان مذنب

Marfat.com

ساغر صدیقی

ناصر نقوی

سیّد واجد رضوی

ابوالامتیاز ع، س، مسلم

غلام الثقلین نقوی

ڈاکٹر مسکین علی حجازی

Marfat.com

گریبان

منو بھائی

ذوالفقار علی بھٹو کے عنوان سے ایم ایس ناز کی کتاب کی رونمائی کی تقریب اپنے اندر بہت سی رونمائیاں لئے ہوئے تھی. تقریب بہت دلچسپ تھی اور اس حقیقت نے اسے اور بھی زیادہ دلچسپ بنادیا کہ یہ کسی کتاب کی رونمائی کی غالباً پہلی تقریب تھی جس میں کتاب کی ساڑھے سات سو جلدیں فروخت بھی ہو گئیں اور ناشر ملک مقبول احمد دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کے بارے میں سنجیدگی سے سوچتا ہوا پایا گیا۔

Marfat.com

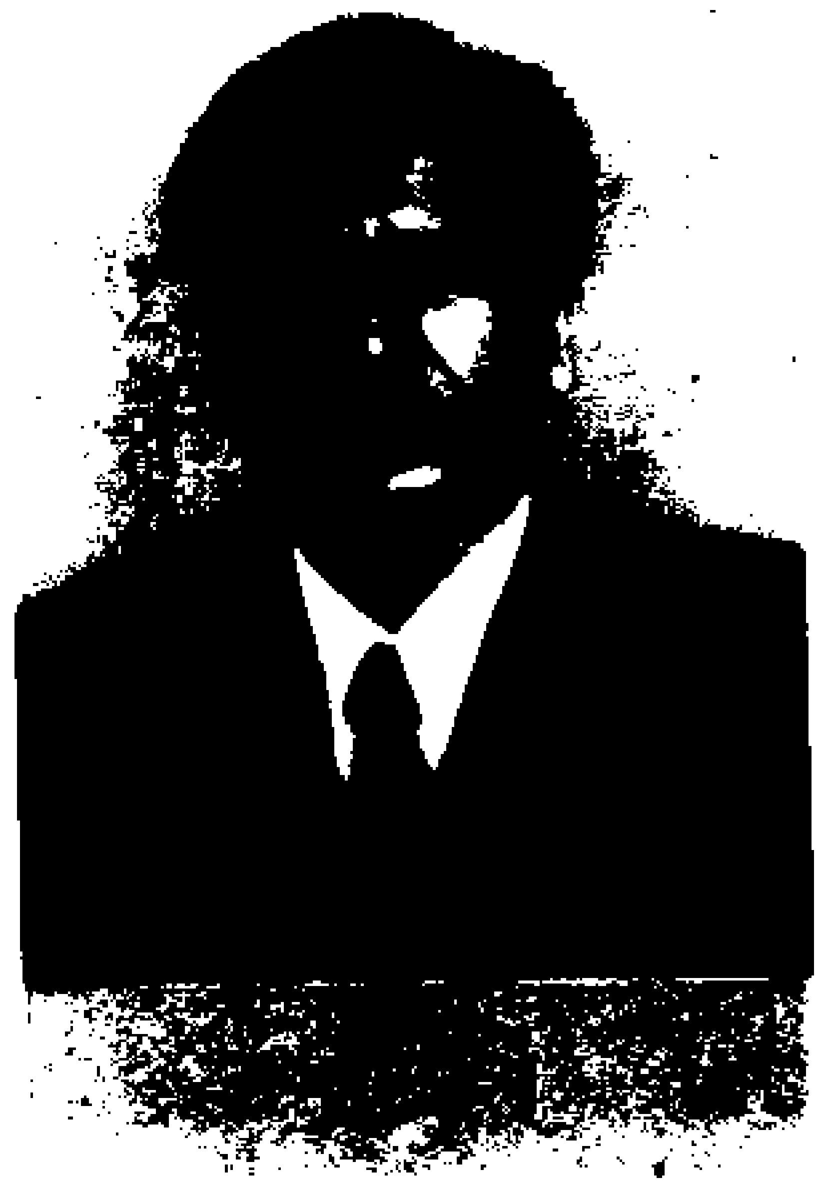

اعتبار ساجد

[illegible]

منصور احمد بٹ

[illegible]

ستار طاہر

Marfat.com

بلقیس ریاض

ثریا خورشید

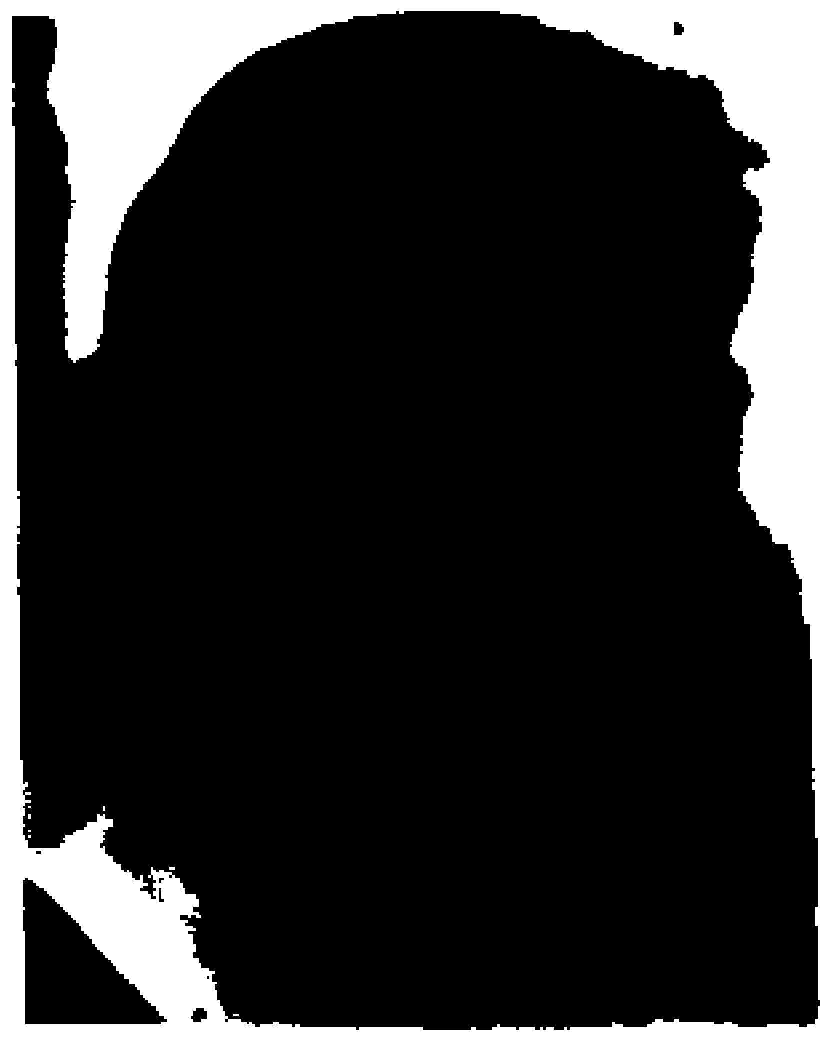

ادا جعفری

سلمیٰ اعوان

عذرا اصغر

شبانہ یونس

Marfat.com

نشاط فاطمہ

نشاط فاطمہ کا تعلق افسانہ نگاروں کے اس خاندان سے تھا جس میں ظفر عمر، فضل قدیر اور الطاف فاطمہ جیسے ادیب شامل تھے۔ میں نے اپنے اشاعتی پروگرام میں خواتین کی زیادہ سے زیادہ تصانیف شامل کرنے کے لئے نشاط فاطمہ صاحبہ سے بھی تین ناول اشاعت کے لیے حاصل کیے۔ وہ خود تسلیم شدہ ادیبہ ہیں لیکن انہوں نے میرے سامنے محترمہ عذرا اصغر کی بڑی تعریف کی۔ میرے لیے یہ انوکھی بات تھی کہ ایک خاتون ادیبہ اپنی ایک ہم عصر خاتون کے فن کی تعریف کر رہی تھیں۔ نشاط فاطمہ کے ناول زمین کے رشتے، چاند ڈوب گیا، اور انسان کی تلاش، میں نے شائع کیے۔

Marfat.com

دیگر مصنفین اور مترجمین

مذکورہ بالا چند مرد ادیبوں اور خواتین ادیبوں کے تذکرے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان اصحاب کا بھی ذکر کروں جنہوں نے انگریزی کی کتابوں کے تراجم کیے اور مقبول اکیڈمی کو اشاعت کے لیے عطا فرمائے۔

ان ادبا کے نام حسب ذیل ہیں:۔

"مولانا محمد بخش مسلم، سید علی ناصر زیدی، سید عابد علی عابد، ڈاکٹر عبادت بریلوی، سید ہاشمی فرید آبادی، بیگمن احسن کلیم، عبدالحمید صدیقی، ابوالحسن نغمی، سید وقار عظیم، حکیم حبیب اشعر، مظہر انصاری دہلوی، ڈاکٹر شفیق الرحمٰن، سیدہ نسیم ہمدانی، ابراہیم خلیق، ڈاکٹر نذیر احمد، پروفیسر حسن عسکری، شیر محمد اختر، مشرف انصاری، ڈاکٹر برہان احمد فاروقی اور شاہد احمد دہلوی"

یہ چند نام میں نے اپنی یاد سے بازیافت کیے ہیں۔کوئی نام رہ گیا ہو تو معذرت طلب کرتا ہوں۔ مقبول اکیڈمی کے کچھ قلمی معاونین اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ ان کیلئے میں دعا کرتا ہوں اور آپ بھی دعا فرمائیں کہ اللہ ان کو اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔ (آمین)

اپنے اس اشاعتی کاروبار میں مجھے بہت سے نامور ادیبوں سے واسطہ پڑا۔ میں نے مقدور بھر ان کا احترام کیا اور ان کو کبھی میرے ادارے سے شکوہ نہیں ہوا۔ اس حقیقت کو تو کئی ادیبوں اور دانشوروں نے تحریری طور پر تسلیم کیا اور ملک کے واحد نظریاتی اخبار "نوائے وقت" نے مقبول اکیڈمی کے بارے میں اپنے ادبی ایڈیشن میں لکھا۔

"لاہور کے مقبول اشاعتی اداروں میں "مقبول اکیڈمی" کو اہمیت حاصل ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا "اشاعتی قبلہ" درست ہے۔"

Marfat.com

''اشاعتی قبلہ'' درست ہونا میرے لیے اور میرے ادارے کے لیے اہم ترین خراجِ تحسین ہے۔

حرفِ تشکر

میرا اشاعتی کام کئی سالوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اس دوران میں مجھے بہت سے نامور ادیبوں، دانشوروں اور عظیم شخصیات سے شرف نیاز حاصل ہوا۔ کچھ کرم فرماؤں نے اپنے رشحات قلم مجھے اشاعت کے لیے دیئے۔ لیکن بعض اصحاب نے مجھے اس خدمت کے قابل نہیں سمجھا لیکن میرا ان سے تعلق خاطر قائم رہا اور میں نے نیاز مندی کے سلسلے کو کبھی ٹوٹنے نہ دیا۔ اپنی اشاعتی زندگی میں جن قابل احترام اور عظیم ہستیوں سے مجھے تعلق خاطر رہا ان میں سے چند حضرات کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔

☆☆ .... ☆ .... ☆☆

Marfat.com

وکھری ٹائپ کے لوگ

ہمارے معاشرے میں اچھے اور بُرے ہر قسم کے لوگ موجود ہیں۔ دیانتدار اور ایماندار بھی، بددیانت اور بے ایمان بھی۔ ہر ایک پر اعتماد اور اعتبار کرنے والے بھی اور سب کو شکوک اور شبہات سے دیکھنے والے بھی۔ مؤخر الذکر قسم کے لوگ وکھری ٹائپ کے ہیں اور وہ معاشرے کو داغدار کرنے کا کوئی موقعہ فروگزاشت نہیں کرتے۔ کتابوں کی اشاعت وطباعت کے کاروبار میں مجھے بھی چند ایسے لوگوں سے پالا پڑا جن کے منفی ہتھکنڈوں کی وجہ سے ادب کے اس کاروبار کو دیانت سے چلانے والے ہی نہیں، علم ودانش بھی شرمندہ ہے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ میں اپنے گاؤں دیّو وال ضلع سیالکوٹ سے لاہور میں قسمت آزمائی کے لئے آیا تھا اور شاہ عالمی سے ''چودھویں صدی'' نامی پندرہ روزہ میگزین شائع کر رہا تھا جسے اب عدم آباد کو سدھارے بھی نصف صدی گزر چکی ہے۔ 27 برس کے بعد آج جب میں ماضی کے گزرے ہوئے دنوں کو یاد کر رہا ہوں تو مجھے ہر بات کل کی بات معلوم ہو رہی ہے۔

طویلے کی بلا بندر کے سر

میرے رسالہ ''چودھویں صدی'' میں مضامین، خبروں اور سرکاری اشتہارات کے علاوہ ایک فرم کی انعامی سکیم کا اشتہار (ان دنوں سکیموں کا دور دورہ عام تھا) بھی چھپتا تھا جس کے مالک کا نام محمد علی تھا۔ وہ شکر گڑھ کے رہنے والے تھے۔ اشتہار چھاپنے کا ان کے ساتھ یہ معاہدہ تھا کہ جس پرچے میں ان کا اشتہار چھپتا، وہ اس پرچے کی خاصی بڑی تعداد خرید لیتے اور اپنے گاہکوں کو

Marfat.com

ہمارے ذریعے ان کے پتوں پر بھجواتے تھے۔ گورنمنٹ کی طرف سے اخبار یا رسالہ کی ترسیل پر ڈاک خرچ کی کافی رعایت ہے۔ وہ اس رعایت کا فائدہ اٹھاتے تھے۔ اس زمانے میں کچھ ایسے اخبارات بھی شائع ہوتے تھے جن کا کام ہی بلیک میلنگ تھا۔ ایسا ہی ایک اخبار ''ندائے وقت،، تھا جس نے اپنا نام ملک کے مشہور اخبار ''نوائے وقت،، سے لیا تھا۔ اس اخبار کے مالک نے یہ سمجھا کہ جس انعامی سکیم کا اشتہار میں اپنے جریدے میں چھاپتا ہوں وہ سکیم شاید میری اپنی ہے اور درپردہ میں انعامی سکیموں کا کاروبار کرتا ہوں۔ اس اخبار نے میرے خلاف ایک مضمون 1959ء میں شائع کیا۔ یہ اخبار نذیر پریس، بیرون لوہاری دروازہ، سرکلر روڈ لاہور میں طبع ہوتا تھا، جس کا منتظم میر منظور ولی وارثی تھا۔ میرے خلاف مضمون شائع ہوا تو میں نے اخبار ''ندائے وقت،، اور نذیر پریس کے خلاف ہتک عزت کا دعویٰ دائر کر دیا، جو ایک مقامی عدالت میں سماعت کے لیے منظور کر لیا گیا۔ ملزمان میں مشہور صحافی (میاں محمد شفیع) کو بھی نامزد کیا گیا جو اعلیٰ درجے کے صحافی تھے اور ''دکھری ٹائپ'' کے نہیں تھے۔ انہوں نے یہ بات سنتے ہی معذرت کر لی اور میں نے ان کا نام مقدمے سے خارج کرا دیا لیکن پریس کے الاٹی کے خلاف مقدمہ چلتا رہا۔ وارثی صاحب کے وکیل نے عدالت میں یہ موقف اختیار کیا کہ وارثی صاحب بے قصور ہیں کیونکہ اخبار ان کے پریس میں آیا اور انہوں نے چھاپ دیا۔ اخبار کے مضامین سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ میرے وکیل نے بمبئی ہائی کورٹ کے ایک فیصلے کا حوالہ دیا جس میں ہتک عزت کے ایک مقدمے میں عدالت نے اخبار بیچنے والے ہاکر کو بھی سزا دی تھی۔ میرے وکیل نے اصرار کیا کہ وارثی کو بھی سزا ملنی چاہیے۔ عدالت نے اپنے سپاہی کو حکم دیا'' صاحب کو کری پیش کرو'' فوری طور پر تو مجھے سمجھ نہ آئی کہ مجسٹریٹ صاحب کیا فرما رہے ہیں اور ملزم کو کری پیش کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ لیکن فوراً ہی پولیس کے سپاہی نے ملزم کو ہتھکڑی لگا لی اور اسے جیل بھجوا دیا گیا۔

چند دنوں کے بعد میرے کچھ دوستوں نے مداخلت کی اور مجھ پر دباؤ ڈالا کہ میں وارثی صاحب کو معاف کر دوں اور مقدمہ واپس لے لوں۔ وارثی نے بھی ''معافی نامہ'' لکھ کر دے دیا۔

Marfat.com

اب میں نے مقدمے کو طول دینا مناسب نہ سمجھا اور مقدمہ واپس لے لیا۔ منظور ولی وارثی کا معافی نامہ اب بھی میرے پاس محفوظ ہے لیکن اس کی مذموم حرکت جو تمام تر حسد کا نتیجہ تھی یاد آتی ہے تو بہت افسوس ہوتا ہے۔

میرے دل میں اہل قلم کا بہت احترام ہے۔ تخلیق کار پر غیب سے مضامین اترتے ہیں۔ میں بعض اہل قلم کو جو اب اس دنیا میں نہیں یاد کرتا ہوں، تو ان کے لئے دعائے خیر کرتا ہوں۔ بہت سے ادیب زندہ ہیں تو ان کے اعلیٰ کردار کی تعریف ہر وقت کرتا ہوں اور ان کی لمبی زندگی اور صحت کی دعا کرتا ہوں۔ لیکن کچھ وکھری ٹائپ کے قلم کاروں کے کارنامے یاد کر کے مجھے دُکھ بھی ہوتا ہے۔ میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ ان کو ہدایت دے۔ میں اس قسم کے چند لوگوں کا ذکر ان کا نام لیے بغیر کر رہا ہوں۔ کیوں کہ یہ میرے طباعتی تجربے کا حصہ ہے اگرچہ افسوس ناک ہے۔

ایک مدیر اور ادیب

''سیرتِ ابنِ ہشام'' کا نئے سرے سے ترجمہ احسان الحق سلیمانی سے کرانے کے بعد میں نے اس کے پروف ایک دفعہ خود پڑھے لیکن اس خیال سے کہ یہ سیرت النبی ﷺ کی کتاب ہے اور اس میں کوئی غلطی نہیں رہنی چاہیے، میں نے یہ کتاب ایک معروف ادیب کو جن کا دفتر اشرف پریس ایبک روڈ، کے اوپر تھا، دوبارہ پروف ریڈنگ کے لیے دی۔ بہت دنوں بعد تقاضا کیا کہ وہ کتابت شدہ کتاب واپس فرمائیں تو انہوں نے کہا کہ بس تھوڑا سا کام باقی رہ گیا ہے، چند دن اور توقف فرمائیں۔ اسی طرح کے کئی تقاضوں کے بعد انہوں نے جب کتاب واپس کی تو ساتھ ہی بل بھی دے دیا۔ میرے آدمی نے جب کتابت شدہ ''سیرت ابن ہشام'' کا پیکٹ دیکھا تو وہ بعینہٖ اسی طرح بندھا ہوا تھا جیسے میں نے ان کو باندھ کر دیا تھا۔ کچھ گرہوں پر جمی ہوئی گرد اس بات کی شاہد تھی کہ پیکٹ کو کھول کر دیکھا تک نہیں گیا۔ میں نے چند معتبرین کو پیکٹ دکھا کر پوچھا کہ وہ بتائیں کہ یہ بنڈل کب کا بندھا ہوا نظر آتا ہے۔ ایک صاحب نے غور سے دیکھتے

Marfat.com

ہوئے ایک گرہ کو کھولنے کی کوشش کی تو گرد ان کی ناک میں چڑھ گئی اور ان کو چھینکیں آنے لگیں، انہوں نے پیکٹ کو ایک طرف کرتے ہوئے کہا کہ ان کے خیال کے مطابق یہ کافی پرانا بندھا ہوا تھا۔ ان کا اندازہ تھا کہ اسے کھولا تک نہیں گیا۔ میں نے اس معروف ادیب سے ذکر کیا تو وہ شرمندہ ہونے کی بجائے کہنے لگے کہ انہیں اس میں کوئی غلطی نظر نہیں آئی اور بل کی ادائیگی پر اصرار کرنے لگے۔ میں نے بات کو بڑھانے کی بجائے انہیں ادائیگی کر دی اور سیرت ابن ہشام کے پروف کسی اور صاحب سے پڑھوائے جنہوں نے بہت سی غلطیاں نشان زد کر دیں۔

کتابوں کے کاروبار میں ایک کارکن طبقہ ایسا بھی ہے جو گاہکوں کی من پسند کتب تلاش کرتا ہے خریدتا ہے اور اپنے گاہکوں تک پہنچاتا ہے۔ اس قسم کے لوگوں میں بھی بعض عجیب و غریب کرداروں سے مجھے واسطہ پڑا۔ ایک مثال ملاحظہ فرمایئے۔

گمنام فحش نگار ڈبلیو ڈبلیو

ایک روز میں سرکلر روڈ پر اپنی دکان "مقبول اکیڈمی" میں بیٹھا اپنے معمولات میں مشغول تھا کہ دو نوجوان لڑکے دیہاتی لباس پہنے تجسس بھری نظروں سے ادھر اُدھر گھورتے ہوئے دکان میں داخل ہوئے۔ میں ان کی وضع قطع دیکھ کر ذہنی طور پر ٹھٹھک گیا لیکن میں نے اپنے حواس اور اعصاب پر قابو رکھا۔ اتفاق سے میرا ملازم لڑکا وہاں موجود نہیں تھا۔ پھر اس بات کا اطمینان کر لینے کے بعد کہ میں اکیلا ہی ہوں انہوں نے پر اسرار انداز میں مجھ سے پوچھا: "کیا میرے ہاں ڈبلیو۔ ڈبلیو کی کتب دستیاب ہیں"؟ میں نے جواب دیا کہ یہ اُردو کی کتابوں کی دکان ہے۔ انگریزی کتب ہمارے ہاں نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ انہیں بھی اُردو کی کتابیں ہی چاہئیں اور ڈبلیو۔ ڈبلیو کی کتب اُردو ہی میں ہوتی ہیں اور وہ بڑا مشہور عوامی مصنف ہے۔

اب میرا خطرہ دور ہو چکا تھا کہ وہ گاہک ہی تھے اور ان کا ارادہ کوئی واردات کرنے کا نہیں تھا لیکن میرا جواب سننے کے بعد وہ دکان سے نکل گئے۔ جب دکان پر کام کرنے والا لڑکا واپس آیا تو میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اسے معلوم ہے کہ ڈبلیو۔ ڈبلیو نامی عوامی مصنف کی کون سی

Marfat.com

کتابیں مارکیٹ میں ہیں؟ پہلے تو وہ کچھ حیران ہوا لیکن پھر کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔ بولا: ڈبلیو، ڈبلیو سے مراد وہی دہانوی ہے جو ایک فرضی نام ہے۔ جتنے بھی لوگ فحش کتابیں لکھتے ہیں وہ ڈبلیو، ڈبلیو کا فرضی نام ہی استعمال کرتے ہیں۔ اب میرے ذہن میں خیال آیا شاید میرے پاس آنے والے یہ دونوں نوجوان ڈبلیو ڈبلیو کے نام سے فحش کتابیں لکھتے ہوں اور یہ جائزہ لے رہے ہوں کہ کیا میں بھی ان کے مسودات کی اشاعت کا ذریعہ بن سکتا ہوں...... یا پھر وہ مجھے اشارہ کر رہے ہوں کہ میں بھی ڈبلیو۔ ڈبلیو کی کتابیں اپنی دکان پر فروخت کے لیے رکھوں ..... مجھے بعد میں علم ہوا کہ ان کی مطلوبہ کتابوں کا مرکز ہسپتال روڈ اور موری دروازہ میں ردی بیچنے اور خریدنے والے تھے۔ ڈبلیو، ڈبلیو کی کتابیں انتہائی گھٹیا کتابت، سستے نیوز پرنٹ اور بغیر جلد کے طبع ہوتی تھیں۔ منہ مانگی قیمت پاتی ہیں اور بکتی بھی پوری قیمت پر ہیں کیونکہ ان کے اصل خریدار کے نزدیک قیمت کی اہمیت نہیں ہوتی، وہ اپنے سفلی جذبات کی تسکین چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک کتاب کی زیادہ قیمت کچھ وقعت نہیں رکھتی۔ مجھے افسوس ہے اُردو کے بعض نامور ناول نگار بھی اس فحش نگاری میں شامل ہیں لیکن میں ایسی کتابیں لکھنے، لکھوانے، چھپوانے اور بیچنے والوں پر تین حرف بھیجتا ہوں۔

ایک مشہور کالم نگار؟

ایک بہت بڑے ادیب اور نامور شاعر اور معروف صحافی سے میں نے اس کے تحریر کردہ خاکوں کی ایک کتاب اعلیٰ پیمانے پر شائع کرنے کا معاہدہ کیا۔ کچھ رقم بطور پیشگی بھی ان کو پیش کر دی۔ انہوں نے میری اکیڈمی کو طباعت و اشاعت کے لئے مسودہ بھی دے دیا جس کے مضامین کی مطابقت اور ان کے ایما سے ایک معروف مصور سے تصاویر بھی بنوائی گئیں۔ طباعت کے لیے کتابت (کمپوزنگ) بھی ہوگئی۔ کتاب کے چھاپنے کا مرحلہ آیا تو مجھے پتہ چلا کہ یہ کتاب تو ایک نئے پبلشر نے شائع بھی کر دی ہے۔ شاید میرے اس ادیب دوست کو نئے پبلشر نے زیادہ معاوضہ پیش کر دیا ہوگا۔ حالانکہ ان کا اخلاقی فرض تھا کہ جب مقبول اکیڈمی سے ان کی بات ہو چکی تھی تو وہ دوسرے پبلشر سے معاملہ نہ کرتے۔ اگر معاوضے میں اضافے کی بات تھی تو وہ پہلے مجھے

Marfat.com

اعتماد میں لیتے اور میں انکار کرتا تو کسی دوسرے ناشر کے پاس جاتے۔ یہ کالم نگار اپنے اخبار میں پوری دنیا کو صداقت، دیانت، انصاف اور اخلاق کا سبق دیتے ہیں لیکن خود بداعمالی کے حمام میں ننگے ہیں اور روپے پیسے کے معاملے میں انتہائی حریص ہیں۔ اس وعدہ خلافی اور بدمعاملگی کے باوجود وہ ہمارے لیے تو اب بھی محترم ہیں۔

ایک اور نامور اسکالر؟

لاہور میں ایک اور بہت پرانے دانشور ہیں۔ انہوں نے متعدد جلدوں پر مشتمل دو ضخیم سلسلہ وار کتابوں کی اشاعت کا میرے ساتھ معاہدہ کیا۔ معاہدے کے مطابق میں نے ان کو چند ابتدائی کتابوں کا کچھ معاوضہ بھی پیش کر دیا اور انہوں نے مجھے اپنی کتابیں دے دیں۔ میں نے انہیں کمپیوٹرائزڈ کرایا تو وہ آئے اور کمپیوٹرائزڈ کیا ہوا مواد ایک نظر دیکھنے کے لیے لے گئے۔ جب انہوں نے کمپیوٹرائزڈ مسودے کئی ماہ تک واپس نہ کیے تو میں نے ان کی خدمت میں کئی پیغامات بھیجے۔ ٹیلیفون بھی کیے لیکن وہ لیت ولعل ہی کرتے رہے یہاں تک کہ پورے دس سال بیت گئے۔ موصوف نے مسودے واپس کیے نہ ہی پیشگی لی ہوئی رقم لوٹائی اور نہ ہی مسودوں کی کمپیوٹرائزیشن پر آنے والے اخراجات کے بارے میں کوئی بات کی۔ پرانے دوست ہونے کی وجہ سے میں آج تک ان کی ناز برداری کر رہا ہوں کہ ان سے میری دوستی کا رشتہ قائم رہے۔

(اللہ تعالیٰ ان کو وعدہ ایفا کرنے کی توفیق دے)

ایک معزز ناول نگار؟

میرے ایک اور معزز ناول نگار دوست ہیں۔ ان کے ناول کی کمپوزنگ میں دو چار غلطیاں رہ گئیں جو معمول کی بات ہے۔ لیکن ناول نگار صاحب نے برسوں کی دوستی کو بالائے طاق رکھ کر آنکھیں ماتھے پر لگالیں، اپنے وکیل کی معرفت مجھے نوٹس بھجوایا کہ ان کے کسی مخالف ادیب کے کہنے پر ناول میں ارادۃً غلطیاں چھوڑی گئی ہیں۔ اگر غلطیاں غیرارادی ہیں تو پبلشر نے ان کو

Marfat.com

درست کرنے کی تکلیف نہیں کی۔ میں آج تک اپنے اس محترم ناول نگار کے رویے کو بھول نہیں سکا لیکن ان کو اپنے دل کے زخم دکھانے کا فائدہ کیا ہے۔ میں ان کے لیے دعا ہی کر سکتا ہوں۔

انوکھی ناراضی

ایک بڑے ملنسار، خوش اخلاق اور دنیاوی لحاظ سے اعلیٰ مرتبے پر فائز ایک کرم فرما ناراض ہو گئے تو میری پریشانی بڑھ گئی۔ مقبول اکیڈمی کی ایک کتاب میں ان کی صرف تصاویر استعمال ہوئی تھیں۔ ان کو شکایت یہ تھی کہ ان کو کم قیمت پر یہ کتاب کیوں پیش نہیں کی جاتی۔ حالانکہ اصول یہ ہے کہ ہم ادیب کو اس کی کتاب کی دس یا پندرہ جلدیں (طے شدہ معاہدے کے مطابق) بلا معاوضہ پیش کر دیتے ہیں۔ وہ مزید کتب طلب کریں تو وہ ہم نصف طبع شدہ قیمت پر مہیا کرتے ہیں۔ متذکرہ کرم فرما سے دوستی اور پرانے تعلقات کی بنا پر ہم ان سے نصف سے بھی کم قیمت لے لیتے تھے اور ان کی مطلوبہ تعداد میں فراہم کر دیتے تھے۔ اس کے باوجود بھی وہ ہم سے خوش نہ ہوں اور قطع تعلق کر لیں تو آپ ہی فیصلہ فرمائیں کہ ہم جائیں تو جائیں کہاں؟ حالانکہ اپنی تصاویر کے استعمال کی طے شدہ قیمت بھی وہ وصول کر چکے تھے اور تصاویر بھی ان کو واپس کر دی گئی تھیں۔

ایک معروف ادیب

بچوں کے ایک معروف ادیب سے ہمارے دیرینہ تعلقات ہیں۔ گزشتہ چند سالوں کے دوران میں ہم ان کی بچوں کی کئی کتابیں شائع کر چکے ہیں۔ ان کے کئی دوسرے ناشرین سے بھی تعلقات ہیں جو ان کی کتابیں چھاپتے رہتے ہیں۔ وہ چند ماہ قبل میرے پاس تشریف لائے اور اپنی مالی پریشانیوں کا اظہار کیا، میں نے ایک موضوع پر کتاب لکھنے کے لئے کہا اور ساتھ ہی انہیں چار ہزار روپے پیشگی دیئے تا کہ انکی مالی پریشانی دور ہو اور وہ سکون سے اپنا کام کر سکیں، لیکن افسوس کہ آٹھ دس ماہ سے ان کی طرف سے میرے مجوزہ منصوبے پر کسی کارگزاری کی خبر نہیں ملتی، ٹیلیفون کریں، تو جواب نہیں ملتا۔

Marfat.com

میری کتب فروش برادری کا ایک بندہ

اب مجھے ایک ہم پیشہ بھائی یاد آ رہا ہے۔ وہ بڑا کاروباری اور پیشہ ورانہ گفتگو کا ماہر ہے۔ دوسرے شخص کو آئینے میں اتارنا اور اپنا مطلب پورا کر لینا، اس کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔ کتابوں کے کاروبار کے علاوہ وہ کئی اور کاموں میں بھی اپنے آپ کو پھنسا لیتا ہے۔ مقصد صرف پیسہ کمانا ہوتا ہے اور وہ پیسہ بڑی خوبی سے حاصل کر لیتا ہے لیکن اسے سلیقے سے خرچ نہیں کرتا یا اگر کرتا ہے تو پھر اس کو اندوختہ بنا لیتا ہے یا شاید آنے والی نسل کے لئے اثاثے محفوظ کرتا ہے۔

تقریباً اٹھارہ برس گزرے کہ اس نے مجھ سے پچیس ہزار روپے کتابوں کے ایک اہم آرڈر کی تعمیل کے لیے لیا۔ اصولاً اور وعدہ کے مطابق تو اُسے آرڈر کی تکمیل اور تعمیل کے بعد میرا روپیہ واپس کر دینا چاہیے تھا حالانکہ روپیہ میں نے اسے محض ہمدردی اور دوستی کے تحت دیا تھا۔ منافع میں میرا کوئی حصہ نہ تھا لیکن اب اکیسویں صدی کے ساڑھے چھ اور بیسویں صدی کے بارہ سال گزر گئے ہیں لیکن شخص مذکور نے مجھے ایک پائی واپس نہیں کی۔ دیرینہ دوستی کی وجہ سے میں کسی محفل میں اس کا ذکر نہیں کرتا مگر میرے یہ دوست قرض واپس کرنے کے بارے میں سوچتے ہی نہیں اس کو مال مفت سمجھ کر ہضم کئے بیٹھے ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرے کئی دوسرے دوستوں کو بھی اُس سے یہی شکایت ہے۔ اس بندے میں ایک یہ خوبی ہے کہ وہ ملتا ہے تو پیسے ادا کرنے کا اقرار بھی کرتا ہے۔ ہماری اس برادری میں اور بھی کئی بھائی ایسے ہیں جو مقبول اکیڈمی کا پیسہ دبائے بیٹھے ہیں لیکن ہم ان سے تعلقات قائم رکھے ہوئے ہیں۔

ایک شاعر کا کردار

ایک نوجوان شاعر نے اپنا پہلا مجموعہ کلام چھپوانے کے لئے میرے ادارے میں کئی چکر لگائے، اس کے مسودے میں کتاب کا پیش لفظ محترمہ یاسمین حمید صاحبہ کا لکھا ہوا تھا جو ملک کی معروف شاعرہ ہیں۔ محترم ڈاکٹر اختر شمار نے بھی اس شاعر کی تعریف میں چند سطریں لکھی ہوئی تھیں لہٰذا میں نے اس کی حوصلہ افزائی کے لئے کتاب چھاپنے کی حامی بھر لی، کتاب چھپ گئی تو

Marfat.com

محترمہ یاسمین حمید کا خط موصول ہوا کہ ''کتاب میں میرے نام سے جو پیش لفظ شائع ہوا ہے، وہ میں نے نہیں لکھا، میرا نام غلط استعمال ہوا ہے،،۔اس نئے شاعر نے سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے ایک مشہور شاعرہ کے نام سے ایک تحریر منسوب کر کے ایسی بد دیانتی کی تھی جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یاسمین حمید صاحبہ سے میں نے خط لکھ کر معذرت کی اور انہیں بتایا کہ یہ حرکت اس نئے شاعر نے کی تھی اور اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں تھا۔اس کے بعد اس کی ہم نے کوئی کتاب نہیں چھاپی۔

ایک پروفیسر ادیب

مقبول اکیڈمی نے لاہور کے ایک بڑے کالج کے ایک پروفیسر صاحب کی ایک ادبی کتاب شائع کی اور انہیں طے شدہ معاوضہ بھی ادا کر دیا گیا۔ کتاب چھپ گئی تو ان کے ہم مرتبہ چند دوستوں نے کتاب کی بڑی تعریف کی۔ اس سے انہوں نے اپنے دل میں یہ خیال بٹھا لیا کہ ان کی کتاب درج شدہ تعداد سے بھی زیادہ بک گئی ہے اور ہم نے اس کا زائد ایڈیشن ان کی اطلاع کے بغیر چھاپ لیا ہے۔ پروفیسر صاحب ایک نامور ادیب کو اپنے ساتھ لے کر آئے اور مزید معاوضے کا مطالبہ کیا۔ میں نے دونوں صاحبان سے کہا کہ جو رائلٹی طے ہوئی تھی وہ ادا کی جا چکی ہے۔ کتابوں کی فروخت کی تفصیل بھی ان کے سامنے رکھ دی لیکن وہ مطمئن نہ ہوئے۔ میں نے فوری حل یہ نکالا کہ ان کے ساتھ آنے والے ادیب کی خاطر ان کو مزید رقم دی جو ان کا حق نہ تھا۔ خدا جانے ان کی بدگمانی رفع ہوئی یا نہیں۔

Marfat.com

ناشرین اور الزامات

میں نے مصنف اور ناشر کے درمیان شکر رنجی کی چند مثالیں گزشتہ صفحات میں پیش کر دی ہیں۔ ناشر کو بدنام کرنے کے لیے کئی قسم کے الزامات گھڑے اور افواہیں اڑائی جاتی ہیں لیکن کوئی ٹھوس دلیل نہیں دی جاتی۔ چند الزامات یہ ہیں:۔

☆ پبلشرز حضرات مصنفین کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔

☆ پبلشرز جعلی ایڈیشن چھاپ لیتے ہیں۔ پہلے ایڈیشن پر تعداد صرف پانچ صد چھاپتے ہیں۔

☆ پبلشرز رائلٹی ایک ایڈیشن کی دیتے ہیں لیکن دراصل کئی ایڈیشن چھاپ لیتے ہیں۔

☆ رائلٹی دیتے ہوئے ناشر کی جان نکلتی ہے حالانکہ معاوضہ کوڑیوں میں ہوتا ہے۔

☆ ناشر مصنف پر بہت ظلم ڈھاتا ہے۔

☆ وہ جو رائلٹی طے کرتا ہے وہ بھی یک مشت ادا نہیں کرتا بلکہ قسطوں میں دیتا ہے۔

☆ ناشر کتابوں کی آمدنی سے بلڈنگیں کھڑی کر لیتا ہے جبکہ مصنف کی حالت خستہ ہی رہتی ہے۔

☆ پبلشر معاہدہ اگر ایک ہزار کتاب چھاپنے کا کرتا ہے تو دس ہزار چھاپ لیتا ہے۔

اب ایک لطیفہ سنیئے جسے بالعموم سچ سمجھا جاتا ہے" کتابوں کے کاروبار سے متعلق تین افراد انتقال کر گئے۔ ایک ادیب تھا، دوسرا ناشر تھا اور تیسرا کتابوں کا کباڑیا تھا۔ کسی محکمے نے ان کے ذمے واجبات وصول کرنے کی خاطر ان کے اثاثوں کی تفتیش کی تو ادیب کا اثاثہ سو روپ

Marfat.com

مالیت کا بھی نہ تھا۔ پبلشر کا اثاثہ تقریباً دس ہزار کا نکلا جبکہ کباڑیے کا اثاثہ حیران کن تھا یعنی ایک لاکھ روپے"۔

مندرجہ بالا تمام الزامات غلط ہیں اور لطیفہ من گھڑت ہے۔ کوئی اچھا ناشر ہم وطن ادیب کی کوئی کتاب بلا اجازت نہیں چھاپتا کیونکہ اجازت ہی میں اس کی اپنی بچت اور اس کے کاروبار کی شہرت ہے۔ وہ معاہدے کے مطابق چلتا ہے۔ انحراف کرے گا تو اسے گرفت میں لینے کا قانون موجود ہے۔ کچھ ادیب نامور ہوتے ہیں۔ اِدھر ان کی کتاب چھپتی ہے اُدھر بک جاتی ہے۔ ایسے ادیب منہ مانگی رائلٹی لیتے ہیں۔ کچھ بڑے ناموں والے ادیب ہوتے ہیں لیکن عوام میں مقبول نہیں ہوتے۔ ان کی کتب آہستہ آہستہ بکتی ہیں۔ کچھ ادیب بڑے نہیں ہوتے لیکن سکولوں کالجوں کے طلبا میں مقبول ہوتے ہیں۔ ان کی کتب تھوڑے سے عرصے میں فروخت ہو جاتی ہیں۔ ناشر کو ایسا مصنف ہی اچھا لگتا ہے جس کی کتاب پر اس کا لگا ہوا سرمایہ جلد واپس آ جائے۔ اشاعتی کاروبار میں بھی طلب اور رسد کا اصول ہی چلتا ہے۔ تاہم مقبول اکیڈمی نے اس اصول پر بھی عمل کیا کہ بہت زیادہ اور جلد فروخت ہونے والی کتابوں کے ساتھ ٹھوس علمی ادبی اور تاریخی کتابوں کی معتد بہ تعداد بھی شائع کی اور ان کی سست رو فروخت کو خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ اس قسم کی اعلیٰ معیاری کتابوں نے ہمارے ادارے کی ساکھ قائم کی جو روز افزوں رہی۔

میں نے جب سے کتابوں کا کاروبار شروع کیا ہے تب سے لے کر آج تک کسی ادیب یا مصنف سے معاہدہ شکنی نہیں کی۔ کبھی طے شدہ معاوضے کی شرائط سے انحراف نہیں کیا۔ بعض اوقات غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں لیکن اکثر ان کی بنیاد بغض اور کینہ پر ہوتی ہے یا کسی حاسد نے ان کی آبیاری کی ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ افواہ کا گلا ابتدا میں ہی گھونٹ دینا چاہیے اور اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ فریق مخالف سے ملاقات کر کے اصل حقیقت واضح کر دی جائے۔ میں غلطی کو تسلیم کر لینا بھی انسانی عظمت سمجھتا ہوں۔ بہترین دوست وہ ہے جو آپ کو غلطی کی طرف متوجہ کرائے۔ میں نے ہمیشہ اپنے ضمیر کو صحت مند رکھنے کی کوشش کی۔ میری نیت کی خبر رکھنے والی

Marfat.com

بالاترین ہستی نے مجھے کامیابیوں سے نوازا ہے۔

بادلِ نخواستہ

دلچسپ بات یہ ہے کہ ''وکھری ٹائپ'' کے لوگوں میں بیشتر ادیب بھی شامل ہیں۔ میں نے اس قسم کے ادیبوں کے نام نہیں لیے لیکن ان کے بارے میں بادلِ نخواستہ حقیقت حال لکھ کر کچھ افسردہ تھا۔ یہ سطور لکھنے کے دوران جناب احمد ندیم قاسمی کا انتقال ہو گیا۔ طبیعت مزید سوگوار ہو گئی۔ ان کی وفات پر ممتاز تجزیہ نگار ڈاکٹر صفدر محمود صاحب نے ایک تعزیتی کالم بعنوان ''روشن ستارے جو ڈوب گئے'' لکھا، جس کا آخری حصہ یہ تھا:

''وہ (احمد ندیم قاسمی) اخلاص، مروت، شرافت اور محبت کا نمونہ تھے۔ انہوں نے ایک صاف، شفاف زندگی گزاری، یہ لکھنے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ یہ ضروری نہیں کہ بڑا ادیب، بڑا انسان بھی ہو کیونکہ یہ زندگی کے مختلف شعبے ہوتے ہیں۔''

اس ضمن میں محترم امجد اسلام امجد کی رائے ملاحظہ فرمائیں:۔

''جو ادیب یہ کہہ رہا ہے کہ مجھے میرا حق نہیں مل رہا سب سے پہلے دیکھنا تو یہ ہے کہ جس حق کا وہ مطالبہ کر رہا ہے کیا واقعی وہ اس کا حق ہے؟ پھر اس نے اس حق کے لئے اپنے آپ کو کیسے منتخب کر لیا ہے؟ یہ کہنا کہ میرا حق دوسرے مار رہے ہیں کہنا آسان ہے، لیکن دیکھنا یہ چاہئے، کہ کیا وہ اس کا اہل بھی ہے''۔

(نوائے وقت سنڈے ایڈیشن 2-7-2006)

محترم عباس نجمی لکھتے ہیں

''آج کا ادیب بھی کسی اجتماعی فکر تحریک یا جدوجہد کا حصہ بننے کی بجائے اپنی ذات کے حصار میں قید ہوتا جا رہا ہے۔ خود غرضی، مفاد پرستی، ابن الوقتی،

Marfat.com

خود اعتمادی اور سرکار دربار سے رابطوں کی حرص وہوس پر مبنی سوچ نے پاکستانی ادیب کو معاشرے میں بے وقعت کر دیا ہے۔ جب ادیب اپنی عزت کا لحاظ خود نہیں کرے گا، جب اس کی ''کریڈیبلٹی،، نہیں ہوگی، وہ اپنے وقار کی حفاظت خود نہیں کرے گا تو معاشرہ اس کو کیا اہمیت دے گا۔ آج کا ادیب (اِلّا ماشاءاللہ) صرف اور صرف (بقول حبیب جالب) اپنی ترقی کے لئے سرگرداں اور مصروف عمل ہے،،۔ (نوائے وقت، سنڈے ایڈیشن 2-7-2006)

یہ حقیقت پر مبنی جملے پڑھ کر ان ''وکھری ٹائپ'' کے لوگوں کو بھی میں نے اپنے دل میں جگہ دے دی اور اپنے خالقِ حقیقی سے دعا کی کہ وہ خود ان کی اصلاح فرمائے اور دوسروں پر اعتماد کرنے کے رجحان سے سرفراز کرے۔

☆☆..........☆..........☆☆

Marfat.com

ذکر کچھ افسران کا

ملک یا مملکت کا نظم و نسق خوش اسلوبی سے چلانے کے لیے اعلیٰ دماغ اور بھرپور صلاحیتیں رکھنے والے افراد کی ضرورت ہوتی ہے۔ ملک میں نظام جمہوری ہو یا غیر جمہوری لیکن ملک کے عوام کے کام ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں جن کی تکمیل سے عوام راحت اور سکون محسوس کرتے ہیں۔ مجھے اپنے اس کاروبار کے سلسلہ میں حکومت کے بڑے بڑے افسروں سے ملنے کا اتفاق ہوتا رہا ہے۔ اس ضمن میں مجھے یاد آ رہا ہے کہ میرا پہلا سابقہ ایک انکم ٹیکس افسر سے پڑا تھا اور آپ پڑھ چکے ہیں کہ اس نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا۔ بلاشبہ افسر ہماری طرح کا انسان ہی ہوتا ہے لیکن وہ عام انسانوں سے اس لئے برتر ہوتا ہے کہ اس کے پاس اختیارات ہوتے ہیں۔ بعض افسران اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے ہیں اور خلق خدا کی بد دعائیں لیتے ہیں۔ لیکن اچھے افسران اپنے اختیارات سے تجاوز نہیں کرتے اور قواعد و ضوابط کی پابندی کر کے میرٹ پر فیصلے کرتے اور حقدار کا حق ادا کرتے ہیں۔ خلق خدا ان سے خوش رہتی ہے اور ان کا اپنا ضمیر بھی مطمئن رہتا ہے۔ میرا مزاج ایسا ہے کہ میں جب دیکھ لیتا ہوں کہ فلاں افسر اپنے اختیارات کو درست طور پر استعمال کر رہا ہے، لوگ اس کے متعلق اچھی رائے رکھتے ہیں اور عملی زندگی میں بھی وہ نیک اطوار ہے تو میں اس کی اپنے دل کی گہرائیوں سے عزت کرتا ہوں۔ اس کا احترام کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ کئی اعلیٰ افسران سے زندگی میں مجھے سابقہ پڑا ہے جیسے محکمہ تعلیم کے سندھی افسر سید پناہ علی شاہ، جناب جاوید اقبال اعوان، محمد احسان الحق سلیمانی، ڈاکٹر اللہ بخش ملک، جناب خالد مسعود چوہدری،

Marfat.com

جناب اسد اللہ خاں سُنبل اور رشید ظفر صاحب وغیرہ۔ اپنی اس تحریر میں کتابوں سے رابطہ رکھنے والے افسران اور دیگر اعلیٰ پائے کے افسران کا ذکر محض اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کے لیے کر رہا ہوں۔ ان لوگوں کا نام اور کام میرے دل پر مرتسم ہے۔ بلاشبہ وہ اپنی ذات میں عظیم ہیں اور ان کا فیض ہر کہ و مہ کیلئے عام ہے۔

سید پناہ علی شاہ

وحدت مغربی پاکستان (ون یونٹ) کے نتیجے میں سید پناہ علی شاہ کراچی سے تبدیل ہو کر لاہور ڈویژن کے انسپکٹر آف سکولز کے عہدے پر تشریف لائے۔ آپ بڑے شیریں زبان اور کھلے دل و دماغ کے انسان تھے۔ اپنے قیام کے دوران انہوں نے پنجاب کی مرکزی ڈویژن کے اساتذہ کرام اور محکمے کے افسران کے دلوں پر اپنے اخلاقِ عالیہ کے گہرے نقوش ثبت کیے۔ میں جب پہلی بار ان سے ملا تو اس وقت وہاں ضلعی انسپکٹر تعلیم ملک غلام حیدر مرحوم بھی موجود تھے جو مجھے بڑے شیریں دہن اور شائستہ زبان انسان نظر آئے تھے۔ ان کا سرائیکی لہجہ ان کی گفتگو کو مزید تاثیر بخشتا تھا۔ وہ پناہ علی شاہ صاحب سے کہہ رہے تھے۔ ''سوہنا سائیں۔ آپ کا کسی سے کیا مقابلہ..... آپ تو ہیں ہی سادات کے باغ کا پھول۔،، مجھے ملک غلام حیدر کا پناہ علی شاہ صاحب کو دیا ہوا ''سوہنا سائیں'' کا لقب بہت پسند آیا لیکن میں اسے پناہ علی شاہ صاحب کے لیے کبھی استعمال نہ کر سکا۔ ان کو جب بھی مخاطب کیا شاہ صاحب ہی کہا۔

میں ان کے ذوق کی دو کتب لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو بلاشبہ میرا مقصد ڈویژنل انسپکٹر آف سکولز سے ذاتی تعلق قائم کرنا تھا جو میرے کاروبار میں بھی معاون ہو سکتا تھا۔ میری یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی۔ شاہ صاحب اپنے ذوق کی کتابیں دیکھ کر کھل اٹھے اور مجھے ان کی قیمت ادا کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے ان سے عرض کیا کہ یہ گستاخی میں نہیں کر سکتا۔ وہ کتابوں کے رسیا تھے لیکن وہ اپنے اونچے عہدے کی وجہ سے اپنی پسند کی کتابیں تلاش نہیں کر سکتے تھے۔ اس کام کے لئے انہوں نے مجھے کئی بار یاد کیا اور میں نے حاضری دی۔ اور ان کی مطلوبہ کتابیں فراہم

Marfat.com

کرنے کی کوشش کی، شاہ صاحب سے مل کر ہمیشہ طمانیت ملتی۔ ان کی انسان دوستی سے مجھے حوصلہ افزا سبق ملتا۔ بلاشبہ وہ میرے لیے ایک مینارۂ نور ثابت ہوئے۔ شاہ صاحب اتنے اچھے انسان تھے کہ دس پندرہ دن گزر جاتے تو مجھے ٹیلیفون کر کے بلا لیتے۔ پھر وہ لاہور ریجن کے ڈپٹی ڈائریکٹر کی اسامی پر تعینات ہو گئے۔ تب بھی مجھے ان سے ملاقاتوں کا شرف حاصل رہا۔ بالآخر وہ واپس کراچی تبدیل ہو گئے۔

کراچی کا دورہ

وہ دور میری کاروباری زندگی کی جدوجہد کا دور تھا۔ میرا کراچی جانا ہوا تو میں نے شاہ صاحب سے ملاقات کی۔ وہ بڑے تپاک اور محبت سے ملے۔ میری بھرپور تواضع کی اور پوچھا کہ میں کراچی کس کام سے آیا ہوں اور کیا وہ میری کچھ مدد کر سکتے ہیں؟ میں نے ان سے عرض کیا ''کراچی میں میرا آنا مقبول اکیڈمی کی طبع کردہ کتب بیچنے کے لیے ہے اور اگر آپ اپنے خاص الخاص ہیڈ ماسٹروں یا ڈسٹرکٹ انسپکٹرز کو میری مدد کرنے کے لئے کہہ سکیں تو یہ میری عملی معاونت ہوگی''۔

وہ مسکرائے اور کہا ''میں آپ کو سفارشی نہیں تعارفی خطوط چند اچھے دوستوں کے نام دیتا ہوں۔ آپ ان سے ملیں۔ بات خود کر لیں، اُمید ہے وہ میری آشنائی کا بھرم رکھیں گے۔'' ذمہ دار اور باعزت افسران سفارش نہیں کرتے، ان کا تعارف ہی سفارش ہوتا ہے۔ میں ان کے تعارفی خطوط کے ساتھ حیدرآباد، ٹھٹھہ اور بدین وغیرہ کے اضلاع میں گیا۔ کچھ افراد نے اسی وقت کتب کی فراہمی کے احکامات دیئے۔ بعض نے مستقبل کے لیے پکے وعدے کیے اور ان وعدوں کو ایفا بھی کیا گیا۔

دوردراز کے سندھی علاقوں میں میرا یہ سفر بڑا یادگار سفر تھا۔ کاش میں نے اسے قلمبند کیا ہوتا۔ اس وقت تو میں نے اپنے شوق وجذبے سے یہ سفر طے کر لیا لیکن بعد میں ذوری کے باعث میں یہ سلسلہ قائم نہ رکھ سکا۔ کئی بل آج تک مختلف سکولوں اور اداروں سے وصول نہیں ہوئے۔ اب

Marfat.com

تو شاید وہ لوگ وہاں موجود ہی نہیں ہوں گے جنہوں نے میری پذیرائی کی تھی۔ شاہ صاحب بھی مدت ہوئی ریٹائر ہو چکے ہیں۔ اللہ کرے وہ خیریت سے ہوں۔ کوشش کے باوجود ٹیلیفون پر ان سے رابطہ نہیں ہو سکا۔ تاہم ان کی بے لوث شخصیت کے گہرے نقوش میرے ذہن پر اب تک ثبت ہیں۔

پناہ علی شاہ صاحب کے تبادلے کے بعد پورے مغربی پاکستان میں کتب کی فراہمی کا کام آہستہ آہستہ صوبائی سطح کے نزدیکی دکانداروں نے سنبھال لیا۔ مقبول اکیڈمی اپنے ٹنڈروں میں مناسب ڈسکاؤنٹ درج کر دیا کرتی تھی لیکن اب مقامی دکاندار زیادہ سے زیادہ کمیشن پہ کتب خرید کر نزدیکی سکولوں کی لائبریریوں کو فراہم کرنے لگے۔ گزشتہ تیس پینتیس برس سے پنجاب کے علاوہ دیگر صوبوں سے بھی خریداری کے لئے علاقائی دکاندار ہی آتے ہیں۔ وہ ہم سے اور ہم ان سے دکانداروں جیسا کاروباری سلوک کرتے ہیں، جس کا ایک ضابطۂ اخلاق بھی بن چکا ہے۔

پنجاب کے چند افسران

دوسری طرف براہ راست ہمارا دائرہ کار پنجاب کے افسران اور سکولوں کے سربراہان تک محدود ہو گیا ہے۔ گزشتہ کچھ عرصے کے دوران بھی ہمیں خوشگوار اور ناخوشگوار قسم کے افسران سے رابطہ پڑتا رہا۔ میں یہاں صرف چند کرداروں کا ذکر کرتا ہوں۔

محمد منیر

2004ء میں محمد منیر صاحب ضلع نارووال میں ایگزیکٹو ڈسٹرکٹ آفیسر "لٹریسی" تھے۔ ضلع نارووال کے لیے انہوں نے حکومت کے لیے جس قدر بھی مال کی خریداری کی اس میں انہوں نے کسی بھی فرم سے ناجائز طور پر نہ کمیشن حاصل کی اور نہ ہی کسی فرم کو بلاوجہ تنگ کیا۔ ان کی دیانت وامانت کا یہ حال تھا کہ انہوں نے ضلع کے اکاؤنٹ آفیسر کے دفتر کے کسی اہلکار کو بھی ٹھیکیداروں سے کمیشن نہیں لینے دیا۔ مالی سال کی آخری رات (30 جون) تو وہ بذات خود ضلعی اکاؤنٹس آفس

Marfat.com

میں رات گئے تک بیٹھ کر اپنے بل پاس کرواتے۔ ان کی نیت نیک تھی لہٰذا تمام کام بھی درست طور پر انجام پذیر ہوتا۔

مثبت اقدام کا فروغ مثبت اقدامات ہی سے ہوتا ہے۔ مجھے علم ہے کہ محمد منیر صاحب کو محکمانہ طور پر ان کی اس دیانتدارانہ کارکردگی پر کوئی معاوضہ یا اعزاز نہیں دیا جائے گا لیکن فطرت نے انہیں ''اطمینان قلب'' عطا کیا تھا جو ان کے چہرے پر نور بن کر چمکتا۔ میری رائے میں یہ سب سے بڑا اعزاز ہے۔

ملک محمد شریف

2004ء میں ملک محمد شریف ایگزیکٹو ڈسٹرکٹ آفیسر (لٹریسی) شیخوپورہ تھے۔ اس سال ضلع شیخوپورہ کے سکولوں کے لیے اشیاء خریدنے کے لیے خطیر گرانٹ دی گئی تھی۔ ضلع شیخوپورہ کی طرف سے جب اخبارات میں ''ٹنڈر نوٹس،، چھپا تو ہم نے بھی ٹنڈر دیا۔ ہمارے نرخ مقابلتہً کم تھے لہٰذا قواعد وضوابط کے تحت ہمیں مال فراہم کرنے کا حکم مل گیا۔ ملک محمد شریف صاحب نے ہم سے کہا کہ نرخوں میں کچھ کمی کریں۔ انہوں نے ہم سے کسی قسم کی کمیشن یا کوئی زائد شے طلب نہیں کی۔ اکاؤنٹ آفس سے ہمارے بل پاس کروانے کے بارے میں انہوں نے ہم سے معذرت کر لی۔ لہٰذا وہاں سے بل پاس کرانے کیلئے ہم نے اپنے ذرائع استعمال کئے۔ سب حضرات جانتے ہیں کہ اکاؤنٹ آفس سے بل کس طرح پاس ہوتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس دفتر کے سامنے ای۔ ڈی۔ او تعلیم بھی بے بس تھا۔

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

وقت کے ساتھ ساتھ دنیا کی تاریخ بھی تبدیل ہوتی چلی آرہی ہے۔ غلاموں اور لونڈیوں کی تجارت انسانی تاریخ کا دلگداز باب ہے۔ یقین جانیے کہ یہ انسانی کاروبار ختم نہیں ہوا لیکن اس کی شکل تبدیل کر دی گئی ہے۔ جب کوئی کہتا ہے کہ فلاں شخص میرا آدمی ہے تو اس کا

Marfat.com

مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص کسی معاوضے کے عوض خریدا جا چکا ہے۔ ہم اپنے کتابوں کی اشاعت اور فروخت کے کاروبار میں بھی مختلف المزاج لوگوں سے ملتے ہیں۔ بعض کو تو ہم پہلے ہی سے جانتے پہچانتے ہوتے ہیں۔ جو اجنبی ہوتے ہیں وہ بھی دو چار ملاقاتوں میں پہچانے جاتے ہیں کہ وہ کتنے پانی میں ہیں۔ ازاں بعد ان سے معاملہ اس پانی کی اتھلائی اور گہرائی کے مطابق ہوتا ہے۔ آج کی دنیا میں بھی لوگ اپنے اپنے ظرف کے حساب سے ہی استعمال ہو رہے ہیں۔ پھر بھی ہمارے پاس ہر سال چند لائبریرین، چند اساتذہ یا چند گاہک ایسے ضرور آتے ہیں جو انتہائی شریف النفس، بے لوث اور راہ راست پر چلنے والے ہوتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ دیانتداری ان کا اسلوبِ حیات ہے اور انہیں امانت کے راستے سے کوئی بھٹکا نہیں سکتا تو یہ غلط نہ ہوگا۔ اس قسم کے لوگ کہتے ہیں کہ آپ نے جو رعائیت یا کمیشن دینی ہے وہ طلبہ اور قارئین کو دینی ہے اسے بل سے وضع کریں اور اس کی بھی کتابیں ہی دے دیں تا کہ ہم طلباء کو زیادہ سے زیادہ کتابیں فراہم کر سکیں۔ وہ دور دراز سے آ کر کتب خریدتے اور اُن کو لے جانے والی جگہ تک لے جانے کا خرچ بھی اپنی جیب سے ادا کرتے ہیں۔ وہ اپنے اس نیک کام کی جزا اپنے رب سے طلب کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا ایسے ہی لوگوں کے ایثار سے قائم ہے۔

رشید ظفر

غالباً 1996-97ء میں پنجاب میں گرلز پرائمری ایجوکیشن پراجیکٹ کے نام سے ایک پراجیکٹ شروع ہوا تھا جس کے پراجیکٹ ڈائریکٹر جناب رشید ظفر صاحب تھے۔ اپنے گرلز سکولز کے لیے انہوں نے فرنیچر وغیرہ کے علاوہ لائبریری کتب بھی کافی تعداد میں خریدی تھیں۔ مقبول اکیڈمی کا ٹنڈر منظور ہوا تو ہم نے بڑی تعداد میں کتب سپلائی کیں۔ پراجیکٹ ڈائریکٹر رشید ظفر اور ان کا عملہ جن میں ان کے اسسٹنٹ نوجوان خورشید شامل تھے، دیانت میں اپنی مثال آپ تھے۔ انہوں نے کتابوں کی سپلائی ٹنڈر کے مطابق چیک کر لینے کے بعد ہمیں چیک کے ذریعے فوراً ادائیگی کر دی۔ ہمیں ان کے دفتر کا چکر لگانے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ نہ خفیہ اشاروں کی زبان سننی پڑی۔

Marfat.com

خالد مسعود

ایک اور پراجیکٹ ''مڈل سکولنگ پراجیکٹ'' کے نام سے بھی شروع ہوا تھا جس کا دفتر مسلم ٹاؤن میں واقع تھا۔ پراجیکٹ ڈائریکٹر خالد مسعود چوہدری صاحب تھے، سپیشل سیکرٹری جاوید اقبال اعوان کی نگرانی میں کروڑوں روپے کا فرنیچر اور دیگر سامان اس پراجیکٹ کے لئے خریدا گیا۔ لیکن ان کے دفتر میں کسی کی جرأت نہ تھی کہ کسی ٹھیکیدار سے کوئی انعام، یا رشوت کا مطالبہ کرتا۔ مقبول اکیڈمی نے بھی کافی مال اور لائبریری کتب وغیرہ سپلائی کی تھیں۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر افسر ایماندار، دیانتدار ہوں تو محکمہ میں سے کسی کی جرأت نہیں ہوتی کہ کوئی غلط کام کرے۔ اللہ کرے وطن عزیز پاکستان کے سارے دفاتر ایسے ایماندار افسروں کی نگرانی میں کام کریں جو خود رزق حلال پر اکتفا کریں اور دوسروں کو بھی ایمانداری سے صحیح کام کرنے کی ترغیب دیں (آمین)۔

☆☆ .... ☆ .... ☆☆

Marfat.com

Marfat.com

مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب

"انڈیا ونز فریڈم" کے اُردو ترجمہ

"آزادیٔ ہند"

اور

خالد محمود کی کتاب "رن کچھ سے چونڈہ تک"

پر

مشاہیر اور اعلیٰ حکام کے خطوط

Marfat.com

Marfat.com

ادارہ مطبوعات فرینکلن

لاہور

۲۲ اگست 1969

جناب مکرم السلام علیکم!

آپ کا گرامی نامہ مل گیا تھا۔ مجھے اس خبر سے دلی مسرت ہوئی کہ آپ کی کتاب کا تیسرا ایڈیشن اس قدر جلد آرہا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی خدا کرے یہ کتاب گھر گھر پہنچ جائے اور اس کے ذریعے سے مضامین شائع ہو جائیں جن کی تبلیغ مولانا ابوالکلام اپنی کتاب میں کی ہے۔

میں ۲۶ اگست کو دو ہفتے کے لئے ملک سے باہر جا رہا ہوں۔ واپسی پر انشاءاللہ ملاقات ہوگی۔

خدا حافظ

خاکسار

[illegible]

جعفری صاحب سے بھی دوبارہ ملا تھا

Marfat.com

مکتبہ فرنگیان
پوسٹ بکس ۳۶۹
لاہور مورخہ ۸ر اگست ۱۹۵۹ء

مخدوم و مکرم السلام علیکم آج صبح آپ کے ادارے کے کوئی صاحب آزادیٔ ہند کی ایک جلد میرے لئے لائے تھے اُس وقت ایک صاحب میرے پاس بیٹھے ایک نجی معاملے پر بات کر رہے تھے۔ پانچ سات منٹ بعد جب میں نے اُن کا شکریہ ادا کرنا چاہا تو وہ جا چکے تھے۔ اس سے بہت افسوس ہوا۔ ان تک میری معذرت اور شکریہ پہنچا دیجئے۔ آپ کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں اور مبارکباد عرض کرتا ہوں کہ اس کتاب کی اشاعت سے آپ نے بہت اہم ملی خدمت انجام دی ہے خدا تعالیٰ آپ کو کامیاب و فائز المرام کرے۔

یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ کتاب کا دوسرا ایڈیشن بھی چھپ چکا ہے۔

نیازمند
[illegible]
ناظم ادارۂ فرنگیان

Marfat.com

[illegible] گرمانی ضلع مظفرگڑھ مغربی پاکستان

۲۷ اگست ۱۹۵۹ء

محبی ڈاکٹر [illegible] صاحب - السلام علیکم ورحمۃ اللہ

عنایت نامہ مورخہ ۲۰ اگست موصول ہوا - احسان ہے جو آپ کی مطبوعہ کتاب آزادیٔ ہند کا نسخہ بھی ملا - شکریہ -

میں مدت سے بیمار ہو رہا ہوں - [illegible] ستمبر کے تیسرے ہفتے میں [illegible] -
[illegible]

[illegible] مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی کتاب کا ترجمہ [illegible] معلوم ہوتا ہے - ترجمہ نہیں - [illegible] بشیر احمد [illegible]
[illegible]

[illegible] شکریہ قبول فرمائیے - والسلام - آپ کا مخلص

مشتاق احمد گرمانی

۳۹ (۲) / پریس ۵۹

PRESIDENT'S HOUSE
KARACHI.

پاکستان

۳۰ اگست ۱۹۵۹

محترمی - السلام علیکم

مولانا ابو الکلام آزاد کی کتاب
کا اردو ترجمہ موصول ہوا۔
اس کرم فرمائی پر میرا
دلی شکریہ قبول فرمائیے۔

نیازمند
قدرت اللہ شہاب

Marfat.com

8 Durand Road
Lahore

۱۹. ۱۰. ۵۹.

مکرمی ڈاکٹر جناب ملک مقبول احمد صاحب

السلام علیکم۔

کراچی سے واپسی پر کل شام جناب نے کمال مہربانی سے نسخہ رئیس احمد جعفری صاحب کی ترجمہ کردہ کتاب "آزادیٔ ہند" جو بطور ہدیہ ارسال فرمائی تھی مل گئی۔ انتہائی مشکور ہوں۔

شوق سے پڑھوں گا۔ پہلے سے بے حد تعریف سن چکا ہوں۔ اپنے ناقص احساسات ضرور پیش خدمت کروں گا۔

دوبارہ شکریہ۔

ابجا محمود

Marfat.com

No. GS-55/1501

SECRETARY TO GOVERNOR
WEST PAKISTAN

LAHORE.

15th August, 1959.

Dear Sir,

I am desired by Mr. Akhter Husain, Governor of West Pakistan to acknowledge the receipt of your letter dated the 12th August, 1959, and to thank you for sending him a copy of Urdu translation entitled "Azadi-e-Hind" of Maulana Abul Kalam Azad's book "India Wins Freedom".

Yours truly,

(K. Naseer-ud-din Khan)
Private Secy. to the Governor,
West Pakistan.

Malik Maqbool Ahmad,
C/o Maqbool Academy,
4/A, Shahalam Market,
LAHORE.

Marfat.com

2, DANEPORE ROAD,
LAHORE.

۱۷ اگست ۱۹۵۱ء

مکرمی تسلیم

"آزادیٔ ہند" کا شکریہ۔ میں اسے
بڑی دلچسپی سے پڑھوں گا۔ پروفیسر احمد جعفری
صاحب کا زورِ قلم بے مثل ہے۔ آپ اُن سے
میری تسلیم عرض کر دیجئے گا۔

مخلص
[illegible]

Marfat.com

Abdul Qaiyum Khan,
B. Sc. (Economics) London
BAR AT LAW
Advocate High Court of West Pakistan,
Senior Advocate Supreme Court of Pakistan.

Telephones: PESHAWAR 3063
LAHORE 5419

AMIN VILLA,
SHAHIBAGH
PESHAWAR.

~~C. & MG BUILDINGS~~
~~40 THE MALL,~~
~~LAHORE.~~

18/8/59

مکرمی و محترمی - السلام علیکم - مولانا ابوالکلام آزاد کی
خود نوشت India Wins Freedom کا اردو ترجمہ مترجمہ رئیس احمد
جعفری مل گیا ہے - جس کے لیے میرا شکریہ قبول فرمائیے -
میں اس کتاب کے پڑھنے کے لیے مدت سے منتظر تھا - جن اپنے
ملی الجھن کے [illegible] موجودہ حالات کے متعلق [illegible] پڑھنا چاہیے
یہ کتاب بے حد دلچسپ ہے - میں اسے پڑھ کر اپنی رائے آپ کی
خدمت میں پیش کروں گا -

فقط
عبدالقیوم

بخدمت جناب ملک مقبول احمد صاحب
مقبول اکیڈمی

Marfat.com

A 18 3/6 [illegible] روڈ لاہور

۱۱ اگست

محترمی۔ السلام علیکم

گرامی نامہ ملا۔ اور جناب رئیس احمد جعفری صاحب
کی کتاب "آزادیٔ ہند" بھی مل گئی ہے۔ اس ہدیہ
کا بہت ممنون ہوں۔ والسلام

مخلص محمد علی

Lt Col A.R. SIDDIQI
Directòr Public Relations
GENERAL HEADQUARTERS,
RAWALPINDI

No. 5149/62/PR(a)
26 Feb'68.

Maqbool Ahmad Esq
Proprietor Maqbool Academy
Chowk Anarkali, Circular Road,
LAHORE.

Dear Maqbool Ahmad Sahib

I have been directed to acknowledge gratefully your letter No. 786-4 dated 27-1-68 addressed to the Commander-in-Chief, Pakistan Army, alongwith a copy of your book " رن کچھ سے ۶۵ء تک ". Your book is an excellent effort to project to the Urdu reading public the various phases of the '65 War. This is easily one of the best produced records of the War so far attempted in Urdu by a competent journalist. I only wish you were able to bring it out earlier. This would have, in my opinion, greatly enhanced the topical value of the book. I hope you would be in the best of health.

With best regards,

Yours sincerely

GENERAL HEAD QUARTERS PAKISTAN OUT 27 FEB 68 CR

Marfat.com

From : Wing Commander M. AFZAL KHAN, Private Secretary to

CHIEF OF THE AIR STAFF
AND
COMMANDER IN CHIEF
PAKISTAN AIR FORCE
AIR HEADQUARTERS
PESHAWAR

AirHQ/0095/3/1/CinC

13th February, 19[illegible]

محترم مقبول احمد صاحب،

السلام علیکم ۔

ایئر مارشل ایم نور خان، کمانڈر انچیف، پاکستان ایئر فورس کے نام آپ کا مکتوب مورخہ ۲۷ جنوری اور آپ کی مرسلہ کتاب "رن کچھ سے چونڈہ تک" کے ساتھ موصول ہوا ۔

انہوں نے مجھے ہدایت کی ہے کہ میں اس سلسلے میں آپ کا شکریہ ادا کروں ۔

یہ کتاب شائع کر کے آپ نے یقیناً ایک قومی خدمت انجام دی ہے ۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایسی خدمتیں ادا کرنے کی بیش از بیش توفیق ارزانی کرے ۔

فقط، والسلام

آپ کا مخلص

[illegible signature]

Mr. Maqbool Ahmad,
Maqbool Academy,
Chowk Anarkali,
Circular Road,
LAHORE.

Marfat.com

From :- Captain M.F. Janjua, T.Q.A., Pakistan Navy.

Private Secretary to Defence Minister.
Government of Pakistan
Rawalpindi

No. 1187 /D.M.
8th February 1968.

Mr. Maqbool Ahmad,
Maqbool Academy,
Chowk Anarkali,
Circular Road,
Lahore.

Dear Sir,

I am directed to acknowledge receipt with thanks of a copy of your publication " [illegible] " which you have sent to the Defence Minister. The book has a special significance in that its author Mr. Khalid Mahmood, is a journalist, who having personally visited the various fronts has been able to give at places his eye-witness account of the September, 1965 war.

Yours faithfully,

[signature]

Marfat.com

تندرستی ہزار نعمت ہے

لڑکپن میں ایک دفعہ میرے دانت میں شدید درد شروع ہو گیا میں ڈاکٹر کے پاس گیا، اُس نے دیکھ کر کہا۔ ''تمہارے دانت بہت خراب ہیں، تم اگر مسواک نہیں کرتے تو کبھی گنا ہی چوس لیا کرو۔'' ......اور حقیقت یہی تھی کہ میں نے اپنی صحت کی طرف کبھی دھیان ہی نہ دیا تھا۔ گاؤں کا ماحول ہی کچھ ایسا تھا کہ نزلہ زکام ہر وقت رہتا لیکن کبھی پروانہ کی ......کاروبار کے سلسلہ میں لاہور میں مستقل رہائش اختیار کی تو پھر یہ تکالیف بھی آہستہ آہستہ زیادہ ہونا شروع ہو گئیں ۔ نزلہ زکام اور سر درد تو ایک معمول بن گیا لیکن اس کے بعد سانس کی تکلیف شروع ہو گئی ۔ جسم درد کرنے لگا، جلد کے مسامات بند ہو گئے، پسینہ نہ آتا اور گرمیوں میں بھی سردی لگتی، رفع حاجت کھل کر نہ ہوتی، دل کی تکلیف اور معدہ خراب، میرا خیال ہے کہ شاید ہی کوئی جسمانی تکلیف ایسی ہو گی جو مجھے نہ ہوئی ہو۔

جوانی کی حرارت میں تو کام چلتا رہا لیکن اب معاملہ برداشت سے باہر ہو گیا۔ ایک دن ایک دوست نے مشورہ دیا کہ انگلینڈ کے ڈاکٹروں کی ایک ٹیم آئی ہوئی ہے اور وہ گلبرگ میں مریضوں کا معائنہ کرتی ہے، میں وہاں گیا۔ انہوں نے چیک کیا اور رپورٹ دی کہ تمہارا دل بڑھ گیا ہے اس کے علاوہ اور کوئی خاص تکلیف نہیں ۔ انہوں نے جو دوائی تجویز کی اس کے استعمال سے میری تکالیف میں کوئی افاقہ نہ ہوا...... دل کے مقام پر درد تھا، سانس لینے میں تکلیف تھی، ان دنوں شملہ پہاڑی کے پاس دل کے امراض کے ماہر ڈاکٹر پیرزادہ ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے معائنہ کیا اور ای سی جی کروانے کے بعد کچھ دوائیاں لکھ دیں لیکن کوئی افاقہ نہ

Marfat.com

ہوا۔کسی دوست نے بتایا کہ اپر مال روڈ پر جرمن کے ایک ڈاکٹر نے کلینک کھولا ہوا ہے۔ میں اس کے پاس گیا، اس نے معائنہ کیا تو اس کی رپورٹ کے مطابق میرا دل ٹھیک تھا، صرف سانس کی نالی میں ورم تھا۔ دوائی اس نے لکھ دی لیکن آرام اس سے بھی نہیں آیا۔ ایک روز میں اپنی بیوی کے ہمراہ سمن آباد کسی کام سے جارہا تھا۔ تو سنٹرل ماڈل ہائی سکول کے ساتھ والی مارکیٹ میں ڈاکٹر سردار محمد (غالباً یہی نام تھا) کا بورڈ نظر آیا۔ یہ پرانے وقتوں کے ایک ایم ڈی ڈاکٹر تھے۔ ان سے اپنی تکلیف کا ذکر کیا کہ میں سانس صحیح طرح سے نہیں لے سکتا اور جرمن ڈاکٹر نے بتایا ہے سانس کی نالی میں ورم ہے۔ ڈاکٹر سردار محمد نے مجھے کھانسی کا ایک شربت لکھ دیا جس کے استعمال سے سانس کے درد میں افاقہ ہوا اور وقتی طور پر آرام آ گیا۔ لیکن دیگر تمام تکلیفیں بدستور تھیں۔ ایک ڈاکٹر نے مجھے "نیوروبیان" کے ٹیکے لگوانے کے لئے کہا۔ اور ایک مدت تک میں یہ ٹیکے لگواتا رہا۔ مجھے وقتی فائدہ تو ہوا لیکن مستقل آرام نہ آیا۔ اس دوران میرا وزن بھی کافی بڑھ گیا لیکن میں نے پہلے کی طرح کچھ زیادہ پروانہ کی......

ایک سال جب بچوں کے ساتھ میں کوہ مری گیا تو مجھے شدت سے زکام ہو گیا۔ میرے بیٹے ظفر نے کہا کہ ابا جی آپ سٹیم باتھ کیوں نہیں لیتے؟ ان دنوں اخبارات میں لوئی کوہنی کے قدرتی علاج کے سلسلہ میں پانی سے علاج کے متعلق مضامین شائع ہو رہے تھے۔ یہ مضامین میں نے بھی پڑھے تھے لیکن کوئی توجہ نہ دی تھی۔ اب میرے بیٹے ظفر نے اس علاج کا کہا تو مجھے فوراً احساس ہوا کہ یہ علاج بھی آزما کر دیکھنا چاہیے۔ لہٰذا مری کی سیر کے بعد لاہور آ کر میں نے پانی سے قدرتی علاج کی کتاب منگوا کر پڑھی۔ یہ کتاب لوئی کوہنی کی اصل کتاب کی تلخیص تھی جس سے میں مطمئن نہیں ہوا اور میں نے لوئی کوہنی کی اصل کتاب کا اردو ترجمہ "نیا علم شفا بخشی" ایک پبلک لائبریری سے منگوا کر دیکھی۔ پھر کتاب میں درج ہدایات کے مطابق علاج شروع کر دیا۔

ایک سال سے کچھ زیادہ عرصہ تک میں نے پانی کا یہ علاج کیا۔ اس میں ہپ باتھ

Marfat.com

اور سٹیم باتھ بھی شامل تھا۔ علاج شروع کرنے کے تھوڑے عرصہ بعد ہی میرے جسم سے فاسد مادے نکلنے شروع ہو گئے اور میں آہستہ آہستہ صحت یاب ہونے لگا۔ نزلہ زکام، سر درد، بخار جسم کے درد اور سانس کی تکلیف وغیرہ تمام تکالیف سے مجھے نجات مل گئی۔ میں ایک دفعہ پھر اپنے شباب کے دور میں لوٹ آیا۔ میرے جسم پر جو فالتو چربی تھی، وہ ختم ہو گئی، موٹاپا دور ہو گیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ مجھے اب کسی قسم کی کوئی شکایت نہیں ہے، میرا معدہ درست ہو گیا ہے۔ اب جو بھی غذا کھاؤں وہ جزو بدن بنتی ہے۔ میں نے یہ علاج بند کر دیا ہے۔ لیکن اگر کبھی کوئی تکلیف محسوس ہوتی ہے تو سال میں ایک دو ہفتہ باتھ لے لیتا ہوں۔ پینتیس سال قبل میں نے یہ علاج کیا تھا اس کے بعد آج تک اللہ کے فضل و کرم سے سر درد اور بخار تو کبھی نہیں ہوا۔ میرے دبلے ہو جانے کے بعد میرے کچھ دوست انتہائی سرگوشی کے انداز میں مجھ سے دریافت کرتے ہیں کہ خدانخواستہ میں کسی اندرونی مرض میں تو گرفتار نہیں ہوں۔ میں انہیں بتاتا ہوں کہ وہ غلط سمجھ رہے ہیں۔ بیماریوں سے نجات پا کر اب میں قدرتی جسمانی حالت میں آ گیا ہوں اور بالکل تندرست ہوں۔

اس علاج کے دوران میں میری ملاقات محمود احمد خان سے ہوئی جن کے مضامین پانی سے متعلق اخبارات میں شائع ہوتے تھے۔ میرا ان سے تبادلہ خیالات ہوا۔ سٹیم باتھ کے متعلق ان کو صحیح معلومات نہیں تھیں، میں نے ان کی راہنمائی کی اور پھر ہم چند دوستوں نے جن کو پانی کے اس علاج سے دلچسپی تھی، مل کر ایک انجمن بنالی۔ جس کے صدر جناب جسٹس (ریٹائرڈ) بی زیڈ کیکاؤس تھے۔ ان کے دردولت پر ہی انجمن کے ابتدائی اجلاس ہوئے۔ ایک اجلاس میں جسٹس صاحب نے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ ٹی بی کے مرض میں مبتلا ہوئے اور کہیں سے انہیں افاقہ نہ ہوا تو انہوں نے جرمن سے لوئی کوہنی کے کتابچے منگوا کر پڑھا جس سے ان کو اس قدرتی علاج کی خبر ملی اور انہوں نے لوئی کوہنی کے اس علاج سے شفا حاصل کی۔ جسٹس صاحب اپنے گھر والوں کو کہا کرتے تھے کہ میں تم پر بوجھ نہیں ہوں کہ میری دوائیوں کا خرچہ ہی

Marfat.com

کوئی نہیں۔ مجھے اس علاج کے بعد کسی دوائی کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہی۔

ہماری اس انجمن کا چرچا اخبارات میں بھی ہوا اور کچھ لوگوں نے مجھ سے رابطہ کیا کہ یہ علاج کس طرح کرنا ہے، خط وکتابت کے ذریعے بھی لوگوں کو مشورے دیئے گئے۔ کئی لوگوں نے اس علاج سے استفادہ کیا لیکن کچھ گھبرا کر علاج چھوڑ گئے۔ کیونکہ اس علاج میں مستقل مزاجی کی اشد ضرورت ہے اور اس میں تندرست ہونے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ شیخوپورہ سے ایک بزرگ تشریف لائے، میں نے انہیں طریق علاج بتایا۔ کچھ عرصے کے بعد وہ پھر تشریف لائے اور بولے کہ ''علاج کے دوران مجھے زیادہ تکلیف محسوس ہوتی ہے تو میں ڈاکٹر کے پاس جا کر دوائی لے آتا ہوں''۔ انہیں سمجھایا کہ علاج کے دوران اگر تکلیف زیادہ ہو جاتی ہے تو اسے برداشت کریں کیونکہ علاج کے دوران جب مادے خارج ہوں تو بحران کا پیدا ہونا ضروری ہے...... بہت سے لوگ اس بحران کی وجہ سے علاج ترک کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کو تندرستی حاصل نہیں ہو سکتی...... میرے ایک بہت سیانے اور نیک دوست انیس یعقوب صاحب کو جو بڑے پائے کے آرٹسٹ ہیں، عرصہ دراز سے سر درد کی شکایت تھی۔ میرے کہنے پر انہوں نے اس علاج سے شفا حاصل کی ہے۔ میری ایک ماموں زاد بہن ''نسرین'' کہتی ہے کہ ان کے گھر کے کسی فرد کو اگر کوئی تکلیف ہو تو وہ اس علاج سے اسے ٹھیک کرتی ہے۔ میرا بیٹا ظفر مقبول جس نے مجھے اس علاج کی طرف راغب کیا تھا، ایک دفعہ شدید نوعیت کے بخار میں مبتلا ہو گیا تو اس نے اپنی شفایابی کے لئے یہی طریقہ علاج اختیار کیا اور اللہ نے اپنے فضل وکرم سے اسے صحت عطا فرمائی۔ میری بیوی کافی عرصہ کچھ اندرونی تکلیف کی وجہ سے کئی لیڈی ڈاکٹروں سے علاج کرواتی رہی لیکن آرام اسی پانی کے علاج سے ہی آیا اور اسے موٹاپے سے بھی نجات مل گئی۔ بہر حال جن دوستوں اور بزرگوں نے مستقل مزاجی سے یہ علاج کیا ان کی پرانی سے پرانی تکلیف بھی دور ہو گئی۔

بابائے ادب محترم ڈاکٹر انور سدید صاحب (تمغہ امتیاز) پانی کے اس علاج سے

Marfat.com

متعلق اپنا تجربہ بیان فرماتے ہیں:

اپنی خود نوشت ''سفر جاری ہے'' میں آپ نے جو طریق علاج لکھا ہے میں نے اس پر عمل کیا تو حیرت ہوئی کہ میرا معدہ بہتر کام کرنے لگا۔ بھوک تیز ہوئی۔ پہلے اٹھنے میں تکلیف ہوتی تھی، اب میں کسی سہارے کے بغیر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ پہلے دس قدم چل کر سانس پھول جاتا تھا۔ اب میں دو فرلانگ تک آسانی سے چل لیتا ہوں۔ آپ کے بتائے ہوئے علاج کے ساتھ سیر اور تھوڑی سی ورزش لازمی ہے۔ ایک ماہ کے وظیفے کے بعد میں اب اس کا بھی عادی ہو گیا ہوں اور سب سے اہم یہ کہ صبح سویرے لکھنے کے لیے طبیعت کو آمادہ پاتا ہوں۔ پانی کا علاج بے حد مفید نظر آیا اب میں نے اسے باقاعدہ اختیار کر رکھا ہے۔

حیرت ہوئی کہ یہ ''ایستادگی'' میں بھی معاون ہے۔ حالاں کہ مجھے اب اس کی ضرورت نہیں یہ شاید خون کی تیز گردش کا نتیجہ ہے۔ آپ نے درست کہا تھا کہ اس علاج کو اختیار کرنے کیلئے ہمت اور استقلال چاہیے۔ آپ نے ہمت بندھائی، استقلال کو قائم کیا۔ میں نے اچھا عمل سمجھ کر قبول کیا۔ اس کے لیے آپ کا شکریہ ضروری ہے اور اس خط سے ادا کرتا ہوں۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے۔ (آپ کا مخلص انور سدید)

میرے معزز و محترم دوست جناب پروفیسر جمیل آذر لکھتے ہیں کہ آپ کی ہدایات کے مطابق میں نے 12 مئی سے ٹھنڈے پانی سے مساج شروع کیا تھا اس کے مثبت نتائج کم جون سے نکلنے شروع ہوئے۔ قبض کی وہ شکایت جس کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا دور ہوئی ہے۔ یہ آپ کی دعاؤں، علاج اور اللہ تعالیٰ کے خصوصی کرم و عنایت سے ہوا۔ آج سے آپ میرے باتجیین ڈاکٹر اور مسیحا ہیں۔ اب صرف بائیں ٹانگ میں تکلیف موجود ہے، لیکن میں محسوس کر رہا ہوں کہ اس میں بھی کمی ہے۔ یہ علاج مشکل ہے اور مستقل مزاجی سے ہی کرنا پڑتا ہے۔ میں ستمبر 2005ء میں ہیپاٹائٹس کے حملے سے شدید بیمار ہو گیا۔ پورے ڈیڑھ سال کے بعد صحت یاب ہوا۔

Marfat.com

لیکن مجھے صحیح صحت آپ کی دعا اور علاج سے ملی کیونکہ میں بیماری کے بعد شدید قبض کا مریض بن گیا تھا۔ میں آپ کے طریقہ علاج سے 100 فی صد مطمئن ہوں۔ میرا خیال ہے کئی بیماریوں کا حل ہے جو آپ تجویز کرتے ہیں۔ (وقار جمیل آزر)

جن بہت سارے دوستوں کو اس علاج سے کامیابی نصیب ہوئی، ان میں حضرت انیس یعقوب صاحب بھی شامل ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں آدھے سر کے درد یا دردِ شقیقہ (میگرین Migraine) میں مبتلا تھا۔ اچھے ڈاکٹروں اور سپیشلسٹوں کو دکھایا اور ہر طرح کے ٹیسٹ کروائے۔ تکلیف تھی کہ رفع ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔ مایوسی یا ڈپریشن نے مجھے گھیر رکھا تھا۔ میں کہاں کہاں نہیں گیا اور کون سا علاج نہیں کرایا۔ ایلوپیتھک، ہومیوپیتھک اور طبِ یونانی، علاوہ ازیں وقتاً فوقتاً عزیز و اقارب کے بتائے ہوئے بے نام نسخوں اور ٹوٹکوں کو بھی آزماتا رہا لیکن تکلیف تھی کہ روز بروز شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔

جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ اُس علیم و حکیم اور برتر ذات نے ہر کام کا ایک وقت مقرر کر رکھا ہے۔ چنانچہ 1989-90 میں قدرت نے آپ سے ملاقات کرائی۔ آپ نے خلوصِ نیت سے یہ علاج متعارف کرایا۔ ابتدا میں یہ کافی مضحکہ خیز لگا کہ سر میں درد ہو اور بیٹھو کولہوں کے بل پانی میں؟ بیوی نے کہا یہ ٹوٹکا پہلے کبھی سننے میں نہیں آیا۔ والدِ محترم نے کہا بھئی برخوردار کس کے پیچھے لگ گئے ہو؟ یہ ساری باتیں سن کر میں بدظن نہ ہوا اور علاج شروع کرنے کا پکا ارادہ کیا۔

مجھے یاد ہے وہ جنوری کی بالکل ابتدائی تاریخیں تھیں۔ کڑاکے کی سردی میں یخ بستہ پانی میں برہنہ ہو کر بیٹھنا خاصے دل گردے کا کام تھا۔ پہلے دن چند منٹ بیٹھا اور تھر تھر کانپنے لگا۔ دل میں یقین بھی تھا اور بے یقینی بھی۔ لیکن ایک مثالی معالج کی طرح آپ کا مریض اور مرض کے حوالے سے Followup حدِ کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ آپ کا ہر روز فون کال کرنا، تکلیف کے بارے میں جاننا، استفسار کرنا اور مفید ہدایات سے نوازنا یہ سب ناقابلِ یقین حد تک نفع بخش تھا۔ علاج کے آغاز میں "Curative Crisis" سے بھی دوچار ہوا۔ لیکن آپ کی حوصلہ افزائی میسر رہی

Marfat.com

جس نے ارادے کو قائم رکھنے میں خوب مدد دی۔ تقریباً تین ماہ گزرے کہ علاج کے مثبت نتائج سامنے آنا شروع ہو گئے۔ تکلیف کی شدت اور درد کے دورانیے میں کمی واقع ہو گئی اور دردوں کے درمیان وقفہ بڑھ گیا۔ "ولڈ باتھ" سے یہ تبدیلی آئی کہ میں ہر کام بھاگ بھاگ کر اور پھرتی سے کرنے لگا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے میرے اندر کسی نوجوان کی روح حلول کر گئی ہے۔ طبیعت کا چڑچڑاپن جاتا رہا اور میں ایک نئی زندگی کی راہ پر گامزن ہو گیا۔ قرآن میں خدا کہتا ہے کہ "اور میں نے ہر شے کو پانی سے زندہ بنایا"۔ تو قرآن کا یہ قول صادق مجھے اپنے اور پانی کے علاج کے حوالے سے بھی برحق محسوس ہوا۔ حقیقتاً مجھے پانی سے حیات نو ملی تھی۔

میری بیوی جو لڑکپن سے ہی کان کی تکلیف میں مبتلا اور مسلسل زیر علاج تھی۔ اس کا کان بہتا تھا اور درد بھی کرتا تھا۔ میری صحت یابی سے متاثر ہو کر اس نے از خود ولڈ باتھ لینا شروع کر دیا۔ یقین مانیں ملک صاحب! محض تین دن کے ٹریٹمنٹ سے اس کی برسوں پرانی تکلیف جاتی رہی۔ اسی طریقہ علاج سے میرے والد محترم نے مثانے کی پتھری سے نجات پائی۔ کراچی میں مقیم میری چھوٹی ہمشیرہ کا شوہر اسی علاج سے مستفید ہوا ہے۔ میرے دفتر کے ایک ساتھی عضلاتی اینٹھن (Cramps) میں مبتلا تھے۔ انہیں بھی اسی ولڈ باتھ کی بدولت اللہ نے شفا بخشی۔ بے شک ولڈ باتھ جو ہر بیماری کا نیچرل علاج ہے بڑا مفید ہے۔ جس میں نہ کوئی لاگت ہے نہ کوئی فیس اور نہ کسی قسم کے اخراجات۔ اور سب سے بڑھ کر اس علاج کے سائیڈ ایفیکٹس بھی نہیں۔ نہ کسی ہسپتال اور نہ کسی کلینک جانا پڑتا ہے اور نہ ہی ڈاکٹروں سے وقت لینے کے اعصاب شکن مراحل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس علاج سے معدہ بالکل درست ہو جاتا ہے۔

میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے ایک حیات بخش طریقے سے متعارف کرایا جس نے واقعی میری زندگی بدل ڈالی۔ (آپ کا مخلص۔ [illegible])

یہ حقیقت ہے کہ انسان کی اکثر بیماریاں معدے کی خرابی سے پیدا ہوتی ہیں۔

Marfat.com

باضمہ درست ہو، معدہ طاقتور ہو، غذا پیٹ میں خوب گھل مل جاتی ہو تو جو ہر جو کھانے پینے سے پیدا ہوتا ہے وہ جزو بدن بن کر خوب طاقت پیدا کرتا ہے۔ لیکن اگر ہضم اچھا نہیں ہے معدہ کمزور ہے تو معمولی غذا بھی زہر بن جاتی ہے، طرح طرح کے امراض پیدا کرتی ہے۔ اگر مسلسل بد پرہیزی سے فاسد مادے جمع ہو جائیں تو پھر سوائے اس کے کوئی علاج نہیں کہ انہیں جسم سے نکال باہر کیا جائے اور اس کا طریقہ اور علاج صرف اور صرف لوئی کوہنی کے پانی کے باتھ ہیں۔ پانی کے اس قدرتی علاج سے نہ صرف وہ بیماری رفع ہوتی ہے جس کا علاج کیا گیا ہو بلکہ دیگر تمام جسمانی تکالیف بھی دور ہو جاتی ہیں۔ دنیا میں کوئی اور طریقہ علاج کسی ایک مرض کے قطعی درست کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا لیکن پانی کا یہ قدرتی طریق علاج عملی طور پر دعویٰ کرتا ہے کہ وہ انسانی جسم کی جملہ امراض کا قطعی علاج کر کے حقیقی تندرستی عطا کرتا ہے۔

لوئی کوہنی کی اس کتاب ''نیا علم شفا بخشی'' کا 25 سے زیادہ زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اور اس کتاب کے تقریباً دو سو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب میں مصنف نے ثابت کیا ہے کہ جملہ امراض خواہ ان کے نام کچھ ہی کیوں نہ ہوں ایک ہی سبب سے پیدا ہوتے ہیں بلکہ ایک ہی ہیں اور ان کا علاج بھی ایک ہی طریقہ سے ہے اور یہ طریقہ علاج قوانین قدرت پر مبنی ہے۔ لہٰذا ہمیں یہ بات ہرگز نہیں بھولنا چاہیے کہ ہر ایک شے جو ہم معدہ میں داخل کرتے ہیں وہ ہضم کرنی پڑتی ہے۔ تندرست معدہ بھی غذا کی ایک خاص مقدار ہی ہضم کر سکتا ہے، اس سے زیادہ ہر شے خواہ کتنی ہی لذیذ اور اچھی ہو اس کے لئے زہر ہے۔ اگر وہ ہضم نہ ہو تو جسم میں فاسد مادہ کی موجودگی کا نام ہی مرض ہے۔ اگر اس مادہ فاسد کو جسم سے معقول طریقہ سے خارج کر دیا جائے تو مرض خود بخود دور ہو جائے گا اور جسم اپنی صحت کی اصلی حالت میں آ جائے گا۔ دائمی تندرستی اور صحت مند زندگی بسر کرنے کے لئے کھانے پینے میں اعتدال نہایت ضروری ہے۔ میری عمر اس وقت اسی سال (۸۰) سے زائد ہے اور ابھی تک اللہ کے فضل و کرم سے تندرست و چوبند ہوں۔ لوئی کوہنی کے اس قدرتی علاج سے ہی میں نے اپنی تمام بیماریوں

Marfat.com

سے نجات حاصل کی ہے۔ (الحمدللہ)

لوئی کوہنی کے پانی کے قدرتی علاج کی کتاب "دی نیو سائنس آف ہیلنگ" کرشن سروپ نے ۱۹۰۴ء میں ترجمہ کر کے "نیا علم شفا بخشی" کے نام سے شائع کی تھی۔ میں نے اپنے ادارے "مقبول اکیڈمی" سے اس کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ کافی لوگ اس سے مستفید بھی ہوئے۔ لیکن یہ کتاب چونکہ بہت ضخیم تھی اور اس کی زبان بھی پرانی تھی اس لئے بہت سے لوگ اس کتاب سے خاطر خواہ فائدہ حاصل نہ کر سکے۔ لہٰذا میں نے آسان زبان میں اس عظیم اور ضخیم کتاب کا نہایت مفید خلاصہ تیار کیا ہے۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ دکھی لوگ اس سے فائدہ حاصل کر سکیں۔ مجھ سے پہلے میرے دوست محمود احمد خاں (مرحوم) نے اس کتاب کا خلاصہ شائع کیا تھا۔ میں نے اس خلاصہ سے استفادہ کیا ہے اور اپنی مرتب کردہ اس تلخیص "نیا علم شفا بخشی" میں لوئی کوہنی کے پانی کے اس قدرتی علاج کی افادیت سمجھانے اور اس کی تشریح بہتر انداز سے کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ اس علاج کے لئے لوئی کوہنی نے جو آلات اپنے شفاخانے ملک جرمن میں تیار کئے تھے اور جن کی تصاویر اس کی کتاب میں شامل ہیں ان کا دستیاب ہونا ناممکن ہے۔ ان کی ضرورت بھی نہیں گھر میں عام استعمال ہونے والا ایک ٹب، ایک کرسی اور ایک چارپائی سے اس علاج سے متعلق سارے کام لئے جا سکتے ہیں اور ان اشیاء کے طریقہ استعمال کی تصاویر میں نے آرٹسٹ سے بنوا کر کتاب میں شامل کر دی ہیں۔

اس کتاب میں کوئی چیز ایسی نہیں جس کے سمجھنے میں دشواری پیش آئے۔ یہ کتاب بطور استاد، راہنما اور مشیر کے تجویز کی گئی ہے ان لوگوں کے لئے جو ایک تندرست اور صحت مند زندگی بسر کرنے کے خواہش مند ہیں امید ہے یہ کتاب دکھی انسانوں کے لئے بے حد مفید ثابت ہوگی۔ (انشاءاللہ)

ملک مقبول احمد

Marfat.com

حرفِ آخر

میں ایک عام سا بندہ ہوں۔ اس کے سوا میری کوئی خصوصی حیثیت نہیں ہے۔ میں نہ تو دنیاوی علوم میں درک رکھتا ہوں اور نہ ہی دینی علوم میں مولوی یا مولانا ہوں۔ میرے شعور کی آنکھوں نے جبر، ظلم اور استحصال کو کبھی پسند نہیں کیا۔ میرے تمام مسائل بنی نوع انسان کے عام لوگوں جیسے ہی رہے ہیں۔ یہ اللہ کی خاص عنایت ہے کہ میں نے پڑھے لکھے لوگوں اور ان کی کتابوں سے رابطہ قائم کیا اور یہی میرے روزگار کا وسیلہ بن گیا۔ میں نے اپنے کام کو مختلف سانچوں میں ڈھالا لیکن میرے ہر سانچے کی شکل کتاب کی سی تھی۔

سنِ شعور سے ہی میں ایک انجانی گھٹن میں مبتلا رہا۔ میں اس گھٹن سے نکلنے کے لیے بادلوں اور پرندوں کی طرح اوپر فضاؤں میں اُڑنا چاہتا تھا۔ داخلی فرحت کے لئے مجھے خاص نوع کی سرشاری کی تمنا تھی۔ اشاعتی کاروبار میں میری شائع کردہ ہر کتاب میرے لئے سرشاری ہی کی کیفیت پیدا کرتی اور دنیا مجھے حسین خوبصورت اور پیاری نظر آتی۔ اچھے ادیب میرے لئے دیوتا، فرشتے اور ماورائی مخلوق تھے۔ ان کی تخلیقات وہ صحیفے تھے جنہیں دنیا اس دور سے پڑھتی چلی آرہی تھی جب کتابیں چھاپنے کا کوئی اہتمام نہ تھا۔ زندگی کے اس مقام پر میں خوشی محسوس کرتا ہوں کہ میں نے کتابیں شائع کیں، علم کو فروغ دیا اور جہالت کو دور کرنے کی مقدور کے مطابق کوشش کی۔

جب میں بچپن کے خوابوں کی دنیا سے نکل کر عملی جدوجہد کے میدان میں آیا تو میں نے

Marfat.com

وقت کی پابندی کی عادت شیخ سعدی کی اس نصیحت سے حاصل کی کہ غافل نہ ہو اور یہ سمجھ کہ وقت کے لمحات سے ہی زندگی بنی ہوئی ہے۔ قناعت کر، تھوڑے کو زیادہ سمجھ لیکن اللہ کے گھر سے ہر وقت مزید بہتری کی اُمید رکھ۔ اہل دانش بہترین سوچ کو مال و دولت کے خزانوں سے زیادہ قیمتی سمجھتے ہیں۔

میری زندگی میں اُمید و بیم کی کشمکش موجود ہے لیکن میں نے اپنی جدوجہد اور محنت و مشقت جاری رکھی۔ میں نے بے شمار تجربات کیے۔ پیسہ کمایا اور خرچ بھی کیا لیکن اڑایا نہیں۔ مناسب سلیقے سے بچوں کی ایسی تربیت کی جس سے وہ اپنی اسلامی اقدار سے آگاہ ہوئے اور اب اپنے کردار و عمل سے اچھے اور نیک کہلاتے ہیں۔ ان کی شادیوں پر میں نے بے جا اسراف نہیں کیا لیکن ان کی ضرورتوں کو مدنظر رکھا۔ بیٹی کو گھر بنا کر دیا اور اسے حسب توفیق جہیز بھی دیا۔ جبکہ بیٹوں کی شادیوں پر میں نے ایک کوڑی کا بھی جہیز نہیں لیا۔ اس کے باوجود ایک تکلیف دہ پریشانی یہ تھی کہ میں کاروبار میں دوستوں اور بنکوں کا کافی عرصہ سے مقروض چلا آ رہا تھا۔ اس مصیبت سے نکلنے کے متعلق میں اکثر سوچتا اور بے چین رہتا۔ ایک رات خواب میں مجھ پر القا ہوا، کہ میں

لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ

کی آیہ کریمہ کو کثرت سے پڑھتے رہا کروں، اور اس آیت کو پڑھتے ہوئے تھوڑے وقفے کے بعد

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ وَرَحْمَتِكَ

پڑھا کروں۔ جب میری آنکھ کھلی تو مذکورہ آیت مبارکہ مجھے یاد ہو چکی تھی۔ خواب میں ایسی درس و تدریس کوئی معمولی بات نہ تھی۔ میں نے زندگی میں کبھی اس آیت کریمہ کو اس انداز سے پڑھا تھا نہ سنا تھا۔ نیند کی حالت میں خواب میں ہی اس آیت کریمہ کو یاد کر لینا بڑی بامعنی اور سعادت کی بات ہے۔ میں نے اس کے معانی کو دل و دماغ کی ادراکی قوتوں سے محسوس کیا اور اسے اللہ تعالیٰ

Marfat.com

کا انعام سمجھا۔ میں نے اس آیت مقدسہ کا خواب کی ہدایات کے مطابق ورد شروع کر دیا۔ پھر یہ معجزہ ہوا کہ میرے پریشان حالات آہستہ آہستہ سنبھلنے لگے۔ حالات نے بہتری کی کروٹ لینی شروع کر دی۔ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ میں اب قرضے کے جنجال سے بھی آزاد ہوں۔ میں جو بھی ہوں، جیسا بھی ہوں خداوند کریم نے مجھے روحانی آسودگی اور اطمینانِ قلب عطا کر رکھا ہے۔ مشکلات سے نجات حاصل ہو چکی ہے۔ میرے مخالفین اور حاسد بھی اپنے آپ سے شرمندہ ہیں۔ جبکہ میں نے تو انہیں کبھی کا معاف کر دیا ہے۔

میرے خالق و مالک نے مجھے نبی کریم ﷺ کی راہ پر ڈال دیا ہے۔ نمازوں میں استقامت آ گئی ہے۔ کلام پاک کی تلاوت کی سعادت روزانہ نصیب ہوتی ہے۔ اور یہ ازلی، ابدی اور روحانی سکون اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔

ماضی میں مجھے ایک دوست نے ہدایت کی کہ میں داڑھی رکھ لوں کہ اس سے لوگ عزت کرتے ہیں۔ حاجی صاحب کہہ کر پکارتے ہیں۔ مجھے اپنے دوست کی یہ بات اچھی نہ لگی۔ جعلی عزت کرانے کی خاطر داڑھی رکھنا اور حاجی صاحب کہلوا کر کھوکھلا وقار محسوس کرنا تو دین کی ناپسندیدہ ترین بات ہے۔ بہتر یہ ہوتا کہ وہ دوست کہتا کہ ''بھائی داڑھی رکھ لو کہ ایسا کرنا ایک تو سنتِ رسول ﷺ ہے اور دوسرے مسلمان ہونے کی شناخت بھی ہے''۔

مجھے اللہ تعالیٰ کے گھر اور نبی ﷺ کے در پر حاضر ہونے کا موقعہ ملا تو میں نے اپنی زندگی کو شریعتِ محمد ﷺ کی راہ پر ڈالنے کے بارے میں سوچا تھا، کچھ تحریکات خود بخود میرے اندر پیدا ہوئی تھیں ان کو اپنا کر میں نے باطنی سکون اور بالیدگی حاصل کی تھی لیکن میرے اندر داڑھی رکھنے کی تحریک پیدا نہیں ہوئی تھی۔ میں 2005ء میں عمرہ کی غرض سے بیت اللہ میں حاضر ہو کر دعا میں مصروف تھا کہ مجھے غیب سے آواز آئی کہ ''داڑھی رکھ لو'' اور میں نے اس آواز کی تعمیل کی اور اس وقت اپنے ''کلین شیو'' ہونے کی عادت ترک کر دی اور الحمد للہ کہ اب میں داڑھی بڑھا چکا ہوں۔ میں پورے یقین اور اعتماد سے کہتا ہوں کہ یہ توفیق بھی مجھے اللہ ہی نے عنایت کی۔

Marfat.com

تبصرے

Marfat.com

Marfat.com

اسرار زیدی

سفر ہے شرط

وقت تیز رفتاری میں گزرے یا سست رفتاری کے ساتھ! وقت نے تو بہر حال گزرنا ہی ہوتا ہے۔ یہی اس کا مقدر ہے، اس لئے کہ وقت جامد نہیں، متحرک ہے۔ وقت کو ماضی حال اور مستقبل پر تقسیم کر لیجیے۔ اس کا سفر ایک مرکزی نکتے سے مشروط ہے۔ حال نے اپنی مسافت طے کی تو ایک طرف ماضی میں منتقل ہو گیا تو دوسری جانب مستقبل میں۔ یوں یہ چکر دیکھا جائے تو انسانی گرفت سے باہر دکھائی دے گا۔ فرد کی پوری زندگی کا محور اس چکر سے وابستہ ہے۔

ان تمہیدی جملوں کے منظر نامے میں اپنے ماضی کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ مسافت ایک ایسے دورانیے سے وابستہ ہے، جس میں نفرتیں بھی ہیں اور محبتیں بھی، تلخی بھی ہے، ترشی بھی! باہمی رشتوں کی مٹھاس بھی ہے، چاہت اور وضع داری بھی، اچھی بری ہر نوع کی باتیں ہیں جو بالآخر یادوں میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ انہی یادوں کے حوالے سے خودنوشت سوانح عمریاں ترتیب پاتی ہیں اور سیاحت نامے وجود میں آتے ہیں جو کسی بھی قلم کار کے تجربات و مشاہدات پر مشتمل ہوتے ہیں جن کے مطالعے سے قاری کو اس امر کا ادراک ضرور ہو جاتا ہے کہ یہ لکھنے والا کیا ہے، کیا نہیں ہے؟ اس تخلیق کی معیاری قدر کیا ہے۔ یہ تخلیقیت

Marfat.com

ایک ایسا عمل ہے، جو کسی کی پہچان کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔

مختصر یہ کہ ان سطور کے حوالے سے ایک خودنوشت سوانح ''سفر جاری ہے'' کے بارے میں اپنے تاثرات پیش کرنا ہے۔ ذاتی طور پر ایک طالب علم کی حیثیت سے اس امر کا اظہار غیر ضروری نہ ہوگا کہ زندگی میں اب تک درجنوں ادیبوں، صحافیوں، عالموں، مؤرخوں اور سیاستدانوں کی خودنوشت سوانح حیات کے مطالعہ کا اعزاز حاصل رہا ہے۔ تاہم ''سفر جاری ہے'' کی اشاعت اس لئے چونکا دینے والی اور انفرادیت کی حامل سمجھی جائے گی کہ یہ ایک معروف اشاعت کدے کے مالک و منتظم ملک مقبول احمد کی تخلیق ہے۔ نشرو اشاعت کے حوالے سے ملک صاحب اس لئے بھی کسی تعارف کے محتاج نہیں کہ موصوف نے اس کاروبار کو ایک تخلیقی تجربے سے روشناس کرایا ہے۔ کم وبیش نصف صدی کے دوران انہوں نے ادب، شاعری، تنقید اور مختلف موضوعات پر لاتعداد کتب شائع کی ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ پاکستان، بھارت اور بیرونِ ممالک میں مقیم اردو زبان میں لکھنے والا شاید کوئی بھی ایسا تخلیق کار ہو، جس کی تصنیف شائع کرنے کا اعزاز حاصل نہ ہوا ہو۔

نشرو اشاعت سے تعلق رکھنے والے حضرات کے بارے میں بلا تامل اپنے واقف کار اہلِ قلم کے حوالے سے، اگر یہ کہا جائے کہ وہ اپنی تصانیف کے ضمن میں معاوضے یا رائلٹی یا پھر کسی اور بنیاد پر اپنے ناشر سے شکوہ کناں نظر آتے رہے ہیں جبکہ میں نے ملک صاحب کے اشاعتی ادارے کو ہر اعتبار سے قابل اعتماد پایا اور کسی ایک کو بھی گلہ مند نہیں دیکھا۔ یوں کہ اپنے کاروبار کو وہ رزقِ حلال کا وسیلہ سمجھتے آئے ہیں۔ اس حوالے سے بھی مقبول اکیڈمی ملک صاحب کے زیرِ انتظام ایک منفرد اور مثالی ادارہ قرار پاتا ہے!

مقبول اکیڈمی تک میری رسائی اپنے عزیز اور محترم دوست میرزا ادیب

Marfat.com

کے توسط سے چونتیس پینتیس سال قبل ہوئی۔ اسی مرحلے پر ملک مقبول سے باقاعدہ تعارف ہوا۔ موصوف سے غائبانہ تعارف میرزا ادیب اور بعض دوسرے مصنفین کے علاوہ اکیڈمی میں شائع ہونے والی کتب کے ناشر کی حیثیت سے تو ایک عرصے سے تھا تاہم باضابطہ طور پر ملاقات اس روز ہی ہوئی۔ میں بھی ان کے لئے اجنبی نہ تھا اس لئے کہ وہ کاروباری ہونے کے ساتھ وسیع المطالعہ بھی ہیں۔ اس کا اندازہ موصوف کی گفتگو سے ہوا۔ میرزا ادیب کی بیشتر تصانیف مقبول اکیڈمی نے شائع کی تھیں۔ بہر حال رسمی بات چیت اور چائے کے دوران اس امر کی وضاحت بھی ہوگئی۔ کہ ملک صاحب محض کاروباری ناشر ہی نہیں ایک وضعدار خلیق اور اعتدال پسند شخصیت بھی ہیں۔ اس کے ساتھ یہ آگاہی بھی رکھتے ہیں کہ کون کیا لکھ رہا ہے اور اب تک کیا لکھا ہے تخلیقی اور کاروبار کی بنیاد پر اس کی حیثیت کیا ہے اور اس کا معیار کیا ہے؟

کم وبیش نصف گھنٹے کی نشست میں ہمارے مابین بات بچوں کے ادب تک آگئی ان دنوں بچوں کے لئے ناول خاصی تعداد میں شائع ہو رہے تھے۔ میرزا ادیب بھی اب تک بہت سی کہانیاں، مضامین اور ناول بچوں کے لئے تحریر کر چکے تھے اس موضوع پر انہوں نے بڑی معلوماتی اور جامع گفتگو کی۔ ملک صاحب کے استفسار پر میں نے بس اتنا ہی کہا کہ بچوں کے لئے لکھنا اس لئے خاصا دشوار ہے کہ اس کو زبان و بیان کے ساتھ بچوں کی نفسیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کی سطح پر آکر لکھنا ہوتا ہے۔ اس کا تجربہ اس وقت ہوا جب خود میں نے بچوں کے لئے چند ناول لکھے! ملک صاحب نے بلا تامل ان ناولوں کو اپنے ادارے سے شائع کرنے کی خواہش کا اظہار کیا!

چنانچہ چند روز بعد ہی ہم میرزا ادیب کی معیت میں دو ناولوں ''سند باد

Marfat.com

جہازی کا آٹھواں سفر'' اور'' سمندری شہزادہ'' کے مسودوں کے ہمراہ مقبول اکیڈمی پہنچے تو ملک صاحب نے حسب معمول آؤ بھگت کی۔ مسودوں پر سرسری نظر ڈالی اور میز کی دراز میں رکھا ایک چھپا ہوا معاہدے کا فارم نکال کر میرے دستخط لئے پھر خود کچھ لکھ کر اسے فائل میں رکھ دیا۔ ملازم کو چائے کا کہہ کر چند نوٹ لفافے میں ڈالے اور یہ لفافہ میرے حوالے کیا، نہ ہی میں نے کچھ پوچھا، نہ ہی انہوں نے بتایا کہ رقم کتنی ہے۔ میرزا ادیب صاحب کا کہنا تھا کہ یہی ہر مصنف کے ساتھ ملک صاحب کا طرزِ عمل ہے۔

اس کے کم و بیش ایک ماہ بعد میرے لئے یہ امر باعثِ حیرت تھا کہ ملک صاحب اچانک میرے غریب خانے پر تشریف لائے اور سلام دعا کے بعد دس دس جلدوں پر مشتمل دونوں ناولوں کے پیکٹ عطا کر کے مبارک باد دی اور بتایا کہ بچوں اور بڑوں نے ان ناولوں کو بہت پسند کیا ہے اس کے بعد وہ نئے ایڈیشنوں کی نوید کے ساتھ تشریف لاتے اور پہلے کی طرح ایک لفافے میں بند رقم بھی عنایت کر جاتے۔ ناولوں کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے، جب اکیڈمی جا کر مزید کاپیوں کا مطالبہ کرتا تو معذرت کرتے ہوئے شیزان ریسٹورنٹ کے سامنے ان کے صاحبزادے ڈاکٹر ارشد مقبول کا جو شوروم تھا، وہاں سے حاصل کرنے کا کہتے۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا، یہ سلسلہ جاری رہا لیکن میرزا ادیب کی وفات ہم دونوں کے لئے ذاتی المیہ سے کم نہ تھی۔ میرزا ادیب ملک صاحب کے پسندیدہ مصنف ہی نہ تھے، ذاتی دوست بھی تھے۔ جہاں تک میرا تعلق تھا، مرحوم میرے لئے تو سب کچھ تھے۔ ان کی ذات ہمارے درمیان مسلسل ایسے رابطے کا باعث تھی، جو ان کے جانے سے کم و بیش عارضی طور پر منقطع ہو گئی لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ دل کو دل سے راہ ہو تو کوئی رکاوٹ آڑے نہیں آتی۔

Marfat.com

چند مہینے گزرے تھے کہ میں ایک روز حبیب بنک گیا وہاں اپنا ایک ڈرافٹ جمع کرانا تھا۔ اندر داخل ہوا تو ملک صاحب کو ایک فارم بھرتے پایا۔ علیک سلیک ہوئی۔ حسب معمول بڑی محبت سے ملے۔ نہ کوئی گلہ نہ شکوہ! فرمانے لگے میں دس بارہ روز بعد حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے جا رہا ہوں۔ قبل ازیں خاصی مصروفیت ہوگی۔ اگر دو تین دن میں آپ اکیڈمی آنے کی زحمت گوارا کریں تو ممنون ہوں گا۔ میں ان دنوں ایملی زولا کی بیس سالہ سوانح کے حوالے سے اس کی ایک ناول نما تصنیف کلوڈز کنفیشن کے ترجمے میں مصروف تھا سو وعدہ کی تعمیل نہ کر سکا۔

چند روز بعد موصوف خود غریب خانے پر تشریف لائے میری مصروفیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ سے ملاقات ضروری تھی، اس لئے حج پر جانے سے قبل خود حاضر ہوگیا ہوں'' میں معذرت طلب تھا۔ چند منٹ کی گفتگو کے بعد رخصت ہوتے ہوئے حسب معمول ایک لفافہ میز پر رکھا اور فرمایا میرے لئے دعا کیجئے! میں نے جواباً عرض کیا حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے تو آپ خود تشریف لے جا رہے ہیں، وہی منزل تو دعاؤں کی ہے۔ ہم جیسے لوگ جو فی الحال اس سعادت سے محروم ہیں ان کے لئے دعاؤں کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے۔

حجِ بیت اللہ کی سعادت حاصل کر کے ملک صاحب کی واپسی کب ہوئی، اس کا تو مجھے علم نہیں تاہم بعض احباب کی زبانی یہ پتا چلا کہ ملک صاحب مقبول اکیڈمی میں حسب معمول مصروف کار ہیں۔ بہر حال یہ بات میں بڑے یقین اور اعتماد سے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ حج کا مقدس فریضہ ادا کرنے کے دوران اپنی افتادِ طبع اور فطرت کے مطابق وہ اپنے احباب کو فراموش نہ کر سکے ہوں گے اسے حالات کا تقاضا سمجھئے یا موسموں کی ہر لمحے بدلتی ہوئی کیفیت کہ کچھ عرصے سے میرے لئے گھر سے نکلنا ہی خاصا دشوار ہو رہا ہے۔ کہیں ضرورتاً جانا بھی پڑے تو اپنے بعض احباب کا

Marfat.com

دست نگر ہونا پڑتا ہے۔ ان حالات میں کسی سے ملاقات کا تصور بھی ممکن نہیں ہوتا۔ کسی سے رابطہ زیادہ سے زیادہ فون پر ہی ہوتا ہے!

چنانچہ اب یہ روزمرّہ کا معمول ہے۔ البتہ کچھ روز قبل ایک فون کال نے مجھے قدرے چونکا دیا۔ ''میں مقبول بول رہا ہوں۔''

کون؟ مقبول خان مقبول میں نے استفسار کیا

''جی نہیں، میں مقبول اکیڈمی سے مخاطب ہوں۔''

تیری آواز مکے اور مدینے! میرے لبوں سے بے ساختہ نکلا

بہرحال چند روایتی جملوں کے تبادلے کے بعد ملک مقبول نے کسی وقت اکیڈمی آنے کا مطالبہ کیا۔ میں ایک کتاب پیش کرنا چاہتا ہوں! یہ دوسرا موقع تھا کہ ملک صاحب نے مجھے طلب کیا تھا۔ پہلی دفعہ بعض مصروفیتوں کے سبب جا نہ سکا تھا۔ البتہ لوڈشیڈنگ اور شدید گرمی کے باوجود دو روز بعد جب ملک صاحب سے ملاقات کے لئے لوہاری دروازے پہنچا تو اکیڈمی کو سابقہ مقام کی بجائے چند قدم آگے کی طرف پایا۔ اندر داخل ہوا تو سامنے میز کے سامنے معمول کے مطابق ملک صاحب براجمان تھے۔ ان میں صرف اتنی تبدیلی آئی تھی کہ اب چہرہ ترشی ترشائی ریش مبارک سے دمک رہا تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ مکتبہ کا حجم ماضی کی نسبت اگرچہ قدرے مختصر ہو گیا ہے لیکن چاروں جانب جو شیلف ہیں، ان میں خوبصورت اور خوش رنگ کتب کی آرائش وزیبائش وہی ہے، کہ جو تھی!

ملک صاحب نے بتایا کہ ان کے صاحبزادگان اور داماد اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں تاہم انہوں نے نشرواشاعت کو ہی اپنا پسندیدہ کاروبار قرار دیا ہے جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ ایک بیٹے نے ریگل پر شیزان ریسٹورنٹ کے قریب وسیع پیمانے پر

Marfat.com

کاروبار کا آغاز کیا تھا، اسے ہم اپنا شوروم بھی کہہ سکتے ہیں۔ اب بفضلِ خدا لنک روڈ ماڈل ٹاؤن، مین روڈ علامہ اقبال ٹاؤن اور صدیق ٹریڈ سنٹر گلبرگ میں مقبول بکس کے نام سے دوسرے بیٹوں اور داماد نے بالکل جدید پیمانے پر پبلشنگ کا کاروبار کیا ہوا ہے۔ اپنی محنت، تجربہ اور کارکردگی کے باعث کامیاب اور خوشحال زندگی بسر کر رہے ہیں۔ البتہ مرکزی حیثیت اس مختصر مکتبہ مقبول اکیڈمی کو ہی حاصل ہے۔ مختصری گفتگو کے بعد ملک صاحب نے میز کی دراز سے ایک خاصی ضخیم اور خوبصورت کتاب نکالی اور میرے حوالے کر دی۔ یہ کتاب ''سفر جاری ہے'' تھی اور اس کے مصنف خود ملک مقبول احمد تھے۔ 455 صفحات پر مشتمل اس کتاب کے ابتدائی صفحہ کے ساتھ مقبول اکیڈمی کے فارم پر ایک مراسلہ تھا۔ جس میں ملک صاحب نے مجھ سے کتاب کے حوالے سے اپنے تاثرات رقم کرنے کے لئے کہا تھا۔ میں نے اس وقت سرسری طور پر کتاب کے صفحات الٹ پلٹ کر کے دیکھے تو پہلا تاثر یہی تھا کہ کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد ہی کوئی رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ اس خیال کا اظہار ملک صاحب سے میں نے کیا تو انہوں نے بخوشی مجھے اس کی اجازت دے دی! بعد میں آدھا پونا گھنٹہ مزید نشست رہی۔ میرزا ادیب ہم دونوں کے محترم احباب میں سے تھے۔ زیادہ تر انہی کی شخصیت اور تصانیف کا تذکرہ رہا۔ کیسے کیسے لوگ تھے جو ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔

گھر آکر بلا توقف ''سفر جاری ہے'' کے مطالعہ میں مصروف ہو گیا۔ کتاب کے حوالے سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ ایک خودنوشت سوانحِ حیات ہی نہیں ایک ادبی، تہذیبی اور ثقافتی دستاویز بھی ہے اس کے مصنف نہ صرف یہ کہ سینکڑوں ادیبوں کی کتابیں شائع کر چکے ہیں بلکہ ان کی نجی زندگی سے بھی آگاہی رکھتے ہیں۔ ان کے معاشی اور معاشرتی کوائف بھی جانتے ہیں۔ ان حوالوں سے ہم اس تصنیف

Marfat.com

کو سرسری طور پر نہیں دیکھ سکتے بلکہ اس کا انتہائی سنجیدگی اور گہرائی کے ساتھ جائزہ لینے کی ضرورت ہے!

مزید یہ کہ کسی بھی سوانحِ عمری میں ایسی فضاء، ایسا منظر نامہ اور ایسے کردار سامنے آتے ہیں جن کا تاثر یا تو پہلے سے علم نہیں ہوتا یا ہوتا بھی ہے تو بہت کم ہوتا ہے اور یہ علم بالعموم معلومات میں اضافے کا سبب بنتا ہے ''سفر جاری ہے'' میں بھی ہمیں یہ سب کچھ ملتا ہے، جس کو مصنف نے بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

درجنوں خودنوشت سوانح عمریاں اور سفر نامے میرے زیرِ مطالعہ آئے، جن سے معروضی طور پر اپنے اپنے عہد کے علمی، ادبی، سیاسی اور تاریخی واقعات کے ساتھ ان کے لکھنے والوں کے ذاتی تجربات و مشاہدات سے آگاہی ہوئی لیکن یہ تصانیف ایک طرح سے باقاعدہ پیشہ ور اہلِ قلم کی صلاحیتوں اور کاوشوں کا نتیجہ تھی جبکہ ''سفر جاری ہے'' کی انفرادیت یہ ہے کہ یہ تصنیف ایک ناشر کی تخلیق ہے اور اس کے کم و بیش نصف صدی کے تجربات کا نچوڑ ہے۔

اس امر کی وضاحت غیر ضروری نہ ہوگی کہ ''سفر جاری ہے'' کوئی مافوق الفطرت تصنیف نہیں بلکہ ایک جیتی جاگتی جدوجہد کرتی زندگی کی کم و بیش نصف صدی سے زیادہ عرصے کی کامرانیوں اور ناکامیوں کی دیو مالا ہے۔ اس کو دو حوالوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ میرے نزدیک یہ خودنوشت سوانح بھی ہے اور ایک طرح سے سفر نامہ بھی ہے۔ یہ ایک ایسی تصنیف ہے کہ دونوں صورتوں میں جس کے دامن میں افسانہ طرازی کی بجائے راست گوئی اور حقیقت پسندی سے کام لیا گیا ہے!

مصنف نے دونوں حیثیتوں میں زندگی کے تلخ و شیریں کوائف اور واقعات کا اپنی خوبیوں اور خامیوں کا بلا تامل اعتراف کرتے ہوئے انہیں کسی تکلف کے بغیر بے کم و کاست بیان کیا ہے رواں دواں اور شستہ زبان قاری کو اپنی گرفت

Marfat.com

میں لے لیتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک فرد بے سروسامانی کے عالم میں دیہی زندگی سے اکتا کر شہر میں منتقل ہوتا ہے تو اس کا ردِ عمل اور تاثرات کیا ہوتے ہیں گھریلو ماحول، ازدواجی زندگی، بچوں کی تعلیم و تربیت بیشتر شب و روز کے لئے جدو جہد کاروبار میں کامیابیاں، ناکامیاں، اس کے بعد خوش حال زندگی یہ سب کچھ آپ کو ''سفر جاری ہے'' میں نظر آئیں گی۔

اہم بات یہ ہے کہ اس گئے گزرے اور منتشر دور میں بھی کتاب کا مصنف یاسیت کا شکار نظر نہیں آتا بلکہ بڑے حوصلے، جرأتمندی اور اعتماد کے ساتھ اپنے سفر پر رواں دواں ہے۔ ذاتی طور پر میں نے کتاب میں کچھ خامیاں تلاش کرنے کی سعی کی لیکن اپنی خامیاں تو مصنف نے خود اس طرح بیان کر دی ہیں کہ یہ بھی زندگی کا حصہ ہیں۔ اس کے نزدیک انسان انسان ہے! فرشتہ تو نہیں ہوتا!

چنانچہ کتاب کے حوالے سے اس نتیجے پر پہنچنا دشوار نہیں کہ ''سفر جاری ہے'' محض نشر و اشاعت کا سفر نہیں بلکہ تخلیقی سفر بھی ہے اور اس سفر کو آئندہ بھی جاری رہنا چاہیے۔ اس لئے کہ اب مصنف نے تو مستند ادیبوں میں اپنی جگہ بنا لی ہے۔

آتش کے اس شعر کے ساتھ!

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

ہفت روزہ ''اخبار جہاں'' کراچی

Marfat.com

اظہر جاوید

سفر جاری ہے

بعض لوگ اتنے عجیب ہوتے ہیں کہ ان پر رشک آتا ہے۔ بندہ ان کے کمالات دیکھ دیکھ کر اس کرید میں رہتا ہے کہ کاش، کہیں کوئی خامی بھی نظر آ جائے، اور جب ایسا نہیں ہوتا، یا جو بندہ ناکام رہتا ہے، تو پریشان ہو کر پھر ان کے کمالات میں گم ہو جاتا ہے۔

ملک مقبول کو میں ایک شریف آدمی اور وضع دار انسان سمجھتا تھا۔ افسوس، اس وقت ہوا، جب وہ چپ چپاتے ادیب بن گئے، اور یک بہ یک مشہور بھی ہو گئے۔ ان کی شرافت میں کھنڈت یہیں پڑی اور ان کی وضع داری کا بھرم اس وقت ٹوٹا، جب ان کے ایک زیرِ احسان شخص نے ان پر الزامات کی بوچھاڑ کر دی...... میاں محمد بخش نے ہم ایسے لوگوں کے لیے کہا ہے، دنیا دار کمینے..... تو کمینگی نے سر اٹھایا اور میں نے سوچا، برسوں سے کاروانِ ادب میں شامل ہیں، مگر دھول ہی بنے رہے، اور موصوف آئے اور آتے ہی جرسِ کاروانِ ادب بن گئے..... میرے خیال میں یہ ان کی غیر شریفانہ حرکت تھی۔ چلیں، لکھنا ہی تھا، تو ہم ایسے کج مج بیان لوگوں کی طرح لکھتے، نہ کوئی تعریف کرتا نہ تحسین کی داد نچھاور کرتا...... ہم نے تو برسوں کی ریاضت کے بعد منافق اور مخالف پالے ہیں۔ انہوں نے پہلی کتاب کی

Marfat.com

اشاعت کے پہلے مہینے ہی میں حاسد پیدا کر لیے، جس سے ان کا قد اور بلند ہو گیا.... اب یہ تو کوئی وضع داری نہ ہوئی......

''سفر جاری ہے''...... پڑھ کر پتا چلا کہ انہیں ادب کا چسکا بہت پہلے پڑ گیا تھا.... کہ جب آتش جواں تھا..... خوب صورت وہ تب بھی تھے، اب بھی ہیں، مگر غزل کے شعر کی طرح کچھ کہہ کر بھی کچھ ان کہی چھوڑ گئے ہیں.....

''چودھویں صدی'' کے نام سے رسالہ جاری کیا.... اس وقت ''بیسویں صدی'' کا زیادہ چرچا تھا..... ایک صاحب نے ''بیسویں صدی'' لاہور سے بھی جاری کر دیا، اور کسی نے ''اکیسویں صدی'' کا عنوان بھی ڈھونڈ لیا۔ یہ اکیسویں صدی شروع ہونے سے کم و بیش تیس چالیس برس پہلے کی بات ہے۔

''چودھویں صدی'' نام کا پرچہ تو یاد ہے، مگر اس میں کیا کیا ہوتا تھا، یہ اب دھیان میں نہیں..... ادب کا تڑکا لگ چکا تھا..... پھر وہ مدیر سے ناشر بن گئے۔ ناشر تو وہ اپنے رسالے کے بھی تھے، اب انہوں نے کتابوں کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا..... حیرت کی بات ہے، اپنے دور کے بہت سے نام ور لکھنے والوں سے ان کے قریبی تعلقات رہے، لیکن ان میں غرور نہیں آیا.... انہوں نے غربت سے سفر شروع کیا، اور **الحمد للّٰہ** اب وہ خوش حال ہیں، اس دوران انہیں کاروباری چرکے بھی لگے، اہلِ ادب نے بے ادبی کے زخم لگائے، لیکن ان میں جھنجلاہٹ پیدا ہوئی نہ انتقام کا جذبہ..... ایک گہرا انکسار ان کے مزاج کا حصہ بن گیا۔ یہاں تو کسی عام سے ناشر کے پاس جائیں تو اس کی کرسی مزید اونچی ہو جاتی ہے، ملک مقبول تو عجز سے فرش ہوئے جاتے ہیں۔ اپنی اس عمر عزیز میں، جو ادب کے دشت کی سیاحی میں گزری، ناشرین کو بعد میں بھی ادائیگی کرتے نہیں دیکھا، تعجب ہوتا ہے، وہ پیشگی دیتے ہیں۔ اکثر زک اٹھاتے ہیں، پھر بھی نہ پریشان ہوتے ہیں نہ غچہ دیتے

Marfat.com

والے کا نام زبان پر لاتے ہیں۔ مجھے اس آپ بیتی سے یہ بھی شکایت ہے، کہ انہوں نے اشاروں کنایوں میں ایسے ادیبوں شاعروں کا حوالہ دیا ہے، اب میرے ایسے لوگ خیالوں میں ٹامک ٹوئیے مارتے ہیں، کہ وہ ہو سکتا ہے، یا وہ بھی ہو سکتا ہے ...... اسی طرح انہوں نے کچھ ادیباؤں کا ذکر کیا ہے.... ایک سانولی سی ادیبہ کا نام لیا جو اب معروف ناول نگار ہے۔ وہ ان کے ہاں آتی تھی، اور ان کا ایک رفیق کار اس پر فریفتہ بھی ہو گیا تھا.... میں نے دنیادار کمینوں کی طرح پچھلے دنوں ایک سانولی ادیبہ (ناول نگار) سے پوچھ ہی لیا.... اس نے نہایت صفائی سے کسی دوسری کا نام لے دیا۔

لوگ کہتے ہیں، کہ یہ ملک مقبول کی شرافت ہے، کہ انہوںؒ نے نام نہیں لیے.... میں کہتا ہوں کہ بزدلی ہے..... یا تو آپ بیشتر معاملات کی طرح اسے بھی گول کر جائیں، یا پھر خواتین و حضرات سب کے نام لکھیں۔

سفرنامے میں اظہار کی زبان سادہ اور معصوم ہے، معلوم ہوا کہ مصنف شعر فہم بھی ہیں اچھے شعر برمحل استعمال کیے گئے ہیں۔ کتاب میں مصنف، اور ان کے کنبے کی رنگین تصویروں کے علاوہ ان معروف لوگوں کے خطوط اور تصویریں بھی شامل ہیں، جن سے عمر بھر ان کا تعلقِ خاطر رہا...... اللہ تعالیٰ بعض بندوں کو اسم با مسمّٰی بنا دیتا ہے، مقبول، واقعی بہت مقبول ہو رہے ہیں (ہو چکے ہیں)، اسے وہ اپنی والدہ کی دعاؤں کا نتیجہ کہتے ہیں...... ایسا ہی ہوگا...... میں ان پر رشک کرتا ہوں۔ کرتا رہوں گا۔ کتاب کے آخر میں، مصنف نے اپنے ادارے کی کتابوں پر دوسروں کے کیے ہوئے تبصرے بھی شامل کر دیئے ہیں، جن کا اس آپ بیتی میں کوئی محل نہیں۔ سفید کاغذ، رنگین تصویریں، مضبوط جلد، سب برحق، مگر قیمت بہت زیادہ ہے۔

(ماہنامہ تخلیق۔ جون 2007ء)

Marfat.com

پروفیسر جمیل آذر

سفر جاری ہے ــــ محبتوں کی مسافتوں کا

" The man who writes about himself and his own time is the only man who writes about all people and all time."

(George Bernard Shaw)

جنگل کی دیویوں نے جب جھیل سے پوچھا کہ کیا واقعی نارسس بہت خوبصورت تھا تو جھیل نے جواب دیا کہ میں نے اس طرف کبھی دھیان نہیں دیا کیونکہ جب ہر روز وہ میرے کناروں کے پاس جھکتا تھا تو میں اُس کی گہری نیلی آنکھوں میں اپنے ہی حسن کو منعکس ہوتا دیکھتی تھی۔ عین اس دلآویز اسطورہ کے مطابق میں نے جب ملک مقبول احمد کی آپ بیتی "سفر جاری ہے" کا مطالعہ کیا تو میں نے صفحۂ قرطاس پر مرقوم لفظوں کے آئینہ میں اپنے ہی حسن کا دیدار کیا اور سرشار ہو گیا۔ ماضی کے جھروکے سے جن یادوں کو ملک صاحب نے دیکھا اور بازیافت کیا مجھے ایسے لگا کہ وہ میری ہی یادوں کو آئینہ دکھا رہے ہیں۔ میری اور اُن کی پیدائش کا ایک ہی سن ہے۔۔۔ ۱۹۳۰ء۔

میری اُن سے ابھی بنفسِ نفیس ملاقات نہیں ہوئی۔ لیکن میری پہلی ملاقات

Marfat.com

اِس دلآویز جھیل یعنی ''سفر جاری ہے'' کے حوالے سے ہوئی اور میں مسحور ہوگیا۔

میں ڈاکٹر انور سدید کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ جنہوں نے نہ صرف میرا تعارف ایک کتاب دوست اور ادیب پرور ناشر سے کروایا بلکہ ایک بہت ہی پیارے انسان اور مُشفق مسیحا سے بھی ملوایا۔

میرا دعاؤں پر یقین ہے اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ میں مُستجاب الدعوات ہوں۔ میں نے دعا کی تھی اور وہ دعا ملک مقبول احمد کی شکل میں اللہ رب العزت نے قبول فرمائی۔

کتاب کے صفحہ پر وہ لکھتے ہیں ''میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں صرف ایک کتب شائع کرنے، کتابیں فروخت کرنے والا محنت کش انسان ہوں، ادیب، شاعر یا دانشور نہیں'' یہ اُن کی سادگی، خلوص، اور صداقت پر مبنی الفاظ ہیں۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ وہ عرفِ عام میں پیشہ ور ادیب، شاعر یا دانشور نہیں لیکن اِس کتاب کے مطالعے کے بعد مجھ پر جو شخص منکشف ہوا۔ وہ ادیب بھی ہے، شاعر بھی ہے اور دانشور بھی، دیکھیئے وہ کس خوبصورت افسانوی انداز میں اپنے بچپن کے ایک یادگار منظر کو بیان کرتے ہیں۔

> ''یہ بات بھی میرے احساسات اور محسوسات ہی میں شمار ہوگی کہ اپنے گھر کے چوبارے کی چھت پر بیٹھ کر شمال میں ہمالیہ کی برف سے ڈھکی چوٹیاں دیکھنا مجھے بہت بھلا لگتا تھا۔ صبح کی چمکتی دھوپ کا عکس اُن کو خوب چمکائے رکھتا۔ گرمیوں کی صبحوں میں یہ چمک نیلی دھاریاں بن جاتی جو دراصل برف کے پگھلنے کے عمل کا عکس ہوتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اچانک گھٹائیں اُمنڈ آتیں اور سارا منظر

Marfat.com

ڈھانپ لیتیں۔ گھٹاؤں کی سیاہی کے پیش منظر، اُڑتے بگلوں کی سفید قطاریں خوبصورت منظر پیش کرتیں۔۔ اب بڑھاپے کی عمر میں، میں سوچتا ہوں کہ بچپن کا زمانہ کتنا خوبصورت زمانہ تھا۔ ہوا کی سرسراہٹ میں جلد ہی بارش کے سرلانے دیکھتے ہی دیکھتے پورے منظر اور ماحول کو بدل دیتے۔ خنکی چھا جاتی۔ میری ماں نیچے سے پکارتی اور میں نیچے آتے آتے اپنے کپڑے بھگو لیتا تاکہ باہر جاکر اپنے ہم عمر لڑکوں سے کھیلوں اور گاؤں کے جوہڑ کو پانی سے بھرتا ہوا دیکھوں۔''

اتنی خوبصورت اور مسحور کن تحریر اُسی کی ہو سکتی ہے جو منجھا ہوا ادیب ہو، جس کا تخیل تیز ہو، اور جس کے احساسات نازک اور لطیف ہوں۔ یہ تمام عبارت شاعرانہ حسن کی عکاس ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے گھر کی چھت پر بیٹھ کر شمال میں ہمالیہ کی جن برف پوش چوٹیوں کو دیکھا تھا۔ وہ آج بھی اُن کے ذہن کے حساس پردے پر پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہی ہیں۔ برف کے پگھلنے کا منظر اور اُن میں چمکتی ہوئی نیلی دھاریوں کا عکس آج بھی اُن کی نگاہوں کے سامنے ہے، آنِ واحد میں گھٹاؤں کا چھا جانا اور تمام منظر کو ڈھانپ لینا اور اس کے پیش منظر میں بگلوں کی سفید قطاریں، ایسے منظر ہیں جو اس ڈھلتی ہوئی عمر میں بھی انہیں مسرور کر رہے ہیں۔ ہوا کی سرسراہٹ اور پھر بارش کا برسنا اور اس سرلانے میں تمام منظر کا بدل جانا، اب بھی ان کے دل میں گدگدی پیدا کر رہا ہے، پھر ماں کی ممتا نے اپنے لاڈلے کو نیچے بلانا اور اُس کا بھیگے ہوئے کپڑوں کے ساتھ اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ کھیلنا اور گاؤں کے جوہڑ کو بارش کے پانی سے بھرتا دیکھنا، ایسے دلفریب مناظر ہیں، جو اُن کی تمام حسیات میں اب بھی جاری و ساری ہیں۔

Marfat.com

یہ سارا پیراگراف حُسن و رعنائی سے مملو ہے اور اِس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ ملک مقبول احمد ایک صاحبِ طرز نثر نگار ہے ۔ اِس عبارت میں شاعرانہ خوبصورتی اور افسانوی سحر کاری ہے۔ میں جب اُن کے گاؤں کی باتیں پڑھ رہا تھا تو عالم تخیل میں، میں خود بھی اپنے ننھیال کے گاؤں نلوی (بھارت) چلا گیا تھا وہاں کا جوہڑ بھی بارش کے پانی سے بھر جاتا تھا، بیروں کے جھنڈ اور آم کے باغات تھے، گندم ،مکئی اور باجرے کے کھیت تھے، پلکھن کا گرانڈیل پیڑ تھا، جس کے نیچے چھوٹے ، بڑے اور بزرگ گرمیوں کی دھوپ سے بچنے کے لئے ستاتے تھے۔ ملک مقبول احمد نے اپنے تربوز کھانے کے منظر کو تو بڑے ہی رچاؤ کے ساتھ اِس طرح بیان کیا ہے۔

''تربوز جب پک جاتا، تو شام کو اس میں سوراخ کر کے تھوڑی سی
چینی ڈال کر بند کر دیا جاتا اور صبح جا کر اُسے بیل سے توڑ کر لے
آتے اور کنویں پر بیٹھ کر کھاتے''

ملک صاحب کے گاؤں دیووال اور میرے گاؤں نلوی میں اور ہمارے بچپن کے واقعات میں بلا کی مماثلت ہے۔ یہ سطور پڑھتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں بھی اُن کے ساتھ اپنے بچپن کے گاؤں کو اپنی نانی ، ماموں ، ممانی اور ماں کو تمام احساسات کے ساتھ اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں ۔ ایک ادیب کا یہی کمال ہے کہ وہ قاری کے احساس و تخیل کو جلا بخشے ۔ انہوں نے حیرت انگیز طور پر اپنے گاؤں سے وابستہ تمام سرگرمیوں کو بڑی باریک بینی کے ساتھ سپردِ قلم کیا ہے۔ وہ اپنے بچپن کے دوست میر خلیل احمد کو بھی نہیں بھولے ۔ جب وہ آتا تو اُن کی ماں چاول پکا کر اُس پر دہی اور چینی ڈال کر انہیں دیتیں اور پھر یہ من پسند ڈش دونوں دوست مل کر کھاتے۔ وہ اپنی والدہ محترمہ کی محبت اور ماتا کا ذکر بڑے سلیقہ، فنی رچاؤ، خلوص ، صداقت اور محبت کے ساتھ کرتے ہیں۔ ماں کے صبح کے معمولات کو وہ اِس طرح بیان کرتے

Marfat.com

ہیں:

''سحری کے وقت اُٹھ کر چکی پیسنا، اوکھلی میں چاول چھڑنا اور صبح کو بھینس کو بھوسہ ڈال کر دودھ نکالنا یہ سارے کام میری ماں خود کرتی رہی''

کتنا خوبصورت مثالی کردار ہے۔ آگے چل کر بے جی کا اپنے بیٹے کے آنے کا بے تابی سے انتظار کرنے کے منظر کو وہ اِس طرح سپردِ قلم کرتے ہیں:۔

''ہماری حویلی کے سامنے کا سڑک تک کھلا منظر زیادہ تر میری بے جی کے استعمال میں رہتا تھا۔ وہ اِس منظر کو ظفر وال جانے والی سڑک تک وسعت دے دیتی تھیں۔ وہاں تک سڑک پر کوئی درخت، ٹیلہ، مکان یا جھونپڑی بھی نہ تھی۔ وہ بس اپنے ''بیٹے'' کو سکول یا آوارہ گردی سے واپس آتا دیکھنے کی متمنی ہوتیں تاکہ اُدھر وہ سڑک پر نمودار ہو اِدھر وہ اُس کے لیے گرما گرم پُوڑے (میٹھی روٹی) تیار کر لیں۔ وہ میرے گھر پہنچنے سے قبل میرے دوپہر کے کھانے کا بندوبست کر لیتی تھیں۔ خصوصی طور پر وہ میرے لئے حلوہ، میٹھے چاول اور برسات میں پوڑے تیار کرتیں۔ السی کی پنیاں، ماش کی دال کا حلوہ، سوجی کی برفی تو ایک معمول کی بات تھی۔ ہم سب گرمیوں میں رات کو چھت پر مچھر دانی لگا کر سوتے تھے۔ صبح میں چاٹی سے دودھ پر آئی ہوئی موٹی بالائی اتار کر کھا لیتا جو بہت مزیدار ہوتی تھی۔ دن کو لسی، شربت اور کبھی کبھی ستو بھی مل جاتے۔ بھینس کے لیے چارہ کھیت سے میں خود لاتا۔ اگر کھیت میں چارے کی فصل نہ ہوتی تو کہیں سے گھاس کاٹ کر لے آتا۔ باقی سب کام میری

Marfat.com

ماں خود کرتی تھیں''

اُس روح پرور تحریر میں تمام امیجز ہمارے دیہات کے لوگوں کے معمولات، کھانوں اور ثقافت کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ اِن کھانوں اور مشروبات میں چائے کا کوئی ذکر نہیں۔ دراصل چائے ہمارے کلچر کا حصہ نہیں تھی۔ یہ غیر ملکی مشروب تھا، ہے اور رہے گا۔ اِس تمام عبارت میں کوئی حاشیہ آرائی نہیں، کوئی غیر ضروری تفصیل نہیں کوئی رومانوی رنگ آمیزی نہیں، سادگی، سلاست اور روانی کے ساتھ ساتھ ایجاز و اختصار کا حسن مترشح ہے۔ معصومیت اور صداقت کی خوشبو سے تمام فضا مہک رہی ہے۔ ورڈز ورتھ کے بقول ہمیں دنیا کی آلائشوں سے بچہ ہی بچا سکتا ہے۔ جس شخص کے اندر اس کا بچپن زندہ ہے، وہ شخص گناہوں سے بچا رہے گا۔ ملک مقبول احمد نے اپنے اندر کے بچے کو پوری معصومیت اور حسن و رعنائی کے ساتھ زندہ رکھا ہوا ہے جسے ماں کی محبت اب بھی دور سے آتا ہوا دیکھتی ہے اور اُسے حلوہ، میٹھے چاول، پوڑے، السی کی پنیاں، ماش کی دال کا حلوہ اور سوجی کی برفی کھلاتی ہے۔ اُن کے بہترین دوست اب بھی بچے ہی ہیں۔ ملک صاحب نے دیہاتی ثقافت کو لفظوں کے پیکروں میں محفوظ کر لیا ہے۔

وہ اپنے بچپن کے جن مشاغل کا ذکر کرتے ہیں، میں بھی اپنے بچپن میں ایسے ہی مشاغل کا دلدادہ تھا، جن میں گلی ڈنڈا، بنٹے (کنچے)، اخروٹ اور لکن میٹی کھیلنا سرِ فہرست ہیں۔ ہائے وہ کیا دن تھے! میں تمام دوپہر بنٹے اور اخروٹ کھیلنے میں گزار دیا کرتا تھا اور اس سے بڑھ کر کوئی اور خوشی نہیں سمجھتا تھا اور رات کے آتے ہی لکن میٹی کا کھیل دل کو بے حد لبھاتا تھا۔ میں نے ابتدا میں کہا تھا کہ میں نے اِس کتاب کے لفظوں کے آئینے میں اپنے ہی حسن کا دیدار کیا ہے۔ ملک صاحب نے

Marfat.com

بچپن کے اس سنہری زمانہ کی یادوں کا ذکر کر کے میرے احساس کے تمام تاروں کو چھیڑ دیا ہے اور میں زمانہ حال سے اٹھ کر ماضی کے لیل ونہار میں چلا گیا ہوں جو رومان پرور اور وجد آفرین ہے۔ مجھے تو یوں معلوم ہو رہا ہے کہ میں ملک مقبول احمد کی آپ بیتی نہیں بلکہ اپنی آپ بیتی پڑھ رہا ہوں:۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اِس خودنوشت کا یوں تو ہر ورق دلچسپ ہے ہر لفظ آب دار موتی ہے لیکن اِس کا جو سب سے زیادہ خوبصورت حصہ ہے۔ وہ گاؤں کی ثقافت ہے، جس کی طرف میں نے اوپر بھی اشارہ کیا ہے۔ جب ساون آتا ہے اور اپنے دلکش رنگ بکھیرتا ہے اُسے ملک صاحب کے مُوقلم نے یوں پیش کیا ہے:

''ساون میں بادل اُمنڈ کر آتے اور بارش کھل کر برستی۔ ندی نالے، کھیت کنویں اور جوہڑ سب بھر جاتے۔ سطح زمین پانی کی ہموار چادر نظر آتی۔ زرد رنگ کے مینڈک ہزاروں کی تعداد میں نہ جانے کہاں سے آجاتے اور کھیتوں کی منڈیروں پر بیٹھ کر ایک ساتھ ٹراتے، چوہے، سانپ، نیولے خشک جگہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر نکل جاتے۔ کچھ درختوں پر بھی چڑھ جاتے جہاں سے انہیں چیلیں اور شکرے پکڑ کر کھانے کے لئے اونچے درختوں پر لے جاتے۔۔۔''

اِس اقتباس میں جہاں اُن کے مشاہدے کی تیزی اور باریک بینی کا پتہ چلتا ہے، وہاں اُن کی فوٹوگرافک یادداشت کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ گاؤں میں موسم برسات

Marfat.com

کے مناظر کے علاوہ وہاں کے میلے ٹھیلے، ناٹک اور بازی گروں اورنٹوں کے حیرت انگیز جسمانی کرتب، بندر اور ریچھ کے تماشے والے، جونکیں لگا کر علاج کرنے والے، طوطوں سے فال نکال کر علمِ غیب کے بتانے والے، خانہ بدوشوں کے ڈیرے اور مشہور گویوں کا ساری ساری رات گا کر محفل جمانے اور سامعین سے ویلیں یعنی روپے پیسے لینے کے انداز بڑے دلفریب ہوتے تھے۔ دیکھئے ناٹک دکھانے والے گروپ کے بارے میں کتنی خوبصورتی سے ملک صاحب نے تصویر کھینچی ہے کہ گاؤں کی ثقافت کا حُسن سمٹ کر ہمارے سامنے آ گیا ہے

''اِس طرح ناٹک کرنے والے گروپ بھی آتے۔ خوام تین کا کردار ادا کرنے کے لیے ان میں نوجوان خوبصورت لڑکے ہوتے وہ ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال اور سسّی پنوں جیسے مشہور عاشقوں کے سوانگ بھرتے، مکالمے بولتے اور گاتے، ہیروئن کا کردار ادا کرنے والا لڑکا نسوانی آواز میں گاتا اور اُس پر خوب روپے نچھاور ہوتے۔ اس دور کا ایک روپیہ آج کے دور کے پچاس روپوں سے زیادہ قیمتی ہوتا تھا۔

''یہ ناٹک دکھانے والے راس دھاریے کہلاتے تھے۔ ان کا ایک ایک کھیل تین تین راتیں چلتا رہتا۔ تماشائیوں میں معززین بھی شامل ہوتے اور وہ کرسیوں پر اگلی صفوں میں بیٹھتے۔ کوئی ٹکٹ نہ ہوتا۔ انعام میں دی جانے والی دوّنی، چوّنی یا اٹھنی پیتل کے تھال میں ڈال دی جاتی جس میں سرسوں کے تیل کا دیا یا موم بتی جلا کر رکھی جاتی تھی۔ ایک روپیہ کا انعام بہت بڑا ہوتا تھا۔ خوبصورت راس دھاریہ چاندی کے روپیہ کا سکہ اس تماشائی کے ہاتھ سے

Marfat.com

پکڑتا، چومتا اور سارے مجمعے میں اعلان کرتا کہ یہ انعام کس شخص
نے دیا ہے۔۔۔۔"

آپ نے غور فرمایا ملک صاحب نے کس خوبصورتی اور ہنرمندی کے ساتھ سادہ اور سلیس انداز میں گاؤں میں برپا کھیل تماشوں کو، تماشہ کرنے والوں اور دیکھنے والوں کی زندگی سے بھرپور تصویریں پیش کی ہیں۔ اگرچہ یہ سب باتیں ماضی کا حصہ بن چکی ہیں لیکن ملک مقبول احمد نے انہیں اپنی سوانح حیات میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کرلیا ہے۔ میں نے آج تک اتنی تفصیل سے گاؤں کے یہ مختلف رنگ روپ، اور کھیل تماشے کبھی نہیں پڑھے۔ ہاں یہ سب کھیل تماشے میں نے ایسے ہی دیکھے ہیں، جیسے کہ ملک صاحب نے بیان کیے ہیں۔ اس کتاب میں میری دلچسپی اسی لیے اول سے آخر تک بڑھتی چلی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نصف صدی سے پہلے کا ان کے بچپن کا گاؤں، دیووال اپنی تمام ثقافت، بُو باس اور دھڑکنوں کے ساتھ ملک مقبول احمد کی روح میں پوری آب وتاب کے ساتھ بسا ہوا ہے۔ انہوں نے ہمیں گاؤں کی اس زندگی میں جو معصومیت، حُسن، صداقت اور دیانت سے مملو تھی۔ بھرپور شرکت کی دعوت دی ہے۔

یہ کتاب دلچسپ واقعات، لطیف جذبات، حسین تخیلات سے مالا مال ہے اس کتاب کا ہیرو زاہد خشک نہیں۔ وہ زندگی کی تمام رعنائیوں سے لطف اندوز ہوتا ہے اور ہمیں لطف اندوز ہونے کی نرم وملائم ترغیب بھی دیتا ہے۔ وہ حسن کو پسند کرتے تھے اور اس میں دلچسپی لیتے تھے۔ دو بہنوں شہناز اور شمشاد تو ان کی آئیڈیل تھیں۔ شمشاد اگرچہ شہناز کے مقابلے میں زیادہ خوبصورت نہ تھی لیکن اپنے اندر غضب کی کشش رکھتی تھی۔ اس پر گفتگو کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں۔

"اس کے بات کرنے کا انداز انوکھا تھا۔ اٹھنے بیٹھنے اور چلنے کا

Marfat.com

وقار نرالا تھا۔ دیکھنے اور مجھے بلانے کا طریقہ ایسا تھا کہ خوامخواہ میرا دل چاہتا کہ میں اِس کے اِردگرد ہی پھرتا رہوں۔ یہ اعتراف کرنا کوئی غیر معمولی بات نہ ہوگی کہ ''میرا مزاج لڑکپن سے ہی عاشقانہ تھا''۔ میں ہر خوبصورت لڑکی کو دل دے بیٹھتا۔ خوبصورت دِلکش شخصیت کے سامنے دل و دماغ پر قابو نہ رہتا تھا۔ میری کیفیت کچھ یوں ہو جاتی:۔

ترے کوچے اس بہانے مجھے دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا!!

میں یہ سطور پڑھ کر بے حد مسرور ہوا۔ کیونکہ جوانی کے عالم میں میری اپنی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ اگر کوئی شخص عالم شباب میں حسن پرست نہیں تو یقیناً وہ شخص بیمار ہے۔ میں نے اپنے ایک انشائیہ ''آپ کا کیا خیال ہے'' میں نے انسانی زندگی کے تین ادوار کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اِن ادوار میں ایک صحت مند آدمی کے لیے کیا ضروری ہے۔ عبارت یہ ہے:

''ہر چیز کا وقت ہوتا ہے اور اس وقت وہ کام کرنا اچھا لگتا ہے۔ مثلاً بچپن میں اگر بچہ کھیل کود میں دلچسپی نہیں لیتا۔ کانچ کی گولیاں اور اخروٹ نہیں کھیلتا، پتنگ بازی نہیں کرتا، کبوتر نہیں اُڑاتا اور طوطا نہیں پالتا تو سمجھ لیجئے کہ یہ بچہ جسمانی طور پر بیمار ہے۔ اسی طرح اگر کوئی نوجوان حسن و عشق میں دلچسپی نہیں لیتا تو وہ بھی یقیناً نفسیاتی طور پر بیمار ہے۔ اور اگر کوئی شخص عالمِ بزرگی میں اپنے خالقِ حقیقی کی طرف رغبت نہیں کرتا تو وہ بھی روحانی طور پر بیمار ہے''

Marfat.com

مجھے خوشی ہے ملک صاحب بچپن میں بھی، جوانی میں بھی اور اب عالمِ بزرگی میں بھی صحت مند رہے ہیں۔ بچپن اور لڑکپن میں انہوں نے اُن تمام کھیلوں میں، شرارتوں میں اور میلوں ٹھیلوں میں شرکت کی، جو بچوں کا فطری حق ہے۔ جوانی میں انہوں نے حسن و عشق کی وادی میں قدم رکھا اور اب عالمِ بزرگی میں عشقِ الٰہی سے سرشار اور حضور ﷺ کی محبت سے مالا مال ہیں

شغل بہتر ہے عشق بازی کا
کیا حقیقی اور کیا مجازی کا

ملک مقبول نے بچپن سے لے کر اب تک عشق کیا ہے۔ ماں باپ سے، بہن بھائی سے، دوستوں سے، کھیل کود سے، بیوی بچوں سے، اپنے کاروبار سے اور مجموعی طور پر اِنسان سے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں عشق کی دولت سے بھرپور نوازا ہے۔ ڈاڑھی رکھنا اس شخص کے لیے مشکل ترین کام ہے۔ جو ساری عمر شیو کرتا رہا ہو۔ لیکن جب خالقِ حقیقی توفیق دیتا ہے تو یہ چہرے پر خود بخود سجنا شروع ہو جاتی ہے۔ ملک مقبول احمد نے بھی حج کی سعادت کے بعد اپنے چہرۂ مبارک کو نقرئی ریش سے سجا لیا ہے۔ اِس بات کو میں انگریزی الفاظ میں ادا کرنا زیادہ پسند کروں گا۔

He has framed his face with a beautiful beard.

سچی بات تو یہ ہے کہ ڈاڑھی مرد کے چہرے پر خوبصورت فریم ورک کا کام کرتی ہے جس سے چہرہ مزید خوبصورت ہو جاتا ہے۔ اس کے حُسن کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے، جو اس تجربہ سے گزرتا ہے:

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اِس کتاب میں بعض ایسے ناقابلِ فراموش کردار ہمارے سامنے آئے

Marfat.com

ہیں، جو مینارۂ نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ انہیں ''تمدّنِ عرب'' کے نام سے ایک کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں رقم درکار تھی۔ بڑی سوچ بچار کے بعد وہ اپنے بڑے ماموں کے پاس گئے جو اُن کے سسر بھی تھے۔ لیکن افسوس انہوں نے قرض دینے سے صاف انکار کر دیا۔ حالانکہ وہ صاحب استطاعت تھے اور ان سے زیادہ قربت کسی اور سے نہیں ہو سکتی تھی اِس مشکل کو حل کرنے کے لیے وہ ایک ایسے شخص کے پاس گئے، جن سے اُن کی بالمشافہ کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہ صرف اُن کے قلمی دوست تھے۔ یہ شخص ملک اللہ داد تھا جو میانوالی کے ایک گاؤں سلطان خیل میں رہتا تھا۔ اِس شخص نے نہ صرف مہمان نوازی کا حق ادا کیا بلکہ اُن کی پریشانی کو دور کرنے کے لیے پانچ ہزار کی خطیر رقم بھی بڑی انکساری کے ساتھ اُن کی ہتھیلی پر رکھ دی۔ دیکھیے اِس واقعہ کو وہ کتنی سادگی اور نفاست کے ساتھ بیان کرتے ہیں:۔

> ''ملک صاحب نے جی کھول کر میری آؤ بھگت کی اور پھر نہایت ملائمت بھرے لہجے میں میری آمد کا سبب دریافت فرمایا۔ میں نے قدرے تذبذب کے ساتھ اپنی پریشانیوں کا اظہار کر دیا۔ جواب میں انہوں نے کمال مروت اور لجاجت کے ساتھ مجھے پانچ ہزار روپے عنایت فرما دیئے۔ اُن دنوں پانچ ہزار روپے لاکھوں کے برابر تھے انہوں نے بڑی انکساری کے ساتھ رقم میری ہتھیلی پر رکھی اور میرے چہرے کی طرف نظر تک نہیں اٹھائی''

یہ کتنا عظیم شخص تھا کہ اس نے رقم کی واپسی تک کا اشارہ نہیں کیا۔ اپنے سگے ماموں کی نسبت تو یہ غیر ہی مشفق و مہربان نکلا۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے:

دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست
در پریشاں حالی و درماندگی

Marfat.com

یہ رقم ملک صاحب نے ملک اللہ داد خان کو قسطوں میں ادا کی اور ایک قسط تو اُن کی رحلت کے بعد اُن کے بیٹے کو ادا کی۔ ملک مقبول احمد آج بھی اُن کے تہہ دل سے شکرگزار ہیں اور اُن کی بلندیٔ درجات اور مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔

کلوئے کا میاں اللہ ماہی ایک عجیب کردار اُن کی زندگی میں آیا۔ اس شخص کی کلوئے میں ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ وہ بہت نیک شریف اور بچوں سے پیار کرنے والا انسان تھا۔ اس کا معمول یہ تھا کہ صبح کو بچوں کی سکول میں آمد سے ذرا قبل وہ اپنی دکان کھولتا اور چھٹی سے پانچ منٹ پہلے دکان بند کر دیتا۔ ملک صاحب کا تجسس بڑھا تو ایک روز ان سے پوچھ ہی لیا کہ وہ سکول بند ہونے کے آدھ گھنٹے تک دکان کو کھلا کیوں نہیں رکھتے۔ اس نے جواب دیا:

''میری شادی ہوئی ہے، نہ بچے ہیں اور بھی تو کوئی ایسا نہیں ہے جس سے میں دل کی باتیں کرسکوں۔۔۔ مجھے بچے سکول میں آتے دیکھ کر بڑی تسکین ہوتی ہے۔۔۔اُن کو جاتے دیکھ کر دکھ ہوتا ہے۔۔۔اسی لیے میں نے اپنی دکان کے اوقات ایسے رکھے ہیں کہ میں اداسی کے مناظر نہ دیکھوں''

یہ بات سن کر ملک مقبول احمد اُن کے اندرونی دکھ سے آگاہ ہوگئے اور خود بھی دکھی ہوگئے۔ دوسروں کے دکھ کو اپنا سمجھنا اور دوسروں کی خوشیوں میں شریک ہونا ملک صاحب کی خاص بات ہے جو لوگوں میں عموماً کم کم ہے۔ انہوں نے اس کے بعد میاں اللہ ماہی کی دلجوئی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ پانچ چھ سال بعد جب ملک صاحب لاہور میں اپنا کاروبار کر رہے تھے تو انہیں غلام نبی نے بتایا کہ میاں صاحب کی شادی ہوگئی ہے۔ دیکھیے اس خوشخبری کو ملک صاحب کس طرح محسوس کرتے ہیں:

''مجھے یوں لگا۔۔۔۔ جیسے میری اپنی شادی ہو رہی ہے اور میں

Marfat.com

اپنی بچپن کی منگیتر سے ملنے والا ہوں۔۔۔میں اِس خبر سے اتنا خوش ہوا کہ میں نے اسی وقت میاں اللہ ماہی کو مبارک باد کا خط لکھا''۔

دوسروں کے دکھ سکھ کو اپنا سمجھنا اور اُسے محسوس کرنا بہت بڑی بات ہے۔ یہی وہ اعلیٰ صفت ہے جو آدمی کو عظیم بناتی ہے۔ اِنسان دولت، عہدہ و اقتدار سے بڑا نہیں ہوتا بلکہ نیک اعمال اور انسانیت سے پیار کرنے سے بڑا ہوتا ہے۔ ملک صاحب کو یہ بے بہا دولت، مبداءِ فیض سے فراواں ملی ہے۔

کلوئے کے اللہ ماہی کے بعد ایک اور خوبصورت کردار چودھری دسوندھی خاں کا ہے جو اُن کے گاؤں دیۂ وال اور کلوئے کے درمیان مشہور گاؤں ورک سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اپنے علاقے کے ذیلدار تھے، نہایت خوبصورت، وجیہہ اور پُرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ ذیلدار دسوندھی خاں کے بارے میں ملک مقبول احمد کے تاثرات ملاحظہ فرمائیں:

''ذیلدار دسوندھی خان ایسے لوگوں میں سے تھے جن کی سب دل سے عزت کرتے تھے۔ وہ سخی تھے، فراخ دل تھے۔ غرباء پرور اور ہمدرد انسان تھے۔۔۔۔میرا اور ان کا سامنا سکول آتے جاتے اکثر ہو جاتا تھا۔ میں نیاز مندانہ انداز میں سائیکل سے اتر کر ان کو سلام عرض کرتا۔ ہر ملاقات پر وہ مجھ سے کوئی نئی بات کرتے اور پوچھتے۔۔۔تم کہاں سے آتے ہو؟ کہاں جاتے ہو؟ کس کی اولاد ہو؟ خیریت سے تو ہو؟ نصیحت بھی کرتے کہ سائیکل سے نہ اترا کرو بس سلام ہی کافی ہے۔''

یہ عظیم شخص ہر کام اللہ کی رضا کے لیے کرتا تھا اور نمود و نمائش سے نفرت کرتا تھا۔ اب

Marfat.com

آپ ہی بتائیں جس شخص کے سامنے انسانیت کا ایسا عمدہ نمونہ ہو بھلا وہ ایسا ہی نہ ہوگا۔ سائیکل سے اتر کر احترام وعقیدت سے خاں صاحب کو سلام کرنا ملک صاحب کی غیر معمولی سعادت مندی کی دلیل تھی اور اُن کا محبت سے خیریت دریافت کرنا اور سائیکل سے نہ اترنے کی نصیحت کرنا اندازِ پدرانہ سے کم نہ تھا۔ ایسے ہی مثالی کرداروں کی روشنی میں ملک صاحب کے اندر وہ اوصافِ حمیدہ پیدا ہو گئے جو صاحبِ دل اور ہمدرد انسان میں ہوتے ہیں۔

ان اوصاف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علی سفیان آفاقی اُن کے بارے میں کہتے ہیں'' ملک صاحب ایک منکسر المزاج، سادہ دل، خداترس اور محبت کرنے والے انسان ہیں۔'' انور سدید اُن کے اوصاف پاکیزہ پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:'' یہ کتاب پڑھ کر مجھے محسوس ہوا کہ مقبول صاحب کی زندگی بھی کسی افسانے سے کم نہیں۔ انہیں مشکلات اور حادثات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن انہوں نے صداقت، دیانت، اور امانت کے اصولوں کو قائم رکھا۔ خود محنت کی اور نتائج خدا پر چھوڑ دیئے''۔

ابوالامتیاز، ع، س مسلم ان کے کردار پر اِس طرح رقمطراز ہیں:'' بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اُن کے دستِ کرم سے بے شمار ضرورت مند ادارے اور افراد ایسی خاموشی سے فیض یاب ہوتے ہیں کہ دوسرے ہاتھ کو خبر تک نہیں ہوتی۔''

قاضی ذوالفقار احمد اُن کی سادگی اور صاف گوئی کی اس طرح تعریف کرتے ہیں:'' ملک مقبول احمد پیچیدہ شخصیت کے انسان نہیں۔ وہ سیدھے سادے، صاف گو اور اپنی شخصیت کو نمایاں نہ کرنے والے انسان ہیں''

نقشبند قمر نقوی اُن کے خلوص پر اِس طرح اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہیں:'' ملک صاحب سے میری ابتدائی گفتگو نہایت دوستانہ اور خوشگوار ماحول میں

Marfat.com

ہوئی ،ان کا نرم اندازِ گفتگو ، بے تکلفانہ برتاؤ ، نمایاں منکسر مزاجی ،اور ایسا قرینہ جس سے اعتماد کی کیفیت پیدا ہوتی ہو، سب نے مل کر مجھے یقیناً متاثر کیا''۔

اللہ ماہی اور دسوندھی خان کے علاوہ ایک اور کردار ہے جو ملک صاحب کی یادداشت کے پردہ پر اب بھی تازہ وشگفتہ ہے۔ یہ ہے گیان چند اُن کے سکول کا کلاس فیلو اور بچپن کا گہرا دوست جس کے ساتھ وہ سکول سے بھاگ کر کھیتوں کی ایک منڈیر پر بیر کے گھنے درختوں میں پناہ لیتے تھے۔ جہاں وہ اُن کے تنوں پر بیٹھ کر دوسروں کو نظر آئے بغیر خوش گپیوں میں مصروف ہوتے تھے۔ گیان چند ہندو لڑکے کی دوستی اور اس کے ساتھ ملک صاحب کا سکول سے فرار ہونے کے ماجرے کے ساتھ ہی مجھے اپنے بچپن کا دوست ایک ہندو لڑکا بلدیوراج یاد آ گیا۔ وہ بھی میرے ذہن میں ایسے ہی بسا ہوا ہے جیسے گیان چند ملک صاحب کے ہاں موجود ہے۔ بلدیوراج لالہ کوہلی کا منجھلا بیٹا تھا۔ کوہلی دی ہٹی رام نگر (راجگڑھ) لاہور میں بڑی مشہور ومعروف تھی۔ یہ کریانے کی دکان تھی۔ لالہ کوہلی کا بڑا بیٹا ڈاکٹر تھا اور اُن کی دکان کے ساتھ ہی اس کا کلینک تھا۔ یہ کلینک اور دیگر دکانیں اُن کی دو منزلہ بڑی عمارت کے نیچے آباد تھیں۔ یہ تقسیم سے پہلے کا زمانہ تھا۔ جب ہم ،ہندو مسلم سکھ عیسائی ،آپس میں سب بھائی بھائی، کے ترانے گاتے تھے اور غیر ملکی گورے سامراج سے آزادی کے لیے مل جل کر نبرد آزما تھے۔ بلدیوراج اپنی سائیکل پر بٹھا کر مجھے مال روڈ کے کنارے نہر پر لے جاتا تھا۔ یہ گرمیوں کے دن ہوتے تھے اور ہم گھنٹوں پل پر سے نہر میں چھلانگیں لگاتے ،نہاتے اور تیرتے تھے۔ میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ ملک صاحب کی آپ بیتی میں، میں اپنی ہی کہانی پڑھ رہا ہوں اپنے بچپن کی ،اپنے گاؤں کی ،اپنے ماضی کے لاہور کی۔ یہ اتنی دلچسپ کتاب ہے کہ جب مجھے موصول ہوئی تو علی الصبح میں اس کی ورق گردانی میں مصروف ہو گیا اور پتہ نہیں چلا کہ کیا وقت ہو گیا۔

Marfat.com

سلمیٰ صدیقی

8-8-07

''لا = پبلشر''

جناب مقبول احمد صاحب کی کتاب ''سفر جاری ہے'' کا مطالعہ مجھ سے کم علم کے لیے بے حد خوش گوار حیرت کا باعث بنا۔ ایک علم دوست گھرانے سے تعلق رکھنے کے باوجود حتی الامکان میں نے اپنے آپ کو علم کی دسترس سے دور رکھا۔ مطالعہ کیا بھی تو فکشن کا۔ ثقیل تحریروں سے پرہیز کیا اور سوائے بہ امر مجبوری لکھنے کی جرأت نہیں کی۔ علم کا جس قدر بھی ورود میرے ذہن میں ہوا، اس میں میری کسی شعوری کوشش کا کوئی دخل نہیں لہٰذا علم کے ہر میدان میں Blank spots سے واسطہ پڑتا ہے۔ کم علمی کا یہی تجربہ چونکانے کا باعث بنا رہتا ہے۔ اس لئے پبلشر اور پبلشنگ کے بارے میں میرے تصورات کی کجی کوئی حیرت کی بات نہیں۔

میرے خیال کے مطابق پبلشر وہ شخص تھا، جو مُصنف کا خون چوس کر اپنے لئے آرام مہیا کرتا ہے اور ادیب کو جائز معاوضہ کے لیے ہزار چکر لگوا کر خوار کرتا ہے۔ اس تصور میں دراڑ تو پڑ چکی تھی۔ لیکن ''سفر جاری ہے'' پڑھ کر پہلی بار احساس ہوا کہ اس سفر کے دوران جو مقبول صاحب نے کیا اس طرح کے مقامات آتے ہیں۔ یہ مقبول صاحب کی وسعت قلب ونظر ہے کہ وہ ان مقامات کے ذکر کے دوران مثبت پہلو نمایاں رکھتے ہیں۔ نتیجتاً پڑھنے والا ان کے ساتھ کامیابیوں کی مسرت تو share کرتا ہے لیکن مصائب کی اذیت کا ادراک نہیں کر پاتا۔ مصائب ان کے ہاں تجربات کی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ البتہ اگر ذرا توقف کر کے imagination کو زحمت پرواز دی جائے تو سانس کہیں

Marfat.com

کہیں رکتی ہے۔ دل ڈولتا ہے۔ آنکھوں میں چبھن محسوس ہوتی ہے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ مُصنّف خود ہی قاری کو ہر تکلیف سے محفوظ رکھنے پر مصر ہے۔

اعلیٰ معیار کی تصنیفات چھاپنے کے ارادے کے بعد ان کی تلاش میں رئیس احمد جعفری صاحب سے ملاقات، ان کے ناولوں کی اشاعت اور مقبولیت، بطور پبلشر مقبول صاحب کی کامیابی، اس کے بعد آزادیٔ ہند کی طباعت اور اس کے مثبت اثرات کا ذکر اتنے خوش گوار انداز میں ہوا ہے کہ پڑھنے والا ان کی کامرانیوں کے شعور سے مسرور ہو جاتا ہے۔ مشقت، مالی افتاد اور جراحت دل و دماغ پس منظر میں رہ جاتے ہیں۔ مشکلات ان کے ہاں بڑی آسانی سے حل ہو جاتی ہیں۔ وہ قاری کو اپنے درد کا ہمراز کم بناتے ہیں۔ البتہ پڑھنے والے کو اس غلط فہمی میں مبتلا رکھتے ہیں کہ انہوں نے حالِ دل من وعن بیان کر دیا ہے۔

اپنے والد کا عمر بھر کا پس انداز کیا سرمایہ تجربات کی بھینٹ کرنے کے بعد محض ہمت کے سہارے آگے بڑھنا۔ دو پہاڑوں کے درمیان بے پل کا دریا۔۔ ڈوبنے اُبھرنے کے کتنے مراحل معلوم نہیں اپنوں نے اپنے پیاروں کے ساتھ share کیے یا نہیں بھی محفوظ رکھا۔

چاچا منگا کا ذکر انہوں نے شروع کے صفحات کی پانچ سطروں میں کیا ہے اور ایک زندہ رہنے والا کردار تخلیق کر دیا۔ ایسے تجربے دل کو بڑا کرتے ہیں۔ ان کا بظاہر سادہ سا بیان گہری جذباتی روداد کا عکاس ہے۔ زندگی میں جب جب بھی نقصان پہنچانے والے کو مقبول صاحب نے محبت سے سینے سے لگایا ہوگا تو کون جانے اس میں چاچا منگا کا کس قدر ہاتھ تھا۔

لائبریریوں تک رسائی کے سلسلے میں نظامی صاحب کو اپنا محسن سمجھنا لیکن اپنا کاروباری حق محفوظ رکھنا ان ground realities کی جھلک ہے، جن سے گزرنا پلِ صراط سے گزرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ مقبول صاحب کا ضمیر مطمئن ہے۔ خدا ان کی نیک نیتی

Marfat.com

قبول کرے۔

سکولوں میں سامان کی فراہمی، ٹینڈر حاصل کرنا، لائبریریوں میں کتابوں کو کھپانے کے حوالے سے تجربات، مشاہدات اور مسائل کا ذکر انہوں نے بڑےright انداز میں کیا ہے حالانکہ یہ وہ حالات ہیں کہ ادیب کو درپیش ہوں تو شاید لکھنے سے توبہ کر لے۔ شعیب بن عزیز صاحب کا ایک جملہ یعنی کتابی منڈی میں ناشرین کی کامیابی کے راز معلوم کرنا اور ان پر شبانہ روز عمل کرنا دراصل ان کی زندگی کی داستان ہے، جس کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی اقدار کا دامن تھامے رکھا ورنہ خالی کامیابی تو کوئی بڑی بات نہیں۔ وہ بجا طور پر اپنے سکھی اور خوشحال گھرانے پر فخر کرتے ہیں۔ یہ کہنا ان کی انکساری ہے کہ ایک معمولی تعلیم کے بندے کو اللہ تعالیٰ نے کتابوں کے کاروبار میں سرفراز فرمایا۔ دراصل انہوں نے کتاب سے محبت کی اور علم کی خدمت۔ وہ کہتے ہیں کہ ماں کی دعاؤں سے انہیں اسی طرح تسلی ہو جاتی تھی، جس طرح بچپن میں سائیکل پر سوار ہو کر علامہ اقبال کی نظمیں گانے سے ہوتی تھی۔ ایسا شخص علم کی خدمت نہ کرتا تو اور کیا کرتا۔ البتہ ان سے جو کام زندگی کو لینا تھا اس کا انتخاب زندگی نے خود کیا۔ ان کی زندگی کا مرکز نہ شہرت ہے نہ روپیہ اپنوں کی خوشحالی اور محبت ان کے دل کی دولت ہے۔

لاہور کو انہوں نے زندگی کا مخزن سمجھا۔ وہ کہتے ہیں ''زندہ دلوں کے شہر لاہور میں آتے ہی میری غیر رسمی تعلیم کا ایک لمبا دور شروع ہو چکا تھا۔ اب ہر نیا دن میرے سامنے نیا چیلنج پیش کرتا اور میں اس کو حل کرنے میں تن من سے مصروف ہو جاتا۔'' لاہور کی richness سے تکسیب کا ذکر اس انداز میں کرنا ان کی پوری شخصیت کی تصویر کھینچ دیتا ہے۔ ایک بے حد کھلے دل و دماغ کا سادہ مزاج، محبت کرنے والا اور زندگی کی ہر آزمائش سے خوشبو اور رنگ کشید کرنے والا شخص ایک سچا مسلمان!

Marfat.com

سید قاسم محمود

منشی نول کشور سے ملک مقبول احمد تک

راہِ حق کا سالک ہی اتنی بڑی بات لکھ سکتا ہے کہ ''سفر جاری ہے'' اور راہِ حق صرف تصوّف کی صاف شفاف گلیوں ہی میں سے ہوکر نہیں گزرتی، کتابی دنیا کی ٹیڑھی میڑھی، میلی کچیلی گلیوں میں سے بھی ہوکر گزرتی ہے۔ سفر کے نامکمل ہونے کا احساس اور منزلِ مقصود تک پہنچنے کا عزم سالک ہی نہیں، ناشر بھی کرتا ہے، اور ناشر بھی سالک ہی ہوتا ہے۔

ملک مقبول احمد کی خودنوشت کے بارے میں ہم عصر دانش وروں نے اپنی رایوں اور اپنے تاثرات میں ملک صاحب کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ ڈاکٹر صفدر محمود، علی سفیان آفاقی، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر طارق عزیز، اے حمید، شعیب بن عزیز، طارق اسماعیل ساگر، سید واجد رضوی، ابوالامتیاز ع س مسلم، قاضی ذوالفقار احمد، قمر نقوی اور ڈاکٹر اللہ بخش ملک جیسے مشاہیرِ وقت نے ملک صاحب کی سادہ و نیک شخصیت، اُن کی بے لوث خدمات، اُن کے سادہ و پُرکار اسلوبِ نگارش کو جن مخلصانہ تاثرات و بیانات سے نوازا ہے، اُن میں راقم بھی شریک ہے۔ میرا بھی رشتہ اُن سے اُسی وقت سے قائم ہے، جب ''مقبول اکیڈمی'' نے شاہ عالمی کے ایک فلیٹ سے منفرد کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ مولانا ابو الکلام آزاد کی

Marfat.com

''آزادیٔ ہند''، تمدنِ ہند، ''تمدن عرب''، سیرت ابن ہشام، اور ''عبرت نامہ اُندلس'' کے پہلے ایڈیشن کی پہلی پہلی کاپیاں اب تک میرے کتب خانے میں موجود ہیں، جو اُسی فلیٹ سے ملک صاحب ہی کے بدست خریدی گئی تھیں، بلکہ ''تمدنِ عرب'' تو ملک صاحب نے ہدیۃً عطا کی تھی۔

لیکن میں ''سفر جاری ہے'' کو ایک اور ہی زاویے سے دیکھتا ہوں۔ ہمیشہ سے میری یہ آرزو رہی ہے کہ جس طرح ادب کے مؤرخین اردو ادب کی تاریخ مرتب کرتے ہیں اور شاعروں اور نثر نگاروں کی خدمات کا عہد بہ عہد محاکمہ کرتے ہیں، اسی طرح ان عظیم شاہکاروں کو زیورِ طبع سے آراستہ پیراستہ کر کے آئندہ نسلوں کے لیے بھی محفوظ کرنے والے ناشرین اور اُن کی فنی خدمات کی بھی تاریخ لکھی جائے۔ خلوت میں تخلیق کرنے والوں اور اُن کی تخلیقات کی سپاس گزاری کے ساتھ ساتھ، یقیناً اُن ناشرین کی جدو جہد کو بھی تسلیم کیا جانا چاہیے، جو جلوت میں ہر طرح کی مالی و انتظامی کٹھناؤں کے ساتھ یہ شاہ پارے پڑھنے والوں کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ عام طور پر ناشرین کو ''کاروباری'' سمجھ کر نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ چلیے کاروباری سہی، لیکن وہ لوگ نہ ہوتے تو کہاں کا غالب اور اقبال، پریم چند اور رتن ناتھ سرشار، منٹو اور انتظار حسین، یہ سب کہاں ہوتے۔ ان کا وجود و قیام ظاہر ہے کہ ناشرین کے دَم قدم سے ہے۔

چنانچہ راقم ''تاریخ اشاعتِ اردو'' کا عزم کیے ہوئے تھا کہ 1966ء میں ماہنامہ کتاب کی زمامِ ادارت میرے سپرد ہوئی۔ میں نے اس جریدے میں پہلی ترجیح کے طور پر اشاعتی اداروں کے بانی ناشرین کے انٹرویوز کا سلسلہ شروع کیا، جس میں خاص طور پر یہ سوالات پیش نظر ہوتے تھے:

ناشر بننے کا خیال کیوں آیا؟ کیسی کتابیں چھاپنے کا ارادہ کیا تھا؟ کیا

Marfat.com

مشکلات پیش آئیں؟ کیا کیا خدمات سرانجام دیں جو دوسرے ناشرین سے مختلف و منفرد ہیں؟ کیا کھویا، کیا پایا؟ لاہور کے تمام شیوخ یعنی شیخ غلام علی، شیخ برکت علی، شیخ محمد اشرف، شیخ مبارک علی، شیخ عبدالسلام، تمام چودھری حضرات مثلاً چودھری برکت علی، چودھری نذیر احمد (نیا ادارہ)، چودھری بشیر احمد و چودھری رشید احمد (مکتبہ جدید)، چودھری عبدالحمید (مکتبہ کارواں) تمام ملک حضرت مثلاً ملک دین محمد، ملک سراج دین، ملک مبارک علی (گوشۂ ادب) فیروز سنز کے چیئر مین ڈاکٹر اے وحید، قدیم ادارے ''دار الاشاعت پنجاب'' کے بارے میں سیّد امتیاز علی تاج سے انٹرویو، منشی نول کشور اور منشی محبوب الٰہی کی اشاعتی خدمات پر خصوصی مضامین، پھر کراچی کے ناشرین کے انٹرویو، مثلاً آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے جنرل سیکرٹری سیّد الطاف علی بریلوی، اُردو اکیڈمی سندھ (علاؤ الدین خالد)، نفیس اکیڈمی (چودھری سلیم گاہندری)، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ دہلی کے بارے میں اُس کے سابق جنرل منیجر حامد علی خان سے انٹرویو، عصمت بک ڈپو، دہلی کے ضمن میں مولانا رازق الخیری اور صادق الخیری سے انٹرویو، قدیمی ادارے مکتبہ اسحاقیہ، جُونا مارکیٹ اور کارخانہ تجارت کتب نور محمد کے مالکان سے ملاقاتیں، اور میں بھول نہ جاؤں لاہور کے ''ویسٹ پاک پبلشنگ کمپنی'' کے سیّد برادران سے انٹرویوز، جو 1947ء تک ''نیو انڈیا پبلشنگ کمپنی'' کے نام سے رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اور عطر چند کپور اینڈ سنز جیسے بڑے ہندو ناشران کا مقابلہ کرتا رہا، حتیٰ کہ بعض متعصب ناشرین نے اُن کے پورے دفتر کو آگ لگا دی، جس کی راکھ سے ''ویسٹ پاک پبلشنگ کمپنی'' پیدا ہوئی۔

اِن قدیمی اداروں کے ناشرین سے انٹرویوز اِسی مقصد سے کیے گئے تھے کہ بعد ازاں اُس مؤرخ و محقق کے کام آئیں گے جو برِّاعظم میں چھاپہ خانہ کے قیام 1801ء سے لے کر تا حال، دو صدیوں کی ہماری اشاعتی تاریخ مرتب کرنے

Marfat.com

نکلے گا۔ اِس نظر سے دیکھیے تو ملک مقبول احمد کی یہ خودنوشت مجوزہ یا متخیلہ تاریخ کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے، خصوصاً قیامِ پاکستان کے بعد کتب کی اشاعت اور تقسیم وفروخت کا منظر دکھانے کے لیے یہ کتاب مستقبل کے مؤرخ کے لیے ایک مفید اور کارآمد ماخذ کی حیثیت رکھے گی۔

میری رائے میں یہی اِس کتاب کی اوّلین خصوصیت ہے کہ یہ مستقبل میں کام آنے والی کتاب ہے۔ یہ بات کہ ادیب کی تخلیق یا مُصنّف کے کارنامے کو شائع کرکے، اُسے قارئین کے دروازے تک پہنچانے میں ناشر کو کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں اور مشکلات ومصائب کے کیسے کیسے پہاڑ عبور کرنے پڑتے ہیں، ملک مقبول احمد کی ذات تک محدود نہیں ہے۔ اوپر میں نے جن ناشرین کے نام درج کیے ہیں، اُن کے انٹرویوز میں مصائب کو صبر وسکون سے جھیلنا قدرے مشترک ہے۔ ہر شخص نے محض کتاب دوستی کے نصب العین کے تحت معمولی رقم سے تجارت شروع کی اور اپنے معاصر مصنفین کی، یا پچھلے ادوار کی کلاسیکی کتابیں شائع کرکے اُن کو محفوظ کیا۔ اگر ملک مقبول احمد کے پاس ''تمدنِ عرب'' کا کاغذ خریدنے کے لیے پیسے نہیں تھے اور وہ اپنے ہر رشتہ دار کے پاس ہاتھ پھیلائے پہنچے اور بالآخر کام آئے تو ملک اللہ داد، اس طرح کے واقعات ہر ناشر کو پیش آتے ہیں۔ یہ کوئی انوکھا واقعہ نہیں ہے۔ اس لحاظ سے بھی یہ کتاب ''سفر جاری ہے'' ہمارے پورے اشاعتی اثاثے کا حصّہ ہے، اور مجموعی طور پر ناشرین کو جن دقتوں اور مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اُن کی تصدیق کرنے والی ہے۔

ناشرین کی آپ بیتیاں اور بھی بہت سی ہوں گی۔ کھوج لگانے کی ضرورت ہے۔ میں نے اب تک تین آپ بیتیاں پڑھی ہیں۔ فیروز سنز کے بانی مولوی فیروز دین کی ''جہادِ زندگی'' جس میں قیام پاکستان سے پہلے کے اشاعتی حالات کی جھلکیاں

Marfat.com

موجود ہیں ۔ دوسری ''ویلکم بک پورٹ'' کے ڈائریکٹر قیصر زیدی صاحب کی آپ بیتی ''   ''۔ یہ اگرچہ زیادہ تر ایک کتاب فروش کی آپ بیتی ہے، لیکن چونکہ کتاب فروشی اشاعتِ کتاب کی چھوٹی بہن ہے، لہٰذا اِس آپ بیتی میں اشاعتی دنیا کے کافی حوالے موجود ہیں ۔ تیسری، یہ ملک مقبول احمد کی ''سفر جاری ہے'' یہ اِس لحاظ سے دوسریوں سے زیادہ اہم ہے کہ یہ خالص ایک ناشر کی خودنوشت ہے اور ملک صاحب نے ناشر ہی کی آنکھ سے حالات کو دیکھا پرکھا اور چشم دید واقعات کو ناشر ہی کے قلم سے لکھا ہے۔

''سفر جاری ہے'' کا عنوان بتا رہا ہے کہ ملک صاحب کو سفر کے نامکمل ہونے کا احساس ہے۔ اکثر ادارے ہمارے ہاں اپنے بانی کی وفات کے ساتھ ہی انتقال فرما جاتے ہیں۔ ہمارے اداروں میں ''ون مین شو'' کا مظاہرہ زیادہ ہوتا ہے اور جمہوریت کی طرح دوسری اور تیسری صف بندی نہیں کی جاتی۔ جو ادارے نسل ''بعد نسلاً قائم رہتے ہیں، (جیسے فیروز سنز)، اُن کی طول عمری کی وجہ جمہوریت اور مستقبل کی صف بندی ہے۔ ملک مقبول احمد کے دل و دماغ پر اپنی رُوحانی اولاد ''مقبول اکیڈمی'' کی دوامی زندگی کا خیال طاری رہنے لگا ہے۔ انھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ بیٹوں اور داماد نے ''مقبول اکیڈمی'' اور اِس کے دوسرے شعبوں اور یونٹوں کو کامیابی اور استقامت سے سنبھال لیا ہے، پھر بھی وہ سوچتے ہیں کہ آگے کیا ہوگا۔ قدرتاً اُن کی نظر پوتوں پوتیوں اور نواسوں، نواسیوں پر جا کر ٹکتی ہے۔ چنانچہ اس کتاب کا دوصفحاتی ''پیش لفظ'' اپنی تیسری نسل کے انھی ننھے منے افراد کے محبت بھرے ذکر پر استوار ہے، لکھتے ہیں: ''دادا کو پوتا اپنے بیٹے سے پیارا ہوتا ہے''

''میرا پوتا بابر مقبول میرا بہت اچھا دوست ہے۔ خُدا اُسے خوش رکھے، وہ میری زندگی سے خاصی دلچسپی رکھتا ہے۔ وہ کتابوں کے کاروبار سے بھی متاثر ہے اور

Marfat.com

پوچھتا ہے کہ میں نے کتابیں شائع کرنے کا کام کب شروع کیا؟ یہ کام کرنے کا خیال میرے ذہن میں کیسے آیا؟ ''چودھویں صدی'' کے نام سے میگزین نکالنے کا خیال کس طرح آیا؟''

سو یہ کتاب ''سفر جاری ہے'' ملک مقبول احمد نے اس لیے لکھی ہے کہ بابر مقبول جلد بڑا ہو اور اپنے دادا کی آپ بیتی کی روشنی میں ''مقبول اکیڈمی'' کا نام چہار دانگ عالم میں مشہور کرے اور صدقے میں باپ دادا کا نام بھی۔ یہ ہے، زیرِ نظر کتاب لکھنے کا اصل مقصد، یعنی زمانے کا استمرار، ''مقبول اکیڈمی'' کا دوام ۔۔ اگر ہمیں اپنے ایک دوست کی لکھی ہوئی اچھی اور دلچسپ کتاب پڑھنے کو ملی اور یہ کتاب چھپ کر کتابوں کی اشاعتی تاریخ کا ایک حصہ بن گئی تو یہ اس کے ذیلی فوائد ہیں۔ اصل مقصد جو ملک صاحب نے اپنے دل کی تہوں میں چھپا کر رکھا ہے، وہی ہے کہ بابر مقبول اور اُس کے بھائی بہن ''مقبول اکیڈمی'' کی راسیں سنبھالنے کی تیاری کریں۔

ماہنامہ شاہکار میگزین

جون، جولائی 2007ء

Marfat.com

ڈاکٹر غفور شاہ قاسم

شوق برہنہ پا چلتا تھا اور رستے پتھریلے تھے

ساری زندگی کتاب نوردی میں گزری، ناول، سفرنامہ اور خودنوشت کا مطالعہ بالخصوص پہلی ترجیح رہا۔ خودنوشتوں میں ادا جعفری کی ''رہی سو بے خبری رہی'' اور احسان دانش کی ''جہانِ دانش'' کا سحر ابھی تک ذہن پر طاری ہے۔ اسی دوران انتہائی قابلِ احترام ڈاکٹر انور سدید کے توسط سے ملک مقبول احمد کی خودنوشت سوانح ''سفر جاری ہے'' موصول ہوئی۔ اس کا مطالعہ شروع کیا تو تحریر کے طلسم نے ایسا اسیر کیا کہ ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ کسی بھی ادب پارے کا حُسن روح کو مَس کر جائے تو مدتوں سرشار رہتا ہوں۔ ملک مقبول احمد کی خودنوشت ''سفر جاری ہے'' اسی قبیل کی کتاب ہے، جس کی حلاوت مدتوں محسوس ہوتی رہے گی۔

انور سدید صاحب نے بجا طور پر اس کتاب کو انوکھی کتاب قرار دیا ہے۔ میرا احساس یہ ہے کہ صفحۂ قرطاس پر نوکِ قلم کے پہلے لمس کے ساتھ ہی ملک صاحب کی یادداشت کی لائبریری کُھلتی چلی گئی ہے۔ ماضی کی راہداریوں میں سفر کرتے ہوئے بیتی زندگی کے بے شمار تلخ و شیریں واقعات کو وہ بے ساختہ فطری اُسلوب میں رقم کرتے چلے گئے ہیں۔ کوئی تصنع نہیں کوئی تکلف نہیں، کوئی بناوٹ نہیں۔

Marfat.com

رواں دواں دلآویز اُسلوبِ نگارش۔ یہ خودنوشت تحریر کرتے ہوئے ملک صاحب نے اپنے اندر مستور قلم کار کو Explore کر لیا ہے اور میرے نزدیک یہ سب سے اہم بات ہے۔

لکھنے کا جواز یہ ہے کہ قلم کار لکھے اور اس پر اپنے نام، اپنی شخصیت اور اپنے منفرد اُسلوب کی مہر ثبت کردے۔ ملک صاحب نے اپنے ہی اُسلوب میں لکھا ہے۔ صاحبِ اُسلوب کی پہچان یہی ہے کہ وہ کسی اور کی طرح نہیں، اپنی طرح لکھتا ہے۔ ملک مقبول احمد کے اندازِ تحریر میں نہ تو انشاء پردازی ہے نہ ہی افسانہ طرازی، نہ عبارت آرائی ہے اور نہ ہی مرصّع کاری۔ اُن کی تحریر بے رنگ، بے رس لفاظی کا انبار نہیں ہے۔ اُن کا اُسلوبِ تحریر ریشمی، طلسماتی، سادہ اور پُرکار ہے۔

خودنوشت کچھ بتانے اور کچھ چھپانے کچھ اِخفا اور کچھ افشا کا فن ہے مگر ملک صاحب نے اِخفائے حقائق پر افشائے حقائق کو فوقیت دی ہے۔ تحریر کی یہی سچائی اس کی توانائی اور رعنائی ہے۔ اُردو کی خودنوشتوں میں یہ اعزاز اور انفرادیت صرف ''جہانِ دانش'' کو حاصل ہے۔

ملک مقبول احمد کی عمرِ رفتہ کے رنگوں کی دھنک ''سفر جاری ہے'' اپنی کائنات خود تخلیق کرنے والے، کشادہ ظرف، صداقت شعار، اپنے متعین مقاصد میں یک سُو، یقینِ کامل کے حامل ایک شائستہ شستہ اور مستقل مزاج شخص کی عمل انگیز داستانِ حیات ہے۔

اُن کا تمام ترسفرِ حیات خارزاروں کی نامہربان مسافتوں اور ربِ کریم کی بے پایاں عنایتوں کا ماحصل ہے۔ 76 برس سے متجاوز جدوجہد کرنے والے اس شخص کی کہانی اختر عثمان کے اس شعر کے پیکر میں ڈھلتی چلی جا رہی ہے۔

ہر نیا رنگ نیا روپ دکھاتی ہے مجھے
زندگی جیسے مکمل کیے جاتی ہے مجھے

Marfat.com

زندگی کے تمام موسموں کے ذائقہ آشنا، سردوگرم چشیدہ ملک مقبول احمد کی روداد زیست دلکشا ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ اور سبق آموز بھی ہے۔ اپنی خودنوشت میں انہوں نے نہایت موزوں اور مختصر ذیلی عنوانات کے تحت اپنی زندگی کے متنوع تجربات کو مربوط انداز میں بیان کر دیا ہے۔ سراپا سپاس گزار انسان کا اعترافِ حقیقت ملاحظہ فرمائیے۔

''مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی شرم، کوئی جھجک اور کوئی رکاوٹ نہیں ہے کہ میں تعلیمی سرٹیفکیٹوں، ڈگریوں اور دستاویزی حوالوں سے انتہائی کم علم ہوں لیکن پھولوں کے درمیان رہ کر خوشبو دار ہو جانے والی مٹی کی طرح میں بھی ادبا، شعرا، مُصنّفین، مترجمین، معلمین، محققین اور عالی ظرف انسانوں اور کتابوں کے داخلی جمال سے فیض یاب ہوا اور خود بھی ایک کتاب بن کر رہ گیا۔ تقریباً پچاس سال سے میرا اٹھنا، بیٹھنا اور سونا کتابوں کے ساتھ ہے۔ پبلشرز، پرنٹرز اور بک سیلروں کی دوستی اور کتابوں کی ہمہ وقت رفاقت مجھے میسر ہے۔ میں نے ان سب کا رنگ قبول کیا ہے۔ میرے دوستوں اور میرے بچوں نے مجھے ذہنی طور پر اُکسایا اور میں اپنی یہ روداد لکھنے پر آمادہ ہو گیا۔ میں نے راتوں کے سناٹوں میں اپنے دل کی باتیں سُنیں اور اپنے ذہن پر سوچوں کا بوجھ ڈال کر یہ کہانی دیانت اور صداقت کے گہرے محسوسات کی روشنی میں لکھی ہے۔''

کتاب کی اشاعت وطباعت سے وابستہ ایسے شخص کی خودنوشت سوانح، قرطاس وقلم کی دنیا کا نیا تجربہ ہے۔

کتاب سے طویل رفاقت نے ایک مستند پبلشر کو اب ایک معتبر قلم کار بنا دیا ہے۔ یقیناً

Marfat.com

یہ کتاب دوستی کا اعجاز ہے۔

ایک معلّم سے لے کر ایک اعلیٰ پائے کے منتظم تک، نکاحِ اول کی نادانی سے نکاحِ ثانی کی شوقِ سامانی تک کہانی کے مختلف موڑ نہایت دلچسپ ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ موسمِ سرما کی چاندنی اور جدوجہد کے دن بیت جائیں تو ان کی یادیں خوش رنگ ہو جاتی ہیں اور آنے والے دنوں کا قیمتی سرمایہ بن جاتی ہیں۔

ملک مقبول احمد نہایت معصومیت سے اپنے لڑکپن کی محبتوں کا احوال اس طرح بیان کرتے چلے جاتے ہیں کہ ہر پڑھنے والے کو ان محبتوں میں اپنی محبتوں کی بازگشت سُنائی دینے لگتی ہے۔ کتاب کے یہ صفحات دورِ شباب کی محبتوں سے معطر ہیں۔ صرف ایک اقتباس دیکھیے۔

> ''بابا خیرو کی لڑکی شمی مجھے اچھی لگتی تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ وہ میری آنکھوں کے سامنے رہے۔ آنے بہانے اُس کو دیکھنے کی خاطر اس کے گھر کے قریب سے گزرتا اور وہ مجھے نظر آ ہی جاتی۔ ایسے لگتا جیسے وہ بھی مجھے دیکھنا پسند کرتی ہے۔''
>
> ہمارے گھر کی کھوئی سے پانی لینے کے لیے آنے والی دو سگی بہنوں کے بارے میں بھی میرے احساسات کچھ اس قسم کے ہی تھے۔ وہ بھی مجھے بہت اچھی لگتی تھیں۔ ایک کا نام شہناز تھا۔ جو بہت خوبصورت تھی۔ دوسری بہن شمشاد اگرچہ اتنی خوبصورت نہ تھی لیکن اس میں ایک خاص نوعیت کی بڑے غضب کی کشش تھی۔
>
> یہ اعتراف کرنا کوئی غیر معمولی بات نہ ہوگی کہ میرا مزاج لڑکپن سے ہی عاشقانہ تھا۔ میں ہر خوبصورت لڑکی کو دل دے بیٹھتا۔''

ان سطور میں ایک جمال پسند حقیقت نگار قلم کار کی جھلک واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔

Marfat.com

محبت کی یہی لطیف کیفیات ہمیں جہانِ دانش میں بھی فطری انداز میں نظر آتی ہیں۔

مختلف ابواب میں برمحل اشعار کا استعمال ملک صاحب کے اعلیٰ ادبی ذوق کا آئینہ دار ہے۔ ماں اپنی اولاد کی رگوں، ریشوں اور بافتوں میں رچی بسی ہوتی ہے۔ ماں کا اپنی اولاد سے تعلق شریانوں میں بہنے والے خون کی طرح ہوتا ہے۔ جس کے بغیر زندگی کا تصور بھی محال ہے۔ ماں کا وجود اولاد کی نس نس میں مہکار دیتا ہے۔ صاحبِ تحریر کے وجود میں اپنی بے جی کی مہک کس قدر سرایت کیے ہوئے ہے۔ یہ سطور دیکھیے۔

''میری یہ مستقل عادت تھی کہ میں جب بھی گھر آتا تو سونے سے پہلے ماں کے پاؤں کو ضرور دباتا۔ ماں مجھے دعائیں دیتی رہتی۔''

ماں سے مستقل جدائی کو گداز میں گندھے لفظوں میں انہوں نے اس طرح بیان کیا ہے۔

''مجھے یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ ماں مجھے اکیلا چھوڑ جائے گی لیکن وہ اپنے اکلوتے لاڈلے بیٹے کے ساتھ میری اکلوتی بہن مختار کو بھی چھوڑ کر سات فروری 1979ء کو اللہ کو پیاری ہوگئی۔ اُن کے چلے جانے کا صدمہ اس قدر شدید تھا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ کئی سال تک میں روتا رہا۔ بعد میں جب کبھی اُن کا ذکر ہوتا تو میں اپنے آنسو نہ روک سکتا۔''

یوں محبتوں شفقتوں اور دعاؤں کا بابِ فضیلت بند ہوگیا۔ جسم کو آسودگی بخش لمس بخشنے والے ہاتھ رزقِ خاک بن گئے مگر اپنے تابع فرمان بیٹے کے لیے ایسی مستجاب دعائیں دان کر گئے کہ آج ایک زمانہ اس کو سلام کرتا اور اُس کا احترام کرتا ہے۔

Marfat.com

آج ملک مقبول احمد جس وسیع روز افزوں، ترقی کرتی اشاعتی طباعتی ایمپائر کے تاجدار ہیں، یہ سب ماں کی دعاؤں کا انعام ہے۔

کتاب میں درج حیران کُن اور تجسس انگیز واقعات قاری کی توجہ کسی دوسری جانب نہیں ہونے دیتے۔ مثلاً داتا بابا کستوری، ہاکس بے کے نظارے، بغیر ٹکٹ سفر، حالات کی ستم ظریفی، ایسے ناقابل فراموش واقعات ہیں، جو قاری کے حافظے میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتے ہیں۔

فرائض منصبی اور خواہشِ قلبی کے مابین فرق و امتیاز باقی نہ رہے تو اسے خوش بختی کہتے ہیں۔

ملک مقبول احمد کا اپنی اشاعتی طباعتی زندگی میں جن قابل احترام قلم کاروں سے تعلقِ خاطر رہا، اُن میں چند ممتاز اُدبا کا ذکر بھی کتاب میں شامل ہے۔ میرے نزدیک یہ اُن کی عظمت کی دلیل ہے۔ ''وکھری ٹائپ کے لوگ'' کے زیرِ عنوان انہوں نے ایسے لوگوں کا ذکر کیا ہے، جنہیں آپ کم سے کم الفاظ میں ناپسندیدہ قرار دے سکتے ہیں۔ یہ اُن کی شرافتِ نفسی اور وضع داری ہے کہ اُنہوں نے ان حضرات کا تذکرہ صیغہ تعمیم میں کرتے ہوئے یہ وضاحت کرنا ضروری سمجھا ہے کہ

> ''کچھ وکھری ٹائپ کے قلم کاروں کے کارنامے یاد کرکے مُجھے
> دُکھ بھی ہوتا ہے۔ میں اللہ سے دُعا کرتا ہوں کہ ان کو ہدایت دے
> میں اس قسم کے چند لوگوں کا ذکر ان کے نام لیے بغیر کر رہا ہوں
> کیونکہ یہ میرے طباعتی تجربے کا حصہ ہے، اگرچہ افسوس ناک ہے۔''

ملک صاحب کی یہ ادا مجھے ذاتی طور پر بہت لبھائی ہے۔ نیک نہاد اور شریف الطبع لوگوں کا ردّیہ ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ ملک مقبول احمد کے دو انٹرویوز بھی کتاب کا حصہ ہیں۔ انہوں نے ان انٹرویوز میں ایک پبلشر کے ذاتی تجربات بیان کیے ہیں۔ یہ

Marfat.com

انٹرویوز نہایت معلومات افزا اور بصیرت افروز ہیں۔ اُن کے ادارے کی چھپی جن کُتب پر مشاہیر نے اپنے تاثراتی مکاتیب تحریر کیے ہیں۔ اُن کی عکسی نقول بھی اس خودنوشت میں شامل کی گئی ہیں۔ مقبول اکیڈمی کی مطبوعہ کتب پر چھپنے والے کالم اور چند تبصرے بھی قابلِ مطالعہ ہیں۔ اکیڈمی کے طباعتی معیار پر نہایت گراں قدر آراء ان کالموں اور تبصروں کا موضوع بنتا رہا ہے۔ ملک صاحب اپنے اشاعتی کام کے حوالے سے اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

> ''داخلی فرحت کے لیے مجھے خاص نوع کی سرشاری کی تمنا تھی۔ اشاعتی کاروبار میں میری شائع کردہ ہر کتاب میرے لیے سرشاری ہی کی کیفیت پیدا کرتی اور دنیا مجھے حسین خوبصورت اور پیاری نظر آتی۔۔۔ زندگی کے اس مقام پر میں خوشی محسوس کرتا ہوں کہ میں نے کتابیں شائع کیں، علم کو فروغ دیا اور جہالت کو دُور کرنے کی مقدور کے مطابق کوشش کی۔''

آپ ایک خوش قسمت انسان ہیں کہ آپ کا تعلق حرفِ مطبوعہ سے استوار ہے۔ یہی بات آپ کے لیے باعثِ افتخار ہے۔ اس خودنوشت کے مطالعے سے قاری کے ذہن میں ایک ایسے پبلشر کا تصوّر ابھرتا ہے، جو عمومی تصوّرات سے قطعی مختلف ہے۔ ہمارا کوئی پبلشر بھی بلاخوفِ تردید اس امر کا ادعا نہیں کرسکتا کہ

> ''میں نے جب سے کتابوں کا کاروبار شروع کیا ہے، تب سے لے کر آج تک کسی ادیب یا مُصنّف سے معاہدہ شکنی نہیں کی۔ بعض اوقات غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں لیکن اکثر ان کی بنیاد بغض اور کینہ پر ہوتی ہے یا کسی حاسد نے اس کی آبیاری کی ہوتی ہے۔''

اختتامی سطور میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ ملک مقبول احمد نے ذہن کے صحن میں بکھری

Marfat.com

طویل اور مختصر یادداشتیں ماضی کی گہر آلود دنیا سے کشید کر کے نہایت صحت کے ساتھ صفحۂ قرطاس کو تفویض کر دی ہیں۔ خیال، حافظے اور قلم کی یہ سنگت ''سفر جاری ہے'' کی صورت متشکل ہو گئی ہے۔

زندگی صبح و شام کے پیمانے سے نہیں ماپی جاتی اور اس کا مرتبہ و مقام سانسوں کے طول و عرض سے بھی متعین نہیں ہوتا۔ کام اور کارگزاری ہی حاصل حیات ہوا کرتی ہے۔ کام اور کارگزاری ہی ملک مقبول احمد کا شخصی امتیاز اور اختصاص ہے۔

سیالکوٹ کے قصبہ دیوال سے لاہور میں منتقل ہو جانے اور مقبول اکیڈمی جیسے قابل فخر پبلشنگ ادارے کے قیام تک ایک خود ساز شخص کی یہ داستانِ حیات جدوجہد کرنے والے ہر فرد کو اپنی کہانی محسوس ہوتی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے جواں مرگ غلام محمد قاصر نے یہ شعر ملک مقبول احمد جیسے افراد کے بارے کہا تھا۔

شوق برہنہ پا چلتا تھا اور رستے پتھریلے تھے
گھستے گھستے گھس گئے آخر کنکر جو نوکیلے تھے

Marfat.com

پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ

سفر جاری ہے

''سفر جاری ہے'' کسی سفرنامے کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک ایسے شخص کی زندگی کے سفر کی کہانی ہے جو نہ ادیب ہے، نہ محقق، اور نہ دانشور۔ وہ کوئی سماجی مصلح بھی نہیں اور نہ ہی اس کا کوئی سیاسی رتبہ ہے، لیکن وہ ہمارے عہد کی ایک ایسی شخصیت ہے جس کے قدم کامیابی نے چومے اور جس نے محض اپنی محنت، لگن اور عزم و استقلال سے قابلِ رشک سربلندی و سرخروئی حاصل کی۔ ایسی شخصیت کا نام ملک مقبول احمد ہے۔

مقبول صاحب نے پبلشنگ کی دنیا میں بڑا نام پیدا کیا ہے۔ اگرچہ انہوں نے اس کام کی ابتدا نامساعد حالات میں کی، لیکن آج وہ ایک کامیاب پبلشر ہیں۔ دنیا انہیں آج انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور ان کی شرافت، دیانت داری اور انکساری کی قسمیں کھاتی ہے۔ خدا کے فضل سے آج انہیں عزت، شہرت، دولت اور خانگی سکھ سب کچھ حاصل ہے۔ لیکن یہ سب کچھ انہوں نے ایک طویل جدو جہد اور محنتِ شاقہ کے بعد حاصل کیا ہے۔ آج مقبول صاحب اپنی کامیابی سے شاداں اور اپنی زندگی سے مسرور و مطمئن ہیں اور اپنے اہلِ کنبہ کے ساتھ لاہور جیسے بارونق شہر میں آسودہ حال زندگی گزار رہے ہیں۔ مقبول صاحب نے اپنی سرگزشتِ زیست کے قدرے تفصیل کے ساتھ اپنی خودنوشت ''سفر جاری ہے'' میں بیان کیا ہے، ع

Marfat.com

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

زندگی تو ہر کوئی جیتا ہے۔ زندگی کا سفر ہر شخص کو طے کرنا پڑتا ہے۔ اس سفر میں اچھے برے واقعات بھی پیش آتے ہیں اور بعض حادثات سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ طرح طرح کے لوگوں اور شخصیتوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے۔ غرض کہ زندگی کی دھوپ چھاؤں اور نشیب و فراز سے کسی کو مفر نہیں، لیکن بعض زندگیاں دوسروں کے لیے مشعلِ راہ اور قابلِ تقلید بن جاتی ہیں۔ مقبول صاحب نے جینے کا جو سلیقہ اپنایا اور جس جرأتِ رندانہ کے ساتھ زندگی کا سفر طے کیا اور کر رہے ہیں، وہ یقیناً ان کے ہم مشربوں اور دوسرے بہت سے لوگوں کے لیے نہ صرف مشعلِ راہ ہے، بلکہ قابلِ تقلید بھی ہے۔ اس لیے ضروری تھا کہ مقبول صاحب اپنی گوناگوں اور جدوجہد سے بھرپور زندگی کے حالات و واقعات قلم بند کرتے تاکہ دوسرے ان کی کامیابی کے رازِ سربستہ کو جان سکیں۔

ملک مقبول احمد نے ''سفر جاری ہے'' میں اپنے حالاتِ زندگی سیدھے سادے الفاظ میں بڑی دیانت داری اور سچائی کے ساتھ بیان کر دیے ہیں۔ حالاں کہ خودنوشت لکھتے وقت سچائی پر عمل پیرا ہونا نہایت مشکل کام ہے۔ خودنوشت میں جب تک، مبالغہ آمیزی، فسانہ طرازی اور دروغ گوئی کے عناصرِ ترکیبی شامل نہ ہوں وہ خودنوشت نہیں سمجھی جاتی۔ لیکن مقبول صاحب نے جو خودنوشت قلم بند کی ہے وہ ان 'اوصاف' سے پاک ہے۔ انہوں نے بالکل راست انداز میں اپنے بچپن، دورِ طالب علمی، جوانی، ازدواجی زندگی، نیز تلاشِ معاش اور اپنی کامیاب زندگی کے حالات و واقعات بیان کر دیے ہیں۔ مقبول صاحب نے پیش لفظ میں اس خودنوشت کو اپنا ''اعمال نامہ'' کہا ہے جس میں ان کے اچھے اعمال درج ہیں، لیکن یہ ان کی منکسر المزاجی اور شرافتِ نفس ہے کہ جن شخصیات سے ان کا سابقہ پڑا اور جنہوں نے ان

Marfat.com

کے ساتھ ناروا سلوک روا رکھا ان کے بھی انہوں نے صرف نیک اعمال ہی بیان کیے ہیں اور برے اعمال سے وہ صَرفِ نظر کر گئے ہیں صِرف اس لیے کہ کہیں ''ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو''، ورنہ خودنوشت تو عموماً لکھی ہی اس خیال سے جاتی ہے کہ اپنے حریف کو یا ایسوں کو جنہوں نے غم دیے ہیں اور دکھ پہنچائے ہیں، برا بھلا کہہ کر حساب برابر کر لیا جائے، لیکن مقبول صاحب ہمیشہ ''خیالِ خاطرِ احباب'' پرعمل پیرا رہے اور کسی کے بارے میں زبان نہیں کھولی بلکہ انہیں معاف کر دیا۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ پیش لفظ میں مقبول صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس خودنوشت کو لکھنے کی تحریک انہیں اپنے پوتے، پوتیوں اور نواسیوں سے ملی۔ ہوسکتا ہے کہ ان ننھے منوں نے زندگی کی کہانی بیان کرنے کے لیے ان سے اصرار کیا ہو، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اظہارِ ذات کی شدید تر خواہش ہی خودنوشت لکھنے کا محرک بنتی ہے۔ اگر یہ خواہش نہ ہو تو خودنوشت محض واقعات کی کھتونی بن کر رہ جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ''سفر جاری ہے'' اظہارِ ذات کا بہترین نمونہ ہے۔ اسی کے ساتھ یہ ایک عہد کی سماجی، تہذیبی، ادبی اور ثقافتی زندگی کا آئینہ بھی ہے۔

کسی خودنوشت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں مصنف خود راوی ہوتا ہے۔ خودنوشت بھی ناول کی ہی طرح پوری زندگی کا احاطہ کرتی ہے۔ اس میں بھی کئی کردار ہوتے ہیں۔ خاص کردار خود راوی ہوتا ہے، بقیہ کردار اس کے اردگرد گھومتے ہیں جن میں اچھے کردار بھی ہوتے ہیں اور برے کردار بھی۔ راوی طرح طرح کے حالات و واقعات اور حادثات سے دوچار ہوتا ہے۔ ناول کی طرح خودنوشت میں بھی زندگی کے نشیب و فراز ہوتے ہیں۔ لیکن چوں کہ خودنوشت حقیقی کرداروں اور اصلی حالات و واقعات پر مبنی ہوتی ہے اور اس کے زماں و مکاں بھی حقیقی ہوتے ہیں، اس لیے اس کی دستاویزی حیثیت ہوتی ہے اور آئندہ کا ادبی مؤرخ

Marfat.com

تاریخ نویس اس سے بہت کچھ حاصل کر سکتا ہے۔

ایک بہترین خودنوشت کئی چیزوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ یہ آپ بیتی تو ہوتی ہی ہے، جگ بیتی بھی ہوتی ہے۔ اس میں سفرنامے کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے اور شخصیات کے خاکے اور مرقعے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اپنے دکھ درد اور رنج و راحت کے بیاں کے علاوہ مصنف حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ بھی کرتا ہے اور عصری مسائل کا تجزیہ بھی پیش کرتا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں سماج اور تہذیب کی جھلکیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ مقبول صاحب نے اپنی خودنوشت میں یہ تمام چیزیں یکجا کر دی ہیں جو قاری کے لیے انتہائی دلچسپی کا باعث ہیں۔

ملک مقبول احمد ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں دیووال میں پیدا ہوئے۔ ان کا بچپن بھی اسی دیہاتی ماحول میں گزرا۔ اس کی یادیں ان کے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئی ہیں۔ اس ماحول کی منظرکشی انہوں نے نہایت خوب صورت انداز میں کی ہے اور جزئیات نگاری سے بھی کام لیا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں جو ان کے لاشعور میں تھیں وہ انہوں نے قلم بند کر دی ہیں۔ بچپن کی یادیں ان کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ ان یادوں کو انہوں نے ''وہ سنہرا زمانہ'' کے تحت محفوظ کر دیا ہے۔ دیووال اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں مسلمان، ہندو اور سکھ بھی مل جل کر رہتے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے پرآشوب دور میں بھی یہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی برقرار رہی۔ اس دور کو یاد کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''۱۹۴۷ء میں انتقالِ آبادی ہوا اور ہندو اور سکھ اپنے مال و اسباب کے ساتھ جموں چلے گئے۔ کسی مسلمان نے نہ ان کو لوٹا، نہ ان کی جانیں تلف کیں بلکہ ان کو بہ حفاظت سرحد پہ پہنچایا۔'' (ص ۶۶)

''سفر جاری ہے'' کا وہ حصہ انتہائی دلچسپ ہے جس میں ملک مقبول احمد نے

Marfat.com

اردو کے چند ممتاز ادیبوں اور مصنفوں کا ذکر کیا ہے۔ لاہور میں ان کا قائم کردہ ادارہ ''مقبول اکیڈمی'' چوں کہ ایک اشاعتی ادارہ ہے، اس لیے کتابوں کی طباعت و اشاعت کے سلسلے میں اردو کے نہ جانے کتنے لکھنے والوں سے ان کا رابطہ رہا جن کی کتابیں شائع کر کے انہیں ''رُوحانی اور قلبی خوشی'' حاصل ہوئی۔ مقبول اکیڈمی کے ہی توسط سے اردو کے بہت سے اُدیب و دانشوران کے دوست بن گئے۔ ایسے ادیبوں میں رئیس احمد جعفری، احسان دانش، میرزا ادیب، وحید قریشی، انور سدید، امجد اسلام امجد، عبدالعزیز خالد، اے حمید، ایم اسلم، اظہر جاوید، غلام الثقلین نقوی اور طارق عزیز خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ ملک مقبول احمد نے اپنی خودنوشت میں مقبول اکیڈمی کی چند خواتین قلمی معاونین کا بھی ذکر کیا ہے جن میں ادا جعفری، رضیہ فصیح احمد، بلقیس ریاض، عذرا اصغر، ثریا خورشید اور شبانہ یونس خاص اہمیت رکھتی ہیں جن کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ ''میں نے مقدور بھران کا احترام کیا اور ان کو کبھی میرے ادارے سے شکوہ نہیں ہوا''۔ (ص ۲۰۹)

اردو کے جن نامور ادیبوں سے مقبول صاحب کا رابطہ قائم ہوا، ان کے بارے میں انہوں نے اپنے تاثرات ''سفر جاری ہے'' میں قلم بند کر دیے ہیں جن سے ان ادیبوں کی شخصیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ان میں سے بعض شخصی مرقعوں کا ذکر یہاں بے جا نہ ہوگا، مثلاً میرزا ادیب کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

> ''میرزا ادیب کو دیکھنے کی خواہش تو دل میں ہمہ وقت بیدار رہتی۔ ان سے ملاقات ہوئی تو ان کی سادگی سے بہت متاثر ہوا اور حیرت زدہ رہ گیا کہ ''صحرانورد کے خطوط'' کیا انہوں نے ہی لکھی ہے؟'' (ص ۱۷۸)

انور سدید کا ذکر انہوں نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''آپ ان سے پہلی مرتبہ ملیں تو ان سے جدا ہوتے وقت آپ کو احساس ہوگا کہ یہ

Marfat.com

شخص تومدتوں سے آپ کے لاشعور میں موجود تھا۔

یہ ان کے انسانوں کے درمیان 'فرشتہ' ہونے کی دلیل ہے۔'' (ص ۱۸۱)

ادا جعفری کے بارے میں انہوں نے اپنے تاثرات ان الفاظ میں بیان کیے ہیں:

''میں محترمہ کے پاس میرزا ادیب مرحوم کی چٹھی لے کر گیا۔ انہوں نے میرزا ادیب صاحب کی چٹھی بہت قدر کی اور مجھے اپنے تمام شعری مجموعے.... اشاعت کے لیے عطا کر دیئے اور کہا کہ ''اشاعت کے بعد ان کی پندرہ جلدیں مجھے ارسال کی۔

اردو میں ادیبوں، دانشوروں، مفکروں اور سیاسی و مذہبی رہنماؤں کی لکھی ہوئی خودنوشتیں کثیر تعداد میں موجود ہیں، لیکن ''سفر جاری ہے'' ایک ایسی خودنوشت ہے جسے ایک ناشر نے قلم بند کیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اردو میں کسی ناشر کی لکھی ہوئی یہ پہلی خودنوشت ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ اس لحاظ سے ایک جداگانہ خودنوشت ہے کہ اس میں کتابوں کی باتیں کی گئی ہیں۔ اپنے خاندان کے چند افراد کے ذکر سے قطع نظر، مصنف نے دیگر تمام ادبی اور غیر ادبی شخصیتوں کا ذکر کتابوں کے ہی حوالے سے کیا ہے۔ کتاب کی عظمت اور حرمت کا اس قدر پاس کہیں اور بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ ایسے تمام لوگوں کے لیے بے حد مفید ہے جنہیں کتاب سے محبت ہے یا جن کا تعلق کتابوں کی نشر و اشاعت سے ہے یا جو اس کام میں پیشہ ورانہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ ادبی لحاظ سے بھی اس کی اہمیت اور قدر و قیمت کچھ کم نہیں، کیوں کہ ایک اچھی خودنوشت کی تمام خوبیاں اس میں موجود ہیں۔ اس کا انداز بیان بھی نہایت اچھوتا اور 'سادگی و پرکاری' کا بہترین نمونہ ہے۔

''سفر جاری ہے'' ملک مقبول احمد کا ایک گراں قدر علمی و ادبی کارنامہ ہے۔ اس نے اردو میں خودنوشت نگاری کو ایک نیا موڑ دیا ہے اور ایک نئی جہت سے روشناس کرایا ہے۔ یہ کتاب بلاشبہ اردو کے سوانحی ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے جس سے کوئی بھی ادبی مورخ صرف نظر نہیں کر سکتا۔

Marfat.com

مجیب الرحمٰن شامی

''مقبولِ بارگاہ''

اللہ تعالیٰ ملک مقبول احمد کے پوتے بابر اور نواسی ماریہ کو سلامت رکھے کہ ان کی بدولت اردو زبان کو ایک ایسا قلم کار عطا ہوا ہے، جس کی پہلی کاوش ہی نے اسے ممتاز مصنفین کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

ملک صاحب کی عمر دوسروں کی کتابیں چھاپتے گزری ہے۔ انہوں نے مصنفین سے فیض پایا بھی اور ان کو فیض پہنچایا بھی، لیکن وہ خود کوئی کتاب لکھیں گے یا لکھ پائیں گے، یہ انہوں نے کبھی سوچا نہیں تھا۔ وہ شوہر بنے، ابو بنے اور پھر ماشاء اللہ دادا بنے، نانا بنے۔ ان کا ننھا پوتا بابر ان سے ان کی زندگی کے بارے میں طرح طرح کے سوالات کرتا اور پوچھتا ہے کہ کتابیں شائع کرنے کا کام کیوں اور کب شروع کیا؟ یہ خیال ذہن میں کیسے آیا؟ آپ پیدا گاؤں میں ہوئے تو پھر شہری زندگی کیوں اختیار کر لی، وغیرہ وغیرہ۔ دادا ابو پوتے کو اس کے سوالوں کے جوابات دیتے تو وہ حیران رہ جاتا وہ کہتا کہ آپ یہ سب کچھ لکھ ڈالیں، ایک کتاب کی صورت میں۔ وہ اسے جواب دیتے، یار میں کوئی ادیب یا قلم کار نہیں ہوں۔ مجھے لکھنے کا فن نہیں آتا۔ پوتا مچل جاتا۔

Marfat.com

''تو آپ یہ فن سیکھ لیں ناں''۔ پوتے کا اصرار بڑھتا گیا اور دادا ابو سوچ میں پڑتے گئے۔ ان کے دوست بھی ان سے یہی کہتے۔ نواسی ماریہ نے سنا تو وہ بھی ضد کرنے لگی: نانا ابو، بس جلدی سے لکھ ڈالیں۔ بالآخر نانا نے قلم اٹھالیا اور اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں جو کچھ بھی معلوم تھا (بقول خود) بلاکم و کاست لکھ ڈالا۔ کاروباری زندگی کو البتہ سنسر کر دیا اور جن کاروباری دوستوں، رشتہ داروں یا افسروں سے رنج پہنچا، ان کا ذکر حتی المقدور نہیں کیا، تاکہ آبگینوں کو ٹھیس نہ لگے۔

مقبول احمد ملک 77 برس کے ہو چکے، لیکن ان کا ''سفر جاری ہے'' اور یہی ان کی خودنوشت سوانح حیات کا عنوان بھی ہے۔

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا

برادرِ عزیز، شعیب بن عزیز کے بقول ملک مقبول احمد پہلے پاکستانی ناشر ہیں، جنہوں نے خودنوشت سوانح حیات تحریر کی ہے، اس لحاظ سے بھی انہوں نے نشانِ امتیاز حاصل کر لیا ہے۔ وہ کتاب لکھ کر ادیبوں میں تو شمار (بلکہ ممتاز) ہونے ہی تھے، اپنے پیشے سے تعلق رکھنے والوں میں بھی منفرد قرار پائے ہیں۔

ملک صاحب کی زندگی کا سفر ایک عام سے دیہاتی بچے کے طور پر 1930ء میں شروع ہوا تھا۔ ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں میں ایک پولیس اہلکار کے ہاں آنکھ کھولی۔ والد چند ایکڑ اراضی کے مالک تھے، اور گھر کا خرچ بآسانی چل رہا تھا۔ آٹھویں جماعت کا امتحان پاس کیا، تو آگے پڑھنے کی خواہش دل میں موجود تھی، لیکن اردگرد کے کسی گاؤں میں کوئی ہائی سکول نہیں تھا اور دور بھیجنے کے لئے والدین تیار نہ تھے۔ اس لئے عملی زندگی کے آغاز کے منصوبے بننے لگے۔ والد نے انہیں پٹواری بنانے کی کوشش کی کہ ان دنوں بڑی بوڑھیاں ڈپٹی کمشنر کو بھی دعا دیا کرتی تھیں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں پٹواری بنا دے۔ گوجرانوالہ کے پٹواری سکول میں داخل کرا دیا

Marfat.com

گیا، لیکن لمبے چوڑے رجسٹر، جمع بندیاں، زمینوں کی پیمائش، فصلوں کا حساب کتاب ان کو نہ بھا سکا۔ پٹواری نہ بننے کا فیصلہ کر کے گھر پہنچ گئے۔

وہ اپنی مرضی کے مطابق کچھ کرنا یا بننا چاہتے تھے۔ یہ تو خبر نہیں تھی کہ وہ کیا بنیں گے، لیکن کچھ "بننے" اور کچھ "کر دکھانے" کی خلش دل میں موجود تھی اور انہیں کچھ اور کرنے پر مجبور کرتی رہتی تھی۔

سوچتے سوچتے استاد بننے کا فیصلہ کر لیا۔ پاکستان بن چکا تھا، ہندو اور سکھ استاد نقل مکانی کر گئے تھے۔ نئے ملک کو اساتذہ کی ضرورت تھی۔ گورنمنٹ نارمل سکول میں داخلے کا اشتہار چھپا تو درخواست بھجوا دی کہ یہ استادوں کی تربیت کا ادارہ تھا۔ مطلوبہ عمر کی حدود سال پہلے گزر چکی تھی، لیکن نشستیں زیادہ تھیں اور درخواستیں کم، سو داخلہ مل گیا۔ یہ پاکستان کا ان پر پہلا احسان تھا۔ نیا ملک نہ ہوتا تو داخلہ نہ مل پاتا، ان کی عمر ان کی آرزو کے آڑے آ جاتی۔ 1950ء میں تربیت مکمل ہوئی تو ملازمت کے حصول کا مرحلہ درپیش تھا۔ آج شاید کوئی اس بات پر یقین نہ کرے، لیکن ان دنوں ملازمت کے حصول کے لئے کسی سفارش یا کشکول کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ فارغ التحصیل ہونے والوں کی فہرستیں ضلعی انسپکٹر تعلیم کو بھیج دی جاتی تھیں۔ جب کوئی آسامی خالی ہوتی، ان فہرستوں کے مطابق تقرری کے احکامات تربیت یافتہ معلمین کو گھر بھجوا دیئے جاتے۔ باری آنے پر انہیں بھی خط تقرر مل گیا اور وہ اپنے آبائی گاؤں سے دو اڑھائی میل کے فاصلے پر واقع گورنمنٹ پرائمری سکول میں استاد بن کر جا پہنچے۔

مقبول احمد کی خواہش تو پوری ہوگئی، لیکن وہ مطمئن نہیں ہو پائے۔ ان کے اندر بیٹھا ہوا کوئی شخص ان سے مسلسل کہتا رہتا تھا کہ تمہاری منزل دور ہے۔ "تمہارا سفر جاری ہے" کچھ اور سوچو، کچھ اور کرو، کچھ اور آگے بڑھو۔ اقبال اور کلامِ

Marfat.com

اقبال سے ان کو دلی لگاؤ پیدا ہو چکا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے یہ شعر زبان پر رہتا

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں

وہ اپنی والدہ کی خدمت کرتے ہوئے ان کے پاؤں دباتے ہوئے اس بے چینی اور اضطراب کا اظہار کرتے تو وہ سراپا دعا بن جاتیں: ''اللہ تمہاری منزلیں آسان کرے، تمہیں دین و دنیا کی اتنی نعمتیں دے کہ تم ان کو سمیٹ نہ سکو''۔

ملک صاحب نے اپنے ان الفاظ کی لاج رکھی ہے، اور ایسی کتابیں چھاپی ہیں، جو معاشرے پر اچھے تاثرات مرتب کریں۔ پیسہ کمانے کے لئے انہوں نے ''شیطان'' سے کبھی سمجھوتہ تو کیا رابطہ بھی نہیں کیا۔ دیانت، محنت اور استقامت کے ساتھ رحمٰن کے راستے پر چلے ہیں اور مشکلات کو زیر کرتے گئے ہیں۔ مقبول اکیڈمی اب ایک ادارہ نہیں، ایک تحریک ہے اور اس سے کئی ادارے جنم لے چکے ہیں، ان کے بچے ان کے شریک کار ہیں اور ان کے کام کو آگے بڑھا رہے ہیں۔

ملک مقبول احمد کی کہانی ہر شخص کی کہانی بن سکتی ہے۔ ہر شخص کو آگے بڑھنا سکتی اور کامیابی کا چہرہ دکھا سکتی ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ تقدیر کے شکوے کرنے اور آگے بڑھنے والوں کو دیکھ دیکھ کر کڑھنے کی بجائے کچھ کرنے کا عزم کیا جائے اور نیک نیتی کے ساتھ آغازِ سفر کر دیا جائے۔

کافر ہے تو تقدیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی

واہ، کیا ہے بندہ مومن یعنی ''مقبولِ بارگاہ'' کی۔

Marfat.com

جنابِ منشا یاد

''خوشبو کی طرح پذیرائی''

مجھے ''سفر جاری ہے'' ڈاکٹر انور سدید کی وساطت سے ملی۔ میں چونکہ ان دنوں اپنی خودنوشت لکھنے میں مصروف ہوں، اس لیے خودنوشت سوانح عمریاں دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ یہ کتاب پا کر مجھے بہت خوشی ہوئی اور میں نے فوراً ہی اس کی ورق گردانی شروع کر دی۔ پہلی ورق گردانی میں اگر کوئی کتاب مجھے گرفت میں نہ لے تو میں اس کا پڑھنا ملتوی کرتا رہتا ہوں۔ کیونکہ کسی ضرورت، خوف یا معاوضے کے بغیر ایک غیر دلچسپ کتاب پڑھنا ٹوکری بھر پیاز کھانے کے مترادف ہوتا ہے۔ میں نے کتاب کے شروع میں دی گئی اہلِ نقد و نظر کی آراء سے متاثر ہونے کی بجائے براہِ راست ''کتاب اور اس کا تعارف'' والا باب پڑھنا شروع کیا۔ کتاب کے بارے میں دیگر دانشوروں اور فلاسفروں کے اقوال سے قطع نظر مجھے مصنف کے اپنے بہت سے خیال انگیز جملے پڑھ کر ان کی علمی اور فکری حیثیت کا اعتبار آ گیا اور کتاب اور مصنف سے دلچسپی پیدا ہوتی چلی گئی۔ جیسے:

☆ ربِ ذوالجلال کو جب بھی بنی نوع انسان کی رہنمائی کے لیے اپنے پیغمبر مبعوث کرنے کی ضرورت پیش آئی تو ان کو وحی اور الہام کے ذریعے آسمانی صحیفے اور آفاقی کتب سے سرفراز فرمایا۔

☆ بلاشبہ کتاب مصنف کے لکھ دینے ہی سے وجود میں آتی ہے لیکن کتاب کو

Marfat.com

صوری حسن و رعنائی ناشر فراہم کرتا ہے۔

☆ کتاب بظاہر ایک خاموش شے ہے لیکن اس کے اندر گویائی کے سمندر موجزن ہیں۔ کتاب رحمانی اور آسمانی تخلیق ہے اور اس کا مقصد نسلِ انسانی کو صراطِ مستقیم پر چلانا اور معاشرے کی اصلاح ہے۔

☆ میں کتاب کی خاموشی کے باوجود اس کی گویائی سے آشنائی رکھتا ہوں اور اس کے باطن کی دانش کو سمجھتا ہوں۔ میرا نصابی علم محدود ہے مگر میری کتاب سے محبت گہری ہے۔ کتاب ہمیں عقل و خرد کے ان جزیروں کی سیاحت کراتی ہے، جو گردشِ زماں میں گم ہو چکے ہیں۔

ان باتوں سے مجھے یقین ہو گیا کہ مصنف کتاب کی ضرورت و اہمیت سے بہت اچھی طرح آگاہ ہے اور وہ محض کتابیں شائع ہی نہیں کرتے ان کی خاموشی کی زبان کو بھی سمجھتے ہیں اور کتابوں میں مستور علم و ادب کی گہری باتوں کو سمجھنے کا شعور رکھتے ہیں۔ پھر جب یہ خوبصورت سطور میری نظر سے گزریں تو میں ان کا اور بھی قائل ہو گیا۔ انہوں نے لکھا تھا: ''مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی شرم، جھجک یا رکاوٹ نہیں کہ میں تعلیمی سرٹیفکیٹوں، ڈگریوں اور دستاویزی حوالوں سے انتہائی کم علم ہوں لیکن پھولوں کے درمیان رہ کر خوشبودار ہو جانے والی مٹی کی طرح میں بھی ادبا، شعرا، مصنفین، مترجمین، معلمین، محققین، اور عالی ظرف انسانوں اور کتابوں کے داخلی جمال سے فیضیاب ہوا اور میں خود بھی ایک کتاب بن کر رہ گیا''

ظاہر ہے کہ ان کی نگاہ محض کتاب کے ظاہری حسن پر ہی نہیں، وہ اس کے باطن سے بھی آشنائی رکھتے ہیں۔ اور وہ کم تعلیم یافتہ شخص ہرگز نہیں، یہ محض ان کا انکسار ہے۔ اعتبار ساجد نے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ ''اپنی کم علمی کا اعتراف وہ عالی ظرف انسان کر رہا ہے جسے بین الاقوامی ادارے مارکوئیس پبلشنگ بورڈ نے اپنی کتاب ہو از ہو ان دی ورلڈ (Who is who in the world) میں پاکستان کی اہم شخصیت کے طور پر 1999

، میں شامل کیا ہے۔ حالانکہ ہمارے ہاں لوگ پتہ بھی توڑتے ہیں تو درخت گرانے کا دعویٰ کرنے لگتے ہیں۔ مگر اس پوری کتاب میں کوئی دعویٰ نہیں اور یہی سب سے بڑا دعویٰ ہے''

مجھے یقین ہو گیا کہ یہ شخص اپنی زندگی کا احوال اور اپنے اشاعتی تجربات بیان کرتے ہوئے یقیناً جو کہے گا وہ سچ ہوگا اور اس سچائی اور خلوص کی گواہی ہمیں کتاب کی سطر سطر میں ملتی ہے۔ اپنے اشاعتی تجربے اور اپنی کتاب کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ ''کتابوں کی طباعت کا کام کئی حوالوں سے ایک پرخطر کام ہے۔ اکیلا فرد اس میں ہاتھ نہیں ڈال سکتا لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ اس کام کی ابتدا ایک فرد ہی کرتا ہے۔ اس فرد کے اندر ایک اپج ہوتی ہے جس کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگتا ہے اور پھر اس کے دل میں ایک کتاب کے بعد دوسری بہتر کتاب پیش کرنے کی ترنگ پیدا ہوتی چلی جاتی ہے''

تو گویا کتاب چھاپنے کا کام ان کے نزدیک محض روٹی روزی کا وسیلہ یا کاروبار نہیں تھا۔ یہ ان کا شوق بھی تھا جو بڑھ کر عشق کی صورت اختیار کر گیا ورنہ اس کا جادو سر چڑھ کر نہ بولتا اور وہ کتاب چھاپتے چھاپتے خود کتاب نہ بن جاتے۔ کاروبار میں کاروباری حربے استعمال ہوتے ہیں۔ ترنگ صرف شوق اور عشق میں اٹھتی ہے۔ یقیناً انہیں بہتر کتاب پیش کر کے وہی مسرت اور لطف ملتا ہوگا جو کسی آرٹسٹ کو تخلیق میں ملتا ہے۔ اپنے کام اور پیشے سے عشق ہونا خوش نصیبی ہے ورنہ اس سے بیگار بھلی۔

میں نے تمہیدی ابواب کے بعد ان کے حالاتِ زندگی پڑھنا شروع کیے تو ان کے اور اپنے بچپن کے حالات اور ماحول میں گہری مماثلت محسوس ہونے لگی جس سے میری دلچسپی مزید بڑھ گئی۔ وہی میرے بچپن میں دیکھے بھالے گاؤں جیسا گاؤں۔ آبادی کے تین اطراف میں پھیلا ہوا جوہڑ، جو جیٹھ اساڑھ کی گرمی میں سوکھ جاتا اور مٹی کی تہہ پپڑیوں کی صورت اختیار کر جاتی۔ وہی صحن میں شیشم اور بیریوں کے درخت، پرندوں کے گھونسلے اور شام کے وقت ان کا شور، گھر میں چھوٹی سی کھوہی، چرخے کا تکلا، سرکنڈے

Marfat.com

اور کھجور کے رنگ برنگے پتوں سے مونڈھے، ٹوکریاں، چھابے اور چنگیریں بناتی عورتیں، وہی سریلی آوازوں والی دوہے، بارہ ماہے، معراج نامے، اور جدائی و وداع کے گیت گاتی لڑکیاں۔ وہی گھر کے درودیوار پر چڑھی بیلیں، توریوں کا مزیدار سالن اور سوکھ جانے والی موٹی توریوں کے نرم برش۔ اور وہی گھر کے تنور پر پکی ہوئی گرم گرم اور خوشبودار روٹی۔

کچھ اور آگے بڑھا تو بچپن کے مشاغل اور کھیلوں کا احوال بھی ویسا ہی تھا جیسا میرے بچپن کا۔ وہی چاندنی راتوں میں آدھی آدھی رات تک کھلے میدانوں میں کوکلا چھپاتی کھیلنا۔ وہی ستاروں بھرا آسمان، گرمیوں میں سرخ آندھی اور سیلاب، خشک سالی میں بارش کی دعائیں اور گیت، گاؤں کا ساون اور سانپوں اور دیگر حشرات الارض کا گھروں میں گھس آنا اور درختوں پر چڑھ جانا، فصلوں کا پانی میں ڈوب جانا اور مویشیوں کے لئے چارے کی قلت پیدا ہو جانا۔ لوگوں کو رفع حاجت تک کے لئے خشک جگہ نہ ملنا۔ اس کے بعد میلوں ٹھیلوں اور کھیل تماشوں کا ذکر۔ اور تب تو وہ مجھے بہت ہی اپنے قریب لگے جب پتہ چلا کہ انہیں بھی میری طرح میلے ٹھیلے اور ناٹک دیکھنے کا بہت شوق تھا اور ان کے اندر بھی بندر اور ریچھ کا تماشا دکھانے، پھوڑے پھنسیوں پر جونکیں لگانے، طوطے سے فال نکلوانے، رسوں پر چلنے اور قلابازیاں لگانے والے نٹ اور بازیگر اب تک زندہ ہیں اور انہیں بھی رہس دھاریئے اور ان کے لڑکیوں کا سوانگ دھار کر ناٹک میں حصہ لینے والے خوبرو اور خوش گلو لڑکے یاد ہیں۔

توہم پرستی ہمارے معاشرے میں زندگی کے حقائق کو سمجھنے میں بہت بڑی رکاوٹ ہے اور مذہبی اعتقادات میں غلط ملط کر دی جاتی ہے۔ ''راستہ روکنے والی بلا'' کا قصہ جس کی ایک واضح مثال ہے۔ ایسے قصے اور توہمات ہمارے دیہات میں عام ہیں مگر انہوں نے اس سے جو نتیجہ نکالا، وہ بہت سے پڑھے لکھے بلکہ بعض عالم فاضل لوگوں کی سمجھ میں بھی نہیں آتا۔ مجھے اس سے ان کی راست فکری کا بھی اندازہ ہو گیا۔ لکھتے ہیں

Marfat.com

''خوف کا احساس اور واہمے ہی بھوت پریت ہوتے ہیں۔ اندھیرے میں ان دیکھی اشیاء کے کئی کئی بازو، ٹانگیں اور سر نظر آتے ہیں اور انسان اپنی داخلی کمزوری سے ڈر جاتا ہے۔''

موسیقی سے بے حد لگاؤ، سیف الملوک پڑھنا اور گھر کی خواتین اور دوستوں عزیزوں کو گا کر سنانا بھی مجھے اپنے جیسا ہی لگا۔ وہ عمر میں مجھ سے چھ سات برس بڑے ہیں مگر میرے اور ان کے ابتدائی حالات میں حیرت انگیز مماثلت ہے۔ میری شادی بھی اپنی کزن سے ہوئی جسے صفائی کا جنون ہے۔ میری بھی ایک بیٹی ہے اور میں نے بھی ایک بیٹے کو زبردستی ڈاکٹر بنایا۔ مڈل کا امتحان پاس کر کے انہوں نے پٹواری بننا قبول نہ کیا اور میں نے سکول ٹیچر۔ انہوں نے فاضل فارسی کا کورس پڑھا مگر امتحان نہ دیا مگر میں نے براستہ بٹھنڈہ ایم اے کرنے کے لیے فاضل اردو کا امتحان دیا اور پاس بھی کر لیا۔ ایک حیرت انگیز مماثلت یہ کہ میرے ایک چھوٹے بھائی کا نام بھی منظور احمد تھا جو بچپن میں فوت ہو گیا تھا۔ البتہ ایک فرق یہ ہے کہ انہیں والد نے کبھی نہیں مارا، صرف والدہ ٹھکائی کرتی تھیں۔ مگر مجھے دونوں مار لیتے تھے۔ والدہ جھوٹ موٹ اور والد سچ مچ۔ ایک اور اتفاق دیکھئے کہ ملک صاحب کا تعلق ضلع سیال کوٹ سے ہے اور میرا ضلع شیخوپورہ سے مگر بہت سال پہلے ایک بار انہوں نے میرے گاؤں کے قریب سچا سودا، متصل فاروق آباد میں دو مربعے اراضی خرید لی اور زمینداری شروع کر دی۔ وہ علیحدہ بات ہے کہ انہیں یہ راس نہ آئی۔ شاید اللہ تعالیٰ کو ان سے علم و ادب کی خدمت لینا ہی مقصود تھا۔ تاہم ان مماثلتوں سے وہ مجھے بہت ہی اپنے اپنے لگنے لگے لیکن جب میں نے اکبر حمیدی، جمیل آذر اور ابوالامتیاز ع۔ س مسلم اور بعض دیگر احباب کے تاثرات پڑھے جن کو ملک صاحب کے بچپن کا احوال پڑھ کر اپنا بچپن اور گاؤں یاد آ گیا تھا تو مجھے ابوالامتیاز ع۔ س مسلم کی اس تحریف سے اتفاق کرنا پڑا کہ:

''دیکھنا ''تحریر'' کی لذت کہ جو اس نے ''لکھا''
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے''

Marfat.com

''سفر جاری ہے'' کے مصنف کا اندازِ تحریر سادہ، غیر مبہم مگر دلکش ہے۔ غالباً ان کے تجربے میں یہ بات آئی ہوگی کہ مصنف کا اندازِ تحریر ایسا ہی ہونا چاہیے کہ کتاب، پڑھنے والے پر پتھر بن کر نہ گرے، اس سے دوست کی طرح کلام کرے۔ کتاب کے مطالعے کے دوران میں بعض جملوں نے تو مجھے چونکا دیا۔ ایسے جملے کوئی عام وقائع نگار یا نثر نویس، جب تک وہ سچا ادیب نہ ہو اور اس کے اندر تخلیق کی شمع روشن نہ ہو، ہرگز نہیں لکھ سکتا۔ مثلاً ننھیال جانے اور اپنی ماموں زاد منگیتر سے ملاقات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''اس دور میں وہ میرے دل کی پہنائیوں میں مستقل طور پر آباد ہوگئی تھی۔ میرے ننھیال جانے کے ارادوں میں اور پھر تمام سفر کے دوران میں وہ ہی ذہن کے پردوں پر رقصاں رہتی۔ میں اسے اپنی گہری اور سچی دوست سمجھتا تھا۔ بڑی سی حویلی کے کسی گوشے میں ہم گھنٹوں بیٹھے ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہتے۔ ہم دن کا زیادہ وقت ایک دوسرے کی نظروں کے دائرے میں گزارتے۔''

یوں تو پانی کے علاج اور لوئی کوہنی کی کتاب ''نیا علم شفا بخشی'' کی انہوں نے اتنی اچھی وکالت کی ہے کہ اب اس کتاب کا پڑھنا سب پر واجب ہو جائے گا مگر ''پتے کی بات'' کے عنوان سے صحت اور تندرستی کے لیے صبح کی سیر اور ورزش کے سلسلے میں اپنے تجربات بیان کرتے ہوئے انہوں نے ایک نہایت بلیغ اور خوبصورت جملہ لکھا ہے:

''موٹاپا گلے میں بندر باندھ کر جسم کو اٹھائے اٹھائے پھرنے کے مترادف ہے''

دیہات میں برسات کے دنوں کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں کہ پورا منظر اور ماحول زندہ ہو کر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے'' ساون میں بادل امنڈ کر آتے اور بارش کھل کر برستی۔ ندی نالے، کھیت، کنویں اور جوہڑ سب بھر جاتے۔ سطح زمین پانی کی ہموار چادر نظر آتی۔ زرد رنگ کے مینڈک ہزاروں کی تعداد میں نہ جانے کہاں سے آجاتے اور کھیتوں کی منڈیروں پر بیٹھ کر ایک ساتھ ٹراتے۔ چوہے، سانپ، نیولے خشک جگہ کی

Marfat.com

تلاش میں ادھر اُدھر نکل جاتے ۔ کچھ درختوں پر بھی چڑھ جاتے جہاں سے انہیں چیلیں اور شکرے پکڑ کر کھانے کے لیے اونچے درختوں پر لے جاتے ۔ جو انسانوں کے ہتھے چڑھ جاتے وہ مارے جاتے ۔ کن کھجورے اور بچھو وغیرہ بھی اپنی جانیں بچانے کے لیے زمین کے نیچے پانی بھر جانے سے گھروں کے کچے فرشوں پر نکل آتے''

انہیں موقع اور محل کے مطابق بات کرنے کا سلیقہ بھی خوب آتا ہے ۔ سکولوں میں سامان کی سپلائی کے ٹھیکے کا ایک واقعہ ملاحظہ کیجئے ۔ جب رشوت یا کمیشن نہیں لیا گیا تو صاف لکھ دیا لیکن جب کچھ دینا لینا پڑا تو لہجہ بدل لیا اور کھلے انداز میں کچھ کہنے کی بجائے اشارے اور کنائے میں بات کہہ دی ۔ ایگزیکٹو ڈسٹرکٹ آفیسر (لٹریسی) شیخوپورہ کا ذکر ہو رہا ہے ۔ لکھتے ہیں '' انہوں نے ہم سے کسی قسم کی کمیشن یا زائد شے طلب نہیں کی ۔ مگر اکاؤنٹ آفس سے ہمارے بل پاس کرانے کے بارے میں انہوں نے ہم سے معذرت کر لی ۔ لہٰذا وہاں سے بل پاس کرانے کے لیے ہم نے اپنے ذرائع استعمال کئے ۔ سب حضرات جانتے ہیں کہ اکاونٹ آفس سے بل کس طرح پاس ہوتے ہیں''

کتاب میں اپنے حالات اور واقعات کے علاوہ بھی انہوں نے بہت سی کار آمد اور دلچسپ چیزیں شامل کر دی ہیں ۔ ادیبوں کے خطوط ، تبصرے اور تصویریں ، مصنفین کے حالاتِ زندگی اور تصویریں ، کتابوں پر تبصرے ، حج بیت اللہ کا سفر نامہ ، انٹرویوز ، حکومتی اہل کاروں کی چٹھیاں ، بعض کتابوں کے بارے میں معلومات جیسے آزادی ہند اور تمدنِ عرب کی اشاعت اور اسلامی کتابوں اور تاریخی ناولوں کے قصے ۔ بعض مصنفین سے ملاقاتوں کا احوال اور ان کے رویوں کے بارے میں انکشافات ۔ جیسے میاں ایم اسلم کی جوتوں والے ٹائیٹل پر ناراضی ۔ محمد سعید ، رئیس احمد جعفری اور اے حمید کے ناولوں کی مقبولیت اور اردو ادب کے تین نامور دانشوروں کا ذکر جو بغیر داڑھی کے مولانا تھے ۔ انہوں نے بہت سے ادیبوں کے ، جن کا ان کے ادارے سے تعلق رہا ، حالاتِ زندگی اور تصویروں کے ساتھ تعارف بھی کتاب میں شامل کیا اور ان کے بارے میں کلمہ خیر ضرور کہا مگر کسی کی بے جا اور غیر واجب توصیف نہیں کی ۔ ہر ایک

Marfat.com

کے بارے میں بہت نپے تلے انداز میں اپنی رائے دی۔ جو جیسا ہے اسے ویسا ہی پیش کیا ہے۔ کم نہ زیادہ۔ اس طرح یہ حوالے کی کتاب بھی بن گئی۔ سید قاسم محمود کا بھی، اشاعتی تجربوں کے حوالے سے ہی سہی، یہی خیال ہے ''میری رائے میں یہی اس کتاب کی اولین خصوصیت ہے کہ یہ مستقبل میں کام آنے والی کتاب ہے''

کتاب میں ڈاکٹر صفدر محمود، علی سفیان آفاقی، ڈاکٹر انور سدید، اے حمید، شعیب بن عزیز، طارق اسمٰعیل ساگر، سید واجد رضوی، ابوالامتیاز ع۔س مسلم، قاضی ذوالفقار احمد، قمر نقوی، اور ڈاکٹر اللہ بخش ملک جیسے دانشوروں اور اہلِ نقد و نظر کے مضامین، تبصرے اور تاثرات شامل ہیں اور ہر ایک نے کتاب کے کسی نہ کسی پہلو اور مصنف کی کسی نہ کسی خوبی کو سراہا ہے۔ ڈاکٹر صفدر محمود جیسے مستند اور معتبر دانشور نے اسے ایک ادبی دستاویز قرار دیا۔ علی سفیان آفاقی نے ایک دلچسپ خودنوشت۔ ڈاکٹر انور سدید نے کہا کہ اس آپ بیتی سے ان کی ملاقات ایک ایسے اسلام پسند ناشر سے ہوئی جس نے کتاب کی اشاعت کو ایک مقدس فریضے کے طور پر قبول کر رکھا ہے۔ اے حمید نے انہیں بھی ایک رومان پرور ادیب قرار دیا۔ شعیب بن عزیز نے انہیں گرم دم جستجو اور نرم دم گفتگو رہنے والے کامیاب انسان اور ناشر کہا۔ قاضی ذوالفقار نے انہیں ادب کی شمع فروزاں اور قمر نقوی نے خلوص کا روشن چراغ قرار دیا۔ ڈاکٹر طارق عزیز نے ''سفر جاری ہے'' کو اردو کی مشہور اور نمایاں سوانح عمریوں ''ناقابل فراموش'' (دیوان سنگھ مفتون) ''سرگزشت'' (عبدالمجید سالک) ''نقشِ حیات'' (مولانا حسین احمد مدنی) ''عمر رفتہ'' (تقی محمد خاں) ''یادوں کی برات'' (جوش ملیح آبادی) ''جہانِ دانش'' (احسان دانش) اور ''مٹی کا دیا'' (میرزا ادیب) کے تناظر میں رکھ کر دیکھا اور اردو کی نمایاں آپ بیتیوں میں اہم اور وقیع اضافہ قرار دیا۔

میں نے ان سب باتوں اور دعووں کو ذہن میں رکھ کر کتاب کا مطالعہ کیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ مجھے کہیں بھی بے جا توصیف یا پبلک ریلیشننگ دکھائی نہ دی۔ اب بھلا ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا جیسے کھرے شخص سے کوئی اس بات کی توقع کر سکتا ہے کہ وہ لگی لپٹی

Marfat.com

رکھیں گے۔مگر انہوں نے بھی کتاب کو سراہا ہے:

چند اہم ادیبوں کے خطوط کے اقتباسات دیکھیے:

☆ یہ کتاب محض آپ بیتی نہیں رہی بلکہ اس میں جگ بیتی اور کتاب کی کہانی بھی شامل ہوگئی ہے۔ (وحید قریشی)

☆ وہ پاکستان کے غالباً پہلے ناشر ہیں جنہوں نے اپنی آپ بیتی سپردِ قلم کی ہے۔۔۔انہوں نے ایک ناشر کے صحیح منصب کو ہمہ وقت سامنے رکھا ہے۔قارئین اس کتاب کے مطالعے سے نشرواشاعت کے بازار کی جملہ کرونوں سے بخوبی آگاہ ہو سکتے ہیں۔ (وزیر آغا)

☆ ''سفر جاری ہے'' ان کے گوناگوں شخصی مشاہدات اور تجربات کے بیان کے ساتھ ساتھ اس دور کے ادیبوں اور ادبی فضا کا احوال اور منظر نامہ بھی بن گئی ہے جس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ (امجد اسلام امجد)

میں سمجھتا ہوں ''سفر جاری ہے'' کو وقیع بنانے میں دو تین امور شامل ہیں۔ ایک تو یہ کہ ملک مقبول احمد کے حالاتِ زندگی بہت دلچسپ تھے اور ہر کامیاب اور سیلف میڈ شخص کی طرح ان کے پاس بھی بتانے اور دوسروں سے Share کرنے کو بہت کچھ تھا۔دوسرے اس میں پہلی بار ایک پبلشر نے مصنفین سے متعلق معاملات ومسائل اور اپنے تجربات بیان کیے جو مصنفین اور ناشرین کے لیے مشعلِ راہ بن سکتے ہیں۔لیکن سچی بات یہ ہے کہ ایسی کتاب صرف وہی پبلشر لکھ سکتا ہے جو محض تاجر نہ ہو، کتاب سے سچی محبت کرتا ہو اور اس کی قدر وقیمت کو پہچانتا ہو۔جس کی شائع کی ہوئی کتابیں معیاری ہوں، اشاعتی ادارہ باوقار اور قابل اعتماد ہو، جس نے مصنفین سے معاملات اور معاہدے خوش اسلوبی سے نبھائے ہوں۔

اللہ کرے ملک مقبول احمد اسی طرح شرف مقبولیت پاتے رہیں۔ان کا یہ سفر تادیر جاری رہے اور پڑھنے والے خوشبو کی طرح ان کی کتابوں کی پذیرائی کرتے رہیں۔

Marfat.com

ماہنامہ ''تمثیلِ نو'' دربھنگہ (بھارت)

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

سفر جاری ہے

''سفر جاری ہے'' پاکستان کے سب سے بڑے اشاعتی ادارے ''مقبول اکیڈمی'' کے مالک ملک مقبول احمد کی خودنوشت ہے۔ میرے مطالعہ کے مطابق کسی بھی ناشر کی اُردو میں یہ پہلی سوانح ہے۔ ملک مقبول احمد کا گزرا ہوا کل، فکر کی بلندی کا آسمان چھوتا ہے اور جن کا آج نقشِ تصویر اور شوق ناتمام کی لامتناہی داستان ہے۔ ملک مقبول احمد کی چھتنار شخصیت علم کا لائحہ عمل طے کرتی ہے، ذوق کی پرداخت کرتی ہے، حوصلے اور عزائم سے سرشار کرتی ہے، بلیغ اور معنویت سے بھرپور منصوبہ بند پیش رفت کرتی ہے، ذوقِ طلب اور شوقِ سفر کے مرحلے کا تصال کراتی ہے، چشمِ تصور کو تابِ نظارہ سے ہمکنار کرتی ہے اور بادِ مخالف میں اُردو کا چراغ روشن کرتی ہے۔ خلوص، محبت، ہمدردی اور شرافت کے مجسم پیکر ملک مقبول احمد خودداری و رواداری اور علم پروری و انکساری کے جوہر سے متصف ہیں۔ علم حاصل کرنے اور علم بانٹنے کا شوق ان میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ انہوں نے اپنی شخصیت اور علم پروری کی داستان بڑی دلداری، جی داری اور جمالیاتی ذوق کی آئینہ داری کے ساتھ سنائی ہے جس میں ناول کا مزہ، فلم کا تماشہ اور بہت کچھ سیکھنے جاننے کا گوناگوں برق تجلی ہے۔ یادآفریں واقعات اور تلخ وشیریں تجربات کا جداگانہ بیان شوق ہے اس لئے بھی کہ شاعروں، ادیبوں اور مصنفین کے ساتھ خود اپنے آپ سے انہوں نے دیانتداری برتی ہے۔

Marfat.com

ملک مقبول احمد بہت بڑے ناشر ہیں۔ اپنے تجربے کی روشنی میں انہوں نے کتابوں کی اشاعت سے متعلق بعض معنی خیز انکشاف کئے ہیں۔ ان کے تجربے میں صحت مند قدر ہے، گہرا شعور ہے اور واقعاتی سچائی کا آب و رنگ ہے:

''کتاب اس مقصد کے تحت شائع کی جاتی ہے کہ اسے دوسرے لوگوں تک پہنچایا جائے۔ اس کے مطالب و مفاہیم عام کئے جائیں۔ لہٰذا کتاب کا ناشر ایک کتب فروش کا فریضہ بھی ادا کرتا ہے۔ میں یہ فریضہ کئی برسوں سے ادا کر رہا ہوں اور میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ اس کام سے روزی کمانا اتنا آسان نہیں ہے جتنا بظاہر نظر آتا ہے یا جس کا تصور کیا جاتا ہے۔ کتاب سازی کو تخلیقی عمل سے بھی تشبیہ دی گئی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ تخلیقی عمل میں کس قدر دشواریاں اور مشکلات پیش آتی ہیں۔''

حقیقی احساس و عرفان سے کام لے کر دانش و بینش کی نئی معنویت کو ملک مقبول احمد تفسیری عمل سے گزارتے ہیں اور کتابوں کی دنیا کے گہرے سمندر میں غواصی کر کے سیپیاں تلاش کرتے ہیں۔ ساتھ ہی نامور اور غیر معروف قلمکاروں کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی کرتے ہیں۔ اس کتاب میں خوبصورت خیالات کی وجہ سے متنوع الموضوعات کی جلتی شمع ہے اور اُمید کے جگنو بھی ہیں۔

ماہنامہ ''تمثیل نو'' دربھنگہ (بھارت)

Marfat.com

ڈاکٹر وحید قریشی

ملک مقبول احمد کی آپ بیتی ''سفر جاری ہے''

ہر شخص کی زندگی ایک حقیقت ہوتی ہے لیکن جب اس کے اپنے قلم سے لکھے ہوئے اس کے حالاتِ حیات پڑھیں تو اس میں ایک سچے افسانے کے عناصر بھی نظر آنے لگتے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب ''سفر جاری ہے'' ایک ایسی ہی خود نوشت سوانح عمری ہے، جس میں اُردو کتابوں کے ایک مشہور ناشر ملک مقبول احمد نے اپنی زندگی کو خود منکشف کیا ہے۔ مُصنف کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے غربت کی گود میں آنکھ کھولنے اور کم تعلیم یافتہ ہونے کا اعتراف کھلے دل سے کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ انہیں پڑھنے لکھنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ اور ان کی راہنمائی بھی کسی نے نہ کی کہ وہ زندگی سنوار لیتے۔ مدرسے کی تعلیم کے دوران وہ کھیل کود میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے اور سکول سے بھاگ جاتے تھے۔ لیکن جب عملی زندگی میں آئے تو نہ صرف کتاب ان کی دوست بن گئی بلکہ انہیں ملک کے نامور ادیبوں سے ملاقاتیں کرنے کا موقع بھی ملا۔

انہوں نے زندگی کے بے شمار مدوجزر دیکھے، مشکلات نے ان کا راستہ روکنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی لیکن انہوں نے حوصلہ نہ ہارا اور توکل صرف خدا پر کیا۔ آخر زندگی ان پر مہربان ہوگئی۔ رسالہ ''چودھویں صدی'' کا ناکام ایڈیٹر ''مقبول اکیڈمی'' کا کامیاب ناشر بن گیا۔ اس کتاب کی کہانی ایک ایسے عام آدمی

Marfat.com

کی کہانی ہے، جس نے کم سرمائے سے کاروبار شروع کیا لیکن جو دیانت اور امانت کے اصولوں پر عمل کرتا رہا اور ادیبوں کی تخلیقات کو کتابی صورت میں پیش کر کے خلقِ خدا کو علم کی طرف راغب کرتا رہا۔ اس کتاب میں ملک مقبول احمد ایک ایسے ناشر کی صورت میں سامنے آتے ہیں، جو ادب تخلیق کرنے والوں کی خدمت کو اپنی زندگی کا اوّلین مقصد قرار دیتا ہے۔ انہوں نے اس ادارے سے تمدنی، دینی، ادبی، سیاسی اور تہذیبی ہر قسم کی کتابیں شائع کی ہیں اور خوبی کی بات یہ کہ انہوں نے ادیبوں کی عزتِ نفس کو ہمیشہ قائم رکھا ہے، ان سے اپنی نسبتیں مضبوط سے مضبوط تر بنائی ہیں اور ادیبوں سے ملنے اور ان سے کتابیں حاصل کرنے کے لیے ان کے گھر پر حاضر ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صفدر محمود، میرزا ادیب، انور سدید اور غلام الثقلین نقوی سب ان کی تعریف کرتے ہیں۔

اس کتاب کی سادگی متاثر کرتی ہے۔ اہم بات یہ کہ انہوں نے اپنی ''جیون کتھا'' لکھتے ہوئے اپنی اشاعتی زندگی کو بے نقاب کر دیا ہے۔ مختلف نامور ادیبوں کے چھوٹے چھوٹے خاکے، ان کی تصویریں کتاب میں شامل کرنے کے علاوہ اپنے ادارے سے چھپنے والی چند مشہور کتابوں کے تبصرے بھی شامل کیے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب محض آپ بیتی نہیں رہی بلکہ اس میں جگ بیتی اور کتاب کی کہانی بھی شامل ہوگئی ہے۔ اور ملک مقبول احمد ایک ناشر سے مصنّف بھی بن گئے ہیں۔ میں ادبی برادری میں ان کی آمد کا خیر مقدم کرتا ہوں اور اس کتاب کی اشاعت پر انہیں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

رسالہ ''مخزن'' قائداعظم لائبریری ادبی مجلہ نمبر 3

Marfat.com

ڈاکٹر عبدالقدیر خان
ایٹمی سائنس دان، اسلام آباد

''سفر جاری ہے''

جناب ملک مقبول احمد صاحب کی نہایت دلچسپ کتاب بلکہ سوانح حیات ''سفر جاری ہے'' جب کھولی تو بند کرنا مشکل ہوگیا۔ آپ نے دوستوں عزیزوں کے بارہ میں نہایت دیانتداری سے سیدھے سادھے الفاظ میں تبصرہ کیا ہے۔ بہت سے حضرات سے میری بھی شناسائی رہی ہے اور میں ملک صاحب کی گہری نظر اور مردم شناسی کی درخشاں مثال ہے۔ حالی نے شاید ملک صاحب کے لیے یہ پیارا شعر کہا تھا:

نہال اس گلستاں میں جتنے بڑھے ہیں
ہمیشہ وہ نیچے سے اوپر چڑھے ہیں

آپ کی زندگی کا سفر مسلسل محنت اور جدوجہد کی درخشاں کہانی ہے۔ آپ نے ایک طویل دلچسپ سفر کو بند کر کے ایک دریا کو تاریخ کے ایک کوزے میں بند کر دیا ہے۔ آپ کا پبلشنگ ادارہ ''مقبول اکیڈمی'' ایک اہم قومی ادارہ بن گیا ہے۔ جس کی زندہ مثال اس ادارہ کی گیارہ سو سے زیادہ شائع کردہ مطبوعات ہیں۔

مجھے بے حد خوشی ہے کہ ملک مقبول احمد صاحب نے اپنا فن، علم اور تجربہ اپنی اگلی نسل کو منتقل کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس شمع کو ہمیشہ ہمیشہ روشن رکھے اور پاکستانی عوام کے لیے مشعلِ راہ بنائے رکھے۔ (آمین)

Marfat.com

Marfat.com

انٹرویوز

Marfat.com

Marfat.com

ماہنامہ کتاب

محمد بدر منیر

مئی 1968ء

آپ نے نشر و اشاعت کا کاروبار کیوں شروع کیا؟
اس کے علاوہ کوئی اور کاروبار آپ کو پسند نہیں آیا، اگر نہیں تو کیوں؟
آپ کی کون سی کتاب سب سے زیادہ فروخت ہوئی؟
آپ کی ایسی کتابوں کی تعداد کتنی ہے جن کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے؟
اب تک آپ کتنی کتابیں شائع کر چکے ہیں؟
مسودہ منتخب کرتے وقت آپ کن اُمور کو مدِ نظر رکھتے ہیں؟
آپ کے ادارے کی سب سے پہلی کتاب کونسی ہے؟
ناشرین اور خاص طور پر غیر درسی کتابوں کے ناشرین کا سب سے اہم مسئلہ کیا ہے؟

مندرجہ بالا سوالات میں سب سے پہلا سوال جب میں نے ملک مقبول احمد سے کیا تو انہوں نے اس کے جواب میں نشر و اشاعت سے اپنی دلچسپی کی ایک طویل داستان سنائی جو دلچسپ بھی ہے اور کسی حد تک سنسنی خیز بھی، سنسنی خیز اس لحاظ سے کہ انہوں نے اس نشر و اشاعت کی دنیا میں ابتدائی طور پر زبردست ناکامی کا سامنا کیا لیکن ہمت ہارنے اور کتابی دُنیا کو بُرا بھلا کہنے کی بجائے انہوں نے اپنے منصوبے پر نظر ثانی کی اور صبر اور حوصلے کے ساتھ ''کتابی دُنیا'' میں نمایاں مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ابتداء میں انہوں نے ایک ہفت روزہ رسالہ ''چودھویں صدی'' کے نام سے لاہور ہی سے شائع کرنا

Marfat.com

شروع کیا اور اسی نام سے ایک مکتبہ بھی قائم کیا۔اس مکتبہ کے زیر اہتمام فنی کتابیں شائع کی گئیں لیکن وہ تمام کتابیں دکانوں کے شوکیس میں سجائے جانے کے باوجود زیادہ تعداد میں فروخت نہ ہوسکیں اور نتیجہ کے طور پر انہیں ردی فروش کے حوالے کرنا پڑا۔کوئی اور ہوتا تو وہ ہمت ہار کر بیٹھ جاتا اور ہمیشہ کے ملئے اس کاروبار کو الوداع کہہ دیتا لیکن مقبول احمد نے جو شعوری طور پر اور ایک مقصد کے تحت اس کاروبار میں شامل ہوئے تھے۔نشرواشاعت کے بارے میں اپنے منصوبے پر نظر ثانی کردہ پروگرام کے مطابق 1959ء میں ''مقبول اکیڈمی'' کا قیام عمل میں لایا۔لیکن اس اکیڈمی کے قیام کے لئے انہیں مکتبہ چودھویں صدی، رسالہ چودھوی صدی اور پریس کی قربانی دینی پڑی تب کہیں جا کر ''مقبول اکیڈمی'' کا بورڈ آویزاں کیا جاسکا۔

مقبول اکیڈمی کا کام ہزاروں روپے سے شروع کیا گیا اس کے بعد اس ادارے پر جو سرمایہ لگایا گیا وہ اس بنیادی سرمایہ کے علاوہ ہے۔مقبول اکیڈمی نے رئیس احمد جعفری کی کتاب '' آزادی ہند'' سے اپنے '' کتابی سفر'' کا آغاز کیا۔یہ کتاب جناب ابوالکلام آزاد کی کتاب INDIA WINS FREEDOM کے جواب میں لکھی گئی اور یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ ایک ماہ کے اندر اندر ہی اس کے تین ایڈیشن شائع کیے گئے، ان میں پہلا ایڈیشن اکیس سو کی تعداد میں شائع ہوا جبکہ بقیہ دو ایڈیشن گیارہ گیارہ سو کی تعداد میں چھاپے گئے، اُردو میں بہت کم ایسی کتابیں ہیں جنہیں اتنی مقبولیت حاصل ہوئی ہو۔اس کتاب کے آرڈر ٹیلیگرام کے ذریعے آتے رہے۔اس کتاب کی غیر معمولی کامیابی نے ان کے حوصلے بڑھا دیئے اور یہ ظاہر ہوگیا کہ ملک مقبول احمد نے جو نیا منصوبہ بنایا تھا وہ کامیاب ہے اور کامیاب رہے گا۔

مقبولیت اور اشاعت کے لحاظ سے '' آزادی ہند'' کے بعد اکیڈمی کی شائع کردہ

Marfat.com

کتاب ''رن کچھ سے چونڈہ تک'' کی باری آتی ہے۔ یہ کتاب کوہستان کے جنگی وقائع نگار جناب خالد محمود کی تصنیف ہے اور ایک ماہ کے اندر ہی اس کے دو ایڈیشن شائع کیے گئے۔ اس کتاب کو لکھوانے اور پھر اسے شائع کرنے کی جو کہانی ملک مقبول احمد صاحب نے سنائی اس کہانی سے ہی یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ کتاب کی اشاعت کے لئے کتنی جتن کرتے ہیں اور ''موضوع'' اور اس موضوع پر لکھنے والے صحیح مصنف کی تلاش کے لئے اس سے بھی زیادہ جتن کرتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ یہ کتاب لکھوانے کے لئے فاضل مصنف نے 1965ء میں رجوع کیا تھا اور پھر کم وبیش ڈیڑھ سال کی تگ و دو کے بعد مصنف نے کتاب کا مسودہ مکمل کر کے ناشر کے حوالے کیا۔ اس دوران میں اکیڈمی نے مصنف کے ساتھ ہر ممکن تعاون کیا، چنانچہ دسمبر 1967ء میں یہ کتاب منظر اشاعت پر آئی تو اسے اتنی شاندار کامیابی حاصل ہوئی کہ مصنف اور ناشر کی تھکاوٹ دُور ہو گئی اور یہ کامیابی کیا کم ہے کہ ایک ماہ میں ہی ایک ایسے موضوع کی کتاب کے دو ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گئے جس موضوع پر بیسیوں کتابیں منظر عام پر آ چکی تھیں اور جب ''رن کچھ سے چونڈہ تک'' شائع ہوئی تو اس وقت وہ جذباتی ماحول بھی کسی حد تک بدل چکا تھا جس نے 65ء اور 66ء کے دوران شائع ہونے والی جنگی کتابوں کو مقبول ومعروف کیا تھا۔

مقبول اکیڈمی نے ایک اور مفروضہ بھی غلط ثابت کر دکھایا کہ تاریخی وتحقیقی کتب کی مارکیٹ نہیں۔ انہوں نے سیّد علی بلگرامی کی شہرہ آفاق تصنیف ''تمدن عرب'' شائع کی۔ اس کتاب کی طباعت واشاعت کے سلسلے میں بڑی دشواریاں پیش آئیں۔ اگر یہ کہا جائے تو درست ہوگا کہ اس کتاب پر جو طباعتی واشاعتی لاگت آئی وہ دوسری کتابوں کی لاگت سے بہت زیادہ تھی لیکن یہ ضخیم اور ٹھوس کتاب اتنی فروخت ہوئی کہ اس کے دو ایڈیشن فروخت ہو چکے ہیں اور ان دنوں تیسرا ایڈیشن زیر فروخت ہے۔

Marfat.com

مقبول اکیڈمی کے زیر اہتمام اب تک دو سو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس طرح کتابوں کی اشاعت کا سالانہ اوسط بائیس ہے۔ اور ان میں ہر موضوع کی کتابیں شامل ہیں۔ ان کتابوں میں تمدن ہند، عبرت نامہ اندلس، سیرت ابن ہشام اور قائد اعظمؒ کے بارے میں متعدد کتابیں قابل ذکر ہیں۔ یہ وہ کتابیں ہیں جنہیں مستقل اہمیت حاصل ہے اور رہے گی۔ قائد اعظم، پاکستان اور عالم اسلام کے بارے میں تحقیقی و تخلیقی کتابوں کی اشاعت ادارے کا مشن ہے چنانچہ ادارے کی مطبوعات کی فہرست پر طائرانہ نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ ادارہ اپنے مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں ہمہ تن مصروف ہے۔

مقبول اکیڈمی کے زیر اہتمام دو سو کتابیں شائع کی جا چکی ہیں ان میں سے ایک سو کتابیں ایسی ہیں جنہیں محکمہ تعلیم نے تعلیمی اداروں کی لائبریریوں کے لئے منظور کر لیا ہے۔ 1965ء میں سیکرٹری تعلیمات نے منظور شدہ کتابوں کو جو فہرست شائع کی تھی اس میں اکیڈمی کی تقریباً ایک سو کتابوں کے نام درج ہیں اور اس طرح مذکورہ فہرست میں تعداد کتب کے لحاظ سے اکیڈمی کا نمبر دوسرا تھا۔ اس سے اکیڈمی کی مطبوعات کے معیار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مطبوعات کے معیار کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اکیڈمی نے اب تک جتنی کتابیں بھی چھاپی ہیں چند کتابوں کے سوا سب کے متعدد ایڈیشن شائع کئے جا چکے ہیں اور بعض کتابیں تو ایسی بھی ہیں جن کے پانچ ایڈیشن چھپ چکے ہیں اور ہنوز ان کی مانگ برقرار ہے۔

ناشرین کے مسائل

کاغذ کی ہوش ربا گرانی ایک مسئلہ ہے جو درسی و غیر درسی کتابوں کے ناشرین کے لئے مشترکہ درد سر کی حیثیت رکھتا ہے۔ کاغذ کی قیمتیں ۱۹۴۷ء کے مقابلے

Marfat.com

میں پانچ گناہ سے بھی زیادہ بڑھ چکی ہیں۔ اس کے نتیجے میں کتابوں کی قیمت میں اضافہ ناگزیر ہے۔

ایک مسئلہ ___ جس کی سنگینی سے صرف غیر درسی کتابوں کے ناشرین ہی دو چار ہیں۔ یہ مسئلہ ہے لائبریریوں میں غیر درسی کتابوں کی خریداری کا پیچیدہ فارمولا اس فارمولے کے تحت پہلے تو سیکرٹری تعلیمات کتابوں کو منظور کرتے ہیں اور پھر ان منظور شدہ کتابوں کی فہرست تمام تعلیمی اداروں کو بھیجی جاتی ہیں۔ تعلیمی ادارے اپنے متعلقہ ڈائریکٹر تعلیمات سے پھر ان کتابوں کی خریداری کے لئے منظور حاصل کرتے ہیں۔ اس کے بعد اس فارمولے کی کئی شاخیں ہو جاتی ہیں، بعض جگہ تو یہ طریقہ ہے کہ تعلیمی ادارے فرنیچر اور دوسرے سامانوں کی طرح کتابوں کی خریداری کا مسئلہ بھی ڈائریکٹر صنعت کے پاس بھیجتے ہیں اور پھر کہیں جا کر کتابوں کی خریداری کا مرحلہ پیش آتا ہے لیکن اس میں بھی کئی محکمانہ قسم کی پیچیدگیاں ہیں۔ اس فارمولے کی دوسری شاخ یہ ہے کہ بعض مقامات پر یہ طریقہ رائج ہے کہ دو سو روپے سے کم مالیت کی کتابیں تعلیمی ادارے براہ راست ناشرین سے خریدتے ہیں بعض مقامات پر ڈائریکٹر صنعت سے رجوع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی، الغرض غیر درسی کتابوں کی خریداری ایک عجیب گورکھ دھندا بن چکی ہے۔

غیر درسی کتابوں کی خریداری کا سب سے بڑا ذریعہ تعلیمی اداروں کی لائبریریاں ہیں لیکن ان لائبریریوں میں کتابوں کی خریداری جس طرح ایک مسئلہ بنا دی گئی ہے اس کی تفصیل اُوپر دی جا چکی ہے۔ اگر محکمہ اس پیچیدہ فارمولے کو ترک کر کے تعلیمی اداروں کو سیکرٹری تعلیمات کی منظوری کے بعد ہی فوری طور پر ناشرین سے براہ راست منظور شدہ کتابوں کی خریداری کی اجازت دے دے تو اس سے محکمہ کو غیر

Marfat.com

ضروری دردسری سے نجات مل جائے گی اور اس کے ساتھ ہی تعلیمی اداروں اور ناشرین کو بھی آسانی ہوگی۔ تعلیمی ادارے اس کے لئے طول طویل فارمولے کی جگہ آسان فارمولا رائج کر دیا جائے تو تعلیمی ادارے آسانی سے کتب خرید سکیں گے۔ ملک مقبول احمد صاحب نے مصنفین، ناشرین اور قارئین کے درمیان مؤثر و مثبت رابطہ قائم کرنے کے سلسلے میں قومی کتاب مرکز پاکستان کی خدمات کو سراہا اور کہا کہ مرکز کی وجہ سے فروغ کتب میں بڑی مدد ملی ہے اور اس کے ساتھ ہی ناشرین، مصنفین اور قارئین کے درمیان رابطے کو استوار کرنے کی اہمیت شدت سے محسوس کی جارہی ہے۔ ملک صاحب نے پاکستان میں ''کتابی دنیا'' کے مستقبل کو شاندار قرار دیا، ملک صاحب کا کہنا ہے کہ پاکستان میں تعلیم کی شرح مسلسل بڑھتی جارہی ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اس سے فروغ کتب میں مدد نہ ملے۔ البتہ اس بات کی ضرورت ہے کہ نئی نسل کو جو تعلیم سے بہرہ ور ہورہی ہے اسے مطالعہ کتب کی اہمیت کا احساس دلایا جائے، اگرچہ ناشرین اپنے محدود وسائل کے مطابق کام کر رہے ہیں اور قومی کتاب مرکز بھی بطریق احسن اس اہم ذمہ داری کو انجام دینے میں مصروف ہے چنانچہ ''کتاب میلہ'' کو اس سلسلے میں ایک اہم سنگ میل لگانے کی ضرورت ہے۔ ایک ایک بچے کے ہاتھوں میں کتاب پہنچانے کی ضرورت ہے جو کتابیں پڑھ سکتا ہو تاکہ نئی نسل کو ابھی سے کتابوں کے مطالعہ کی عادت پڑ جائے۔

Marfat.com

ہفت روزہ فیملی سے انٹرویو

ملاقات.........عثمانی

انہوں نے دیہاتی ماحول میں آنکھ کھولی، آبائی پیشہ زمینداری تھا، اس لیے رشتہ داروں کی اکثریت زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھی۔ ان حالات میں کہ جب دور دور تک شمع علم نظر نہ آتی تھی انہوں نے پڑھائی میں دل لگایا، مطالعے سے جی نہ چرایا اور اپنی لگن میں مگن رہے۔ تعلیم تو انہوں نے واجبی سی حاصل کی لیکن مطالعے کا شوق بے انتہا تھا۔ اسی شوق سے ان کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ کیوں نہ علم کے بکھرے ہوئے موتیوں کو پرو کر کتابی شکل دے کر تسبیح بنا دی جائے۔ شوق، محنت اور جہد مسلسل نے ان کی خواہش پوری کر دی اور اب ان کا شمار شعبہ طباعت کے چند بڑے ناموں میں ہوتا ہے۔ گزشتہ کئی سالوں سے وہ ہر موضوع پر نامور مصنفین سے لے کر نئے لکھنے والوں تک کی کتابیں چھاپ چکے ہیں۔ آپ نے صحیح پہچانا، اس وقت ذکر مقبول اکیڈمی کے بانی ملک مقبول احمد کا ہی کیا جا رہا ہے۔ ملک مقبول احمد نے گاؤں کے ماحول میں ہوتے ہوئے بھی طباعت کے شعبے میں بڑا نام کمایا، شاید اسی لیے انہیں گدڑی کا لعل بھی کہا جا سکتا ہے۔ گزشتہ دنوں ان سے شعبہ طباعت کے اس پیشے کی مشکلات کے بارے میں جو گفتگو ہوئی وہ درج ذیل ہے۔

> کتابیں چھپتی زیادہ ہیں بکتی کم ہیں

☆ مقبول صاحب آپ نے پیشہ طباعت کب اور کیوں اپنایا، کیا خاندان میں پہلے بھی کوئی

Marfat.com

صاحب یہ کام کرتے تھے؟

☆ خاندان میں کوئی شخص بھی یہ کام نہیں کرتا تھا۔ سب لوگ زمینداری کرتے تھے۔ والد

لوگوں میں مطالعے کا ذوق نہیں رہا

صاحب پولیس میں ملازم تھے۔ میں نے کتابوں کی پبلشنگ کا کام 1954ء میں شروع
کیا۔ شوق تھا کہ کوئی رسالہ شائع کروں۔ اس لیے ہفت روزہ "چودھویں صدی" نکال
شروع کیا۔ یہ میگزین دو ڈھائی سال تک چھپتا رہا۔ بعدازاں مالی مشکلات کی بنا پر اسے
بند کرنا پڑا۔ مطالعے کے شوق کی بنا پر یہ کام شروع کیا تھا۔ کسی سے متاثر ہو کر نہیں۔
1957ء میں "مقبول اکیڈمی" کے نام سے باقاعدہ کام شروع کیا۔

☆ لکھنے کا بھی شوق ہے یا صرف کتابیں چھاپنے کی حد تک ہی سلسلہ جاری ہے۔

☆ لکھنے کا شوق نہیں ہے صرف پبلشنگ کی حد تک ہی کام کیا ہے۔

☆ کافی عرصہ سے آپ اس شعبے میں کام کر رہے ہیں۔ اس سارے عرصے کے دوران آپ
کو کیا مشکلات پیش آئیں اور ماضی کے مقابلے میں اب کیا تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔

☆ جب میں نے کام شروع کیا تو کاغذ کتابت اور مصنفین کا مسئلہ پیش آیا۔ اب تو خدا کا شکر
ہے کہ پوزیشن بہت اچھی ہے۔ مقبول اکیڈمی کے نام سے باقاعدہ کام کا آغاز کیا تو اس
وقت مشرقی پاکستان سے کاغذ آتا تھا 23x36 سائز کے رم کی قیمت 23 روپے تھی۔
اب 650 روپے تک پہنچ چکی ہے۔ اسی لحاظ سے کتابوں کی قیمتیں بھی آسمان تک پہنچ

جو لوگ کتاب پڑھنا چاہتے ہیں ان کی جیب اجازت نہیں دیتی

ہیں۔ میری تو خواہش ہے کہ سستی اور معیاری کتابیں لوگوں کو دیں۔ لیکن مجبوری ہے
کاغذ بہت مہنگا ہے ماضی کے مقابلے میں کاغذ کی قیمت میں اب 30 گنا فرق پڑ چکا ہے

Marfat.com

مثلاً اس دور میں جس کتاب کی قیمت طباعت کے بعد دس روپے ہوتی تھی، اب وہ اتنے سستے داموں میں دستیاب نہیں ہے۔ اب وہی کتاب 250 سے 300 روپے تک قیمت رکھتی ہے۔ اگر اتنی قیمت مقرر نہ کریں تو اخراجات پورے نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ اب سستی کتاب ملنا بہت مشکل ہے۔ حکومت کی طرف سے بھی کوئی مدد نہیں ملتی۔ کاغذ کے علاوہ دیگر دوسری چیزوں کی قیمتیں بھی بہت بڑھی ہیں۔

1957-58ء میں کم از کم ایک ہزار تعداد تک کتاب چھپتی تھی، اب بڑی مشکل ہے ہم ایک ہزار کتاب چھاپتے ہیں۔ اس وقت کتابیں زیادہ بکتی تھیں اب صورتحال یہ ہے کہ کتابیں فروخت کم ہوتی ہیں اور چھپ زیادہ رہی ہیں۔

☆ اس کی وجہ کیا ہے؟

لائبریریوں میں کتابوں کے لیے بجٹ نہیں ہوتا

ایک لائبریری جہاں 15 برس میں 5 کتابیں آئیں

☆ وجہ یہ ہے کہ پہلے لائبریریوں کو حکومت بہت زیادہ گرانٹ دیتی تھی اب یہ گرانٹ بہت کم ہو گئی ہے۔ ایل ڈی اے اور واسا کی لائبریریوں میں کتاب تک موجود نہیں ان حالات میں کیا ہوگا؟ ضرورت اس امر کی ہے کہ تمام بڑے محکمے اپنے دفاتر میں لائبریریاں قائم کریں۔ ان کے پاس بجٹ بھی ہوتا ہے اگر یہ فنڈز دیں اور اچھی کتابیں سلیکٹ کر کے خریدیں تو لوگوں کو فائدہ ہوگا۔ بہت سے لوگ ابھی بھی مطالعے کا شوق رکھتے ہیں۔ مسئلہ یہی ہے کہ وہ زیادہ قیمت افورڈ نہیں کر سکتے۔ اگر لائبریریاں ہوں گی تو وہ اپنے اس شوق کو پورا کر سکیں گے۔

☆ لوگوں کو مطالعے کا ذوق کیوں نہیں ہے؟

☆ میرے خیال میں مالی حالات، پریشانیاں مہنگائی ایسی وجوہات ہیں کہ جن کی بنا پر مطالعے

Marfat.com

بچوں کو پڑھنے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ لائبریری میں کتاب ہوتی ہے لیکن ایشو نہیں کی جاتی۔ بچے بڑے ہوتے ہیں تو مسائل اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ پڑھنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ چند صاحب ذوق لوگ ہیں جو لائبریریوں سے کتابیں لے کر پڑھ لیتے ہیں۔ لائبریریوں کی کیفیت یہ ہے کہ وہاں کتاب کی اہمیت کا احساس نہیں رہا۔ دنیا جہان کے اخراجات کرتے ہیں لیکن کتاب کا مسئلہ آتے ہی بجٹ کم ہونے کا رونا روتے ہیں۔ جبکہ بیرون ممالک تو ایک کتاب ہزاروں میں نہیں بلکہ لاکھوں میں چھپتی ہے۔

☆ کیا آپ کے خیال میں پرانے وقتوں میں مطالعہ کتب زیادہ تھا۔ اس کی وجہ کیا تھی؟

☆ ان دنوں کلاس لائبریری کا سسٹم ہوتا تھا۔ وہ سسٹم یہ ہوتا تھا کہ بچوں کی پسند کی کتابیں کافی تعداد میں خرید لی جاتی تھیں۔ اساتذہ کلاس میں بچوں کے اندر یہ کتابیں تقسیم کر دیتے تھے۔ ہر بچہ وہ کتاب پڑھتا تھا جس سے ان میں مطالعے کا شوق بڑھتا تھا۔ تین چار روز بعد اساتذہ ان کتابوں کے بارے میں بچوں سے سوالات کرتے تھے۔ اس لیے یہ شوق بڑھتا رہتا تھا۔ اب یہ سسٹم ختم ہو گیا ہے اگر دوبارہ اسے اپنایا جائے تو مطالعہ کا ذوق وشوق بڑھ سکتا ہے۔

اب ایک بڑی قباحت اور دیکھنے میں آتی ہے، وہ یہ کہ محکمہ تعلیم والے جو کتابیں خریدتے ہیں وہ الماریوں میں بند کر دی جاتی ہیں۔ طالب علموں کو ایشو نہیں کی جاتیں۔ اگر کہا جائے کہ بچوں کو کتابیں دیں تا کہ وہ پڑھیں تو کہا جاتا ہے کہ وہ کتابیں پھاڑ دیتے ہیں یا گم کر دیتے ہیں۔ جس کے ہمیں اپنے پلے سے پیسے بھرنے پڑتے ہیں۔ ہونا یہ چاہیے کہ کتابوں کی شرح مقرر

سفرنامے سب سے زیادہ پڑھے جاتے ہیں

کر دی جائے اور اتنی سہولت دی جائے کہ کتاب گم ہونے کی صورت میں بجٹ سے نقصان پورا کر دیا جائے۔ اگر یہ سہولت ہو گی تو لائبریرین اور استاد بچوں کو کتابیں ایشو کریں گے۔ چند دن پہلے

Marfat.com

دیا جائے۔ اگر یہ سہولت ہو گی تو لائبریرین اور استاد بچوں کو کتابیں ایشو کریں گے۔ چند دن پہلے میرے پاس ایک استاد آئے، شکوہ کر رہے تھے کہ انچارج لائبریری انہیں بھی کتاب پڑھنے کے لیے نہیں دیتے۔ جہاں یہ صورتحال ہو کہ استاد کو بھی علم میں اضافے کے لیے کتاب پڑھنے کی اجازت نہ ہو تو وہاں بچے کیا پڑھیں گے۔

ایک لائبریری جس کے پاس کوئی کتاب نہیں

لاہور (نمائندہ خصوصی) لاہور ڈویلپمنٹ اتھارٹی (ایل ڈی اے) کی لائبریری کے لیے گزشتہ 15 برسوں کے دوران 501 روپے مالیت کی صرف 9 کتابیں خریدی گئیں ہیں جبکہ واسا کی لائبریری کے لیے گزشتہ 15 برسوں میں کوئی کتاب نہیں خریدی گئی یہ بات وزیر ہاؤسنگ و فزیکل پلاننگ چودھری نذیر احمد نے گزشتہ روز پنجاب اسمبلی میں وقفہ سوالات کے دوران قائد حزب اختلاف رانا اکرام ربانی کے ایک سوال کے جواب میں بتائی۔ اس بارے میں ایک ضمنی سوال کا جواب دیتے ہوئے چودھری نذیر احمد نے کہا کہ وہ مذکورہ لائبریریوں میں کتب کی تعداد سے مطمئن ہیں۔ انہوں نے کہا کہ صوبہ بھر میں محکمہ ہاؤسنگ فزیکل پلاننگ کے تحت کل 10 لائبریریاں ہیں اور فی الحال ان کا مزید لائبریریاں قائم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔

”محکمہ تعلیم کے پاس بجٹ کم ہے بچوں پر کتابوں کا بوجھ ہے“

ایک اور مشکل بستے کا بوجھ بھی ہے۔ دوسری جماعت کے بچے پر کتابوں کا اتنا بوجھ ڈال دیا جاتا ہے کہ وہ اسے اٹھا نہیں سکتا۔ اب وہ بچے کورس کی کتابیں پڑھیں یا لائبریری سے استفادہ کریں۔ میرے خیال میں بستے کا بوجھ بلاوجہ ہے۔ علاوہ ازیں نظام تعلیم کی خرابی کی وجہ سے تعلیم کا کوئی مقصد نہیں رہا۔ صرف ڈگری کے حصول کے لیے نوجوان تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

اب اگر کوئی کتاب چھپتی ہے تو اس کی تشہیر بھی بہت مشکل کام ہے۔ پہلے تو اخبار والے

Marfat.com

پبلشر کو اچھی خاصی رعایت دیتے تھے لیکن اب یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا ہے۔ لوگوں کو اچھی کتابوں کے بارے میں علم ہی نہیں ہوتا تو وہ پڑھیں گے کیا؟

☆ ......لوگ آج کل کیسی کتابیں پڑھنا پسند کرتے ہیں؟

☆ ......''سفرنامے،، سب سے زیادہ پسند کئے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس میں کہانی کا پہلو بھی ہوتا ہے اور بیٹھے بٹھائے پردیس کی سیر بھی ہو جاتی ہے۔ ناول بھی پسند کئے جاتے ہیں۔ شاعری کی کوئی کتاب بہت کم پسند کی جاتی ہے۔ پرانے مشہور شاعروں کے مجموعہ کلام زیادہ پسند کئے جاتے ہیں۔ نوجوان شاعر شوق کی بنا پر اپنی کتابیں چھپواتے ہیں لیکن وہ بکتی نہیں ہیں۔ صرف شوق ہی پورا ہوتا ہے۔

☆ کتابیں خریدنے والے نہیں ہیں تو پھر آپ کیوں کتابوں پر کتابیں چھاپے جا رہے ہیں؟

میں نے اپنے بچوں کو زبردستی ''ڈاکٹری'' پڑھائی تھی مگر

☆ اگر ہم کتابیں چھاپنا بند کر دیں تو کاروبار ختم ہو جائے۔ یہ تو ہمارا ذوق ہے اور اگر یہ پورا نہ ہو تو ہم زندہ نہیں رہ سکتے۔ اچھی اور معیاری کتاب چھاپ کر ہمیں خوشی اور سکون حاصل ہوتا ہے۔

عام شکایت ہے کہ رائٹر کو پیسے نہیں ملتے جبکہ پبلشر خوشحال ہوتے جا رہے ہیں۔ کیا یہ تاثر درست ہے یا یہ واقعی منافع بخش کاروبار نہیں ہے۔

☆ یہ کاروبار منافع بخش ہے اور مارجن کی شرح بھی کافی ہے۔ رائٹر کو پیسے نہیں ملتے یہ درست نہیں ہے۔ ایک کتاب پر ہم زندہ نہیں رہ سکتے۔ اور اس طرح ایک ورائٹی بن جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے سرکولیشن بن جاتی ہے۔ مصنف سمجھتا ہے کہ پبلشر شاید میری کتاب پر زندہ ہے۔ حالانکہ یہ تو بزنس ہے کوئی کتاب بہت زیادہ بکتی ہے اور کوئی بالکل بھی نہیں بکتی۔ اس لیے ہم کسی پر انحصار نہیں کر سکتے۔ ادبی کتابوں کے علاوہ ہم ٹیکسٹ بک بورڈ کے لیے بھی چھپائی کا کام کرتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی پبلشر کہے کہ میں صرف ادبی کتابیں چھاپوں اور زندہ رہوں تو ایسا شاذ و نادر

Marfat.com

ہی ہوتا ہے۔مطالعے کے حوالے سے عوام کا ذوق بھی بہت کم ہے۔بیرون ممالک میں تو میں نے دیکھا ہے کہ بس اور ٹرین میں بیٹھے بیٹھے بھی لوگ کتاب اور رسالہ پڑھتے رہتے ہیں۔پھر یہاں عام آدمی کی قوت خرید بھی نہیں ہے۔لیکن اگر ذوق ہو تو وہ یہی کتاب لائبریری سے بھی لے کر پڑھ سکتا ہے۔

☆ مطالعے کے ذوق میں اضافے کے لیے آپ کے پاس کیا تجاویز ہیں؟

☆ ''نیشنل بک کونسل،، نے اچھا کام کیا تھا۔یہ لوگ 50 فیصد ڈسکاؤنٹ پر اپنے ممبران کو کتابیں فروخت کرتے تھے۔اب یہ سلسلہ ماہ جون سے ابھی تک بند ہے اور بہانہ یہ ہے کہ فنڈز نہیں ہیں۔میرے خیال میں اسے دوبارہ شروع کیا جائے۔لوگوں کا دل کتاب پڑھنے کو چاہتا ہے۔لیکن جیب اجازت نہیں دیتی۔ بستے کا بوجھ کم کریں۔لائبریریاں کتابیں ایشو کریں کلاس لائبریری بنائی جائے تو نئی نسل میں مطالعے کا ذوق وشوق پیدا ہو سکتا ہے۔

☆ ملک صاحب کیا آپ کے بچے بھی اسی پیشے کو اپنائے ہوئے ہیں؟

☆ میرے تین بچے ہیں۔دو لڑکے اور ایک لڑکی اور تینوں ماشاءاللہ ڈاکٹر ہیں۔ایک بیٹا ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ میں ملازم ہو گیا تھا دوسرے نے کلینک بنایا اور چھوڑ دیا۔موقف یہ اپنایا کہ علم و ادب کی خدمت کریں گے۔میں نے بہت کوشش کی کہ وہ اس شعبے میں نہ آئیں لیکن وہ نہ مانے اور اب میرے ساتھ ہی طباعت کا کام کرتے ہیں۔

☆ آپ نے زبردستی پڑھایا تھا؟

☆ جی میں نے انہیں زبردستی ڈاکٹری پڑھنے پر مجبور کیا تھا۔

☆ آپ کو کس ادیب نے متاثر کیا؟

☆ سب سے تعلقات اچھے ہیں سید رئیس احمد جعفری مرحوم بہت اچھے دوست تھے اور ان سے بڑے اچھے تعلقات تھے۔میں نے ان کی کئی کتابیں چھاپیں۔ان کی پہلی کتاب

Marfat.com

''آزادی ہند،، چھاپی تھی۔ جس کے ایک ماہ میں تین ایڈیشن فروخت ہو گئے۔

☆ کسی ادیب کے ساتھ گزرا ہوا دلچسپ واقعہ جو کبھی نہ بھولتا ہو؟

☆ سید رئیس احمد جعفری مرحوم کے بارے میں ہی ہے ہم ان سے کتاب لکھوا رہے تھے۔ اس لیے ان کے پاس جاتے کہ ہمارا کاتب فارغ بیٹھا ہے تو آپ نے جو مسودہ لکھا ہے وہ دے دیں تاکہ وہ اس کی کتابت کر دے۔ جعفری صاحب ہمیں وقت دے دیتے کہ ٹھیک ہے آپ شام کو آ کر لے لیجئے گا۔ شام کے وقت جب ہم ان کے پاس جاتے تو وہ چائے منگوا لیتے اور اسی وقت ہماری موجودگی میں کئی صفحات لکھ ڈالتے۔ مجھے آج تک یہ بات نہیں بھولتی کہ کس طرح وہ صرف چند منٹوں میں کئی صفحات لکھ ڈالتے تھے۔ سید رئیس احمد جعفری صاحب بہت اچھے لکھنے والے تھے اور ہر موضوع پر انہوں نے طبع آزمائی کی۔ ان کا حافظہ بلا کا تیز تھا، اور جس کی وجہ سے وہ بغیر تیاری کے مختصر وقت میں بہت کچھ لکھ ڈالتے تھے۔

☆☆..........☆..........☆☆

Marfat.com

روزنامہ ''دن'' سے انٹرویو

ملک مقبول

غیر معیاری کتابیں چھاپنے والوں کیخلاف حکومتی سطح پر کارروائی ہونی چاہیے

اخلاق باختہ اور غیر معیاری کتابیں چھاپنے والوں کے خلاف حکومتی سطح پر کاروائی کی جانی چاہیے۔

ان خیالات کا اظہار معروف پبلشر مقبول اکیڈمی کے سربراہ ملک مقبول احمد نے ''دن'' کو خصوصی انٹرویو دیتے ہوئے کیا۔ ملک مقبول پاکستان کے ان سینئر پبلشرز میں سے ہیں جنہوں نے پاکستان بننے کے وقت سے لے کر آج تک عوام کو بہترین اور معیاری کتابیں دی ہیں۔

ملک مقبول کے دونوں بیٹے اور ایک بیٹی جو کہ ڈاکٹر ہیں، لیکن وہ بھی اسی پروفیشن

Marfat.com

میں کام کر رہے ہیں اور میڈیکل کی کتابوں کو امپورٹ بھی کرتے ہیں۔ ملک مقبول نے بتایا کہ مجھے شروع سے ہی کتابوں سے رغبت تھی۔

پہلے ہمارے ادارے نے ٹیکنیکل موضوعات پر کتابیں شائع کیں، گھریلو صنعتوں پر مبنی کتابیں شائع کیں۔ احسان دانش کی زیرِ ادارت ''14ویں صدی'' کے نام سے ادبی رسالہ بھی شائع کیا۔ انہوں نے کہا کہ ہماری سب سے زیادہ بکنے والی کتابوں میں مولانا ابوالکلام کی '' آزادی ہند'' سرِفہرست ہے۔ ہمارا ادارہ ہزار سے زائد مختلف موضوعات پر کتابیں شائع کر چکا ہے۔

انہوں کہا کہ یہ کہنا غلط ہے کہ کتابیں مہنگی ہونے کی وجہ سے مطالعہ میں کمی واقع ہوئی ہے۔ جب لوگ ایک برگر کھانے کے لیے کئی سو روپے خرچ کر سکتے ہیں تو اچھی کتاب کیوں نہیں خرید سکتے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ لوگوں کی ترجیحات بدل گئی ہیں۔ پہلے کتابوں کے خریدار زیادہ تھے کتابیں کم تھیں آج کتابیں زیادہ ہیں اور خریدار کم ہیں۔ ادبی کتابوں کا خریدار اب صرف نام کی حد تک رہ گیا ہے۔ اب لوگ یا تو ٹیکنیکل کتاب خریدتے ہیں یا پھر اسلامی یا ایڈونچر ادب پر مبنی کتاب کی مانگ کرتے ہیں۔ کاغذ، سیاہی، گتہ کی قیمتیں آسمانوں سے باتیں کر رہی ہیں۔ اس وجہ سے کتاب کو مہنگا کرنا پڑتا ہے۔

انہوں نے کہا کہ اردو بازار میں اس وقت ہر پبلشر اپنی مرضی کی قیمتوں کی کتابیں چھاپ رہا ہے۔ وہ بڑے سکولوں کے ساتھ معاہدے طے کر کے مرضی کی قیمتیں مقرر کرتے ہیں۔ انگریزی میڈیم کی کتابیں سب سے زیادہ مہنگی ہیں۔ مصنفین اور پبلشرز کے درمیان رائلٹی کے جھگڑے کے بارے میں انہوں نے کہا کہ ہم اور آپ جس معاشرے میں رہ رہے ہیں یہاں ہر قسم کے لوگ موجود ہیں۔ اچھے بھی اور برے بھی اگر کسی شعبے کے سارے لوگ اچھے نہیں ہوتے تو شعبے کے سارے لوگ برے بھی نہیں ہوتے۔ پبلشر ایڈوانس رائلٹی دینے کے بعد کتاب کی تیاری مکمل کرتا ہے۔ لیکن وہی مصنف کسی اور پبلشر کو بھی اپنا مسودہ دے دیتا ہے۔ بڑے بڑے نام نہاد ادیب جو کہتے ہیں کہ پبلشرز رائلٹی نہیں دیتے وہ جھوٹ

Marfat.com

بولتے ہیں۔ کتاب اگر ہزار چھاپو اس میں سے سو دو سو کتاب فروخت ہوتی ہے۔ نئے رائٹر کو پبلشر نہیں چھاپتا اس لئے وہ خود پیسہ لگا کر کتابیں چھپوا لیتے ہیں، اس لئے کتابوں کا کوئی معیار ہی نہیں رہا۔ انہوں نے کہا کہ بھارت اور پاکستان کے پبلشرز دونوں ایک دوسرے کی اجازت کے بغیر کتابیں شائع کر رہے ہیں اس کے لیے حکومتی سطح پر کوئی معاہدہ ہونا چاہیے۔ ٹیکس سروے کے بارے میں انہوں نے کہا کہ ملکی مفاد کے پیش نظر سب کو ٹیکس دینا چاہیے لیکن ٹیکس فکس کر دینا چاہیے پھر ہر کوئی ٹیکس دے گا اس سے تاجر اور حکومت دونوں کو فائدہ ہوگا۔ انہوں نے کہا حکومت کو چاہیے کہ غیر معیاری اور اخلاق باختہ کتابیں شائع کرانے والوں کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرے۔

(روزنامہ ''دن'' لاہور)

☆☆ ☆ ☆☆

Marfat.com

انٹرویو: ماہنامہ ''سوئے حجاز'' لاہور (مارچ 2010ء)

پٹواری بننا پسند نہ کیا ٹیچر مقرر ہوا نوکری چھوڑ دی اپنا میگزین ''چودھویں صدی'' نکالا

اعوان خاندان کا فرد ہوں اقبال کے کلام اور میری ماں کی دُعاؤں نے کامیابی بخشی

حکومت کتابوں کی اشاعت پر خاص توجہ مرتکز کرے

اکثر لائبریریوں میں کتب خریدنے کے لئے بجٹ نہیں ہوتا

میں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی ادیب یا مصنف سے معاملہ شکنی نہیں کی البتہ مجھے کچھ قلمکاروں سے شکوہ ہے

سینکڑوں کتابوں کے ناشر اور مقبول اکیڈمی کے بانی

ملک مقبول احمد

کی باتیں

ملاقات: ملک محبوب الرسول قادری

ملک مقبول احمد......لاہور کے چند بڑے اَدبی ناشرین میں سرکردہ، پرانی قدروں کے امین، دیانت داری اور وقار کا استعارہ، سادگی میں اپنی مثال آپ، لٹریچر کی اشاعت کو مشنری جذبے سے جاری رکھنے والے ''رضا کار'' ہیں۔ وہ زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق رہے۔ محکمہ جنگلات اور محکمہ مال کو رشوت کے خوف سے جوائن نہ کر سکے۔ مدرس بنے مگر اَدبی میگزین نکالنے کا شوق اُنہیں دیوال (سیالکوٹ) سے لاہور لے آیا۔ ذہین دماغ نے ''پی آئی بی سی'' کمپنی کھولنے، پریس لگانے اور پھر مستقل اشاعتی ادارہ قائم کرنے کی طرف رہنمائی کی۔ گویا ۱۹۵۸ء میں اُنہوں نے کمرشل طباعتی ادارہ ''مقبول اکیڈمی'' قائم کیا جو اس وقت تک ایک ہزار سے زیادہ کتابیں بہت اعلیٰ معیار کے ساتھ شائع کر چکا ہے۔ سچائی اُن کی سب سے بڑی متاع ہے۔ کھری بات کرنا اور اُس پر ڈٹ جانا اُن کی زندگی بھر کا معمول ہے۔ گزشتہ دنوں ماہنامہ ''سوئے حجاز'' کے لیے اُن سے کیا جانے والا انٹرویو نذر قارئین ہے (ادارہ)

Marfat.com

س: اسم گرامی، ولدیت، ولادت، مقام ولادت؟

ج: میرا نام ملک مقبول احمد ہے، والد حاجی ملک لال دین تھے جو اعوان قبیلہ کی ایک اہم شخصیت تھے۔ میری ولادت ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں ''دیووال'' میں ہوئی جو جموں کشمیر کی سرحد پر واقع ہے میں اپنے بچپن میں اپنے گاؤں سے جموں کے برف پوش پہاڑ دیکھا کرتا تھا اور لطف اندوز ہوتا رہتا تھا۔ اُس زمانے میں اُن پہاڑیوں کو دیکھنا اور فضاؤں میں گھورنا مجھے بہت اچھا لگتا تھا میں سوچتا تھا کاش میں کوئی پرندہ ہوتا اور فضاؤں میں اڑتا۔ اس زمانے میں عجیب و غریب خیالات میرے دماغ میں جنم لیتے تھے۔

س: خاندانی پس منظر اور ابتدائی تعلیم، پھر اعلیٰ تعلیم یعنی جملہ تعلیمی مراحل کب، کہاں اور کیونکر طے ہوئے؟

ج: ہمارا خاندانی پیشہ کھیتی باڑی ہے البتہ میرے والد سرکاری ملازم تھے لیکن میری پرورش خالص دیہاتی ماحول میں ہوئی۔ میں نے اپنا بچپن بڑے بڑے کھیتوں اور ان کی پگڈنڈیوں سے گزر کر سکول آنے جانے میں گزارا۔ ہمارا گھر بہت کھلی فضا میں واقع تھا اور میں اپنے چوبارے پر بیٹھ کر خوب لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ سکول میں میرا شمار اچھے طلباء میں ہوتا تھا مگر سکول سے بھاگ جانا اور کھیل تماشے میرے روزمرہ کے معمول تھے۔ میرے چچا اور تایا اپنے گاؤں میں قدر اور عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ہمارے گھر کے صحن میں پینے کے پانی کے لئے ایک کنواں تھا جس سے گاؤں کی اکثر خواتین پینے کا پانی بھر کے لے جاتی تھیں۔ ابتدائی تعلیم میں نے لوئر مڈل سکول باجرہ گڑھی میں حاصل کی پھر ورنیکلر مڈل سکول رسول پور بھلیاں سے مڈل کیا۔ ۱۹۴۷ء میں پٹوار کا گوجرانوالہ میں داخلہ لیا مگر رشوت کے خلاف میری طبعی بغاوت نے مجھے فارسٹ ڈیپارٹمنٹ سے بھی دور رکھا رشوت سے نفرت کے سبب پٹواری نہ بن سکا۔ اسی زمانے میں میرے والد کے ایک

Marfat.com

دوست وزیرآباد میں متعین تھے وہ مجھے محکمہ جنگلات حکومت پنجاب میں ملازم کروانا چاہتے تھے اُن کا خیال تھا محکمہ جنگلات والوں کو تنخواہ کے علاوہ مختلف ذرائع سے آمدن ہو جاتی ہے لیکن رشوت کے خلاف میری طبعی بغاوت نے مجھے فارسٹ ڈیپارٹمنٹ سے بھی دور رکھا۔ آخر میں نے فارسی میں منشی فاضل کا امتحان دینے کی ٹھانی۔ میں تیاری کرنے لگا تو میرے گھرے دوستوں نے مجھے بار بار یہ شعر سنانا شروع کیا۔

پڑھے فارسی بیچے تیل دیکھو قدرت کے کھیل

لیکن میں نے اپنے دوستوں کی ایک نہ سنی اور فارسی پڑھتا رہا اگرچہ منشی فاضل کی سند تو نہ لے سکا مگر فارسی پر مجھے اچھی خاصی دسترس حاصل ہو گئی۔ پھر میں نے ایک روزنامہ اخبار میں گورنمنٹ نارمل سکول نارووال کا ایک اشتہار دیکھا جس میں داخلہ کے لئے میں نے درخواست بھیجی مجھے داخلہ مل گیا اور میں نے ۱۹۵۰ء میں جے وی ٹیچر کا کورس مکمل کر لیا اور پھر میری تقرری بطور اول مدرس (ہیڈ ماسٹر) گورنمنٹ پرائمری سکول موضع کلوے میں عمل میں آ گئی۔ اس وقت میرے اور میرے شاگردوں کی عمروں میں بہت تھوڑا فرق تھا۔ مجھے اپنا وہ زمانہ آج بھی اچھی طرح یاد ہے جب میں اپنے گاؤں سے دوسرے گاؤں میں پڑھانے کے لئے اپنی سائیکل پر جاتا تھا اور آتے جاتے ہوئے علامہ اقبال کے اشعار ترنم کے ساتھ پڑھتا تھا جب میری سائیکل چڑھائی کی طرف بڑھتی تو سائیکل کے پیڈلوں پر زور دیتے ہوئے اپنے آپ سے اقبال کے لہجے میں یوں مخاطب ہوتا۔

تو شاہیں ہے، پرواز ہے کام تیرا
تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں

س: آپ نے پندرہ روزہ ''چودھویں صدی'' کا منصوبہ کیسے بنایا؟

ج: غالباً ۱۹۵۰ء یا ۱۹۵۱ء کی بات ہے میں نے اپنے گاؤں ''دیووال'' اور اپنے

Marfat.com

سکول موضع ''کلوے'' کے درمیان گاؤں ''ورک'' میں چوہدری دسوندھی خاں (ذیلدار) سے ایک علمی سا تعلق قائم کرلیا۔ ان سے پہلے پہل گزرتے ہوئے علیک سلیک ہوتی، چوہدری صاحب بڑے وضع دار، فراغ دل، غریب پرور اور ہمدرد طبیعت کے انسان تھے ہروقت اُن کے ہاں ضرورت مندوں کا جمگھٹا رہتا تھا اور وہ ہر ایک سے ہمدردی کا تعلق

۸۱ سال ہونے کو ہیں مگر آج بھی مجھے چوہدری دسوندھی خان کا حسن سلوک یاد ہے

استوار رکھتے تھے ایک دن انہوں نے میرے بارے میں مجھ سے تفصیلات پوچھیں اور جب اُنہیں معلوم ہوا کہ میں سکول میں ٹیچر ہوں تو وہ بہت خوش ہوئے۔ باتوں باتوں میں، میں نے اُنہیں اپنے ایک تصوراتی منصوبے سے آگاہ کیا تو وہ بے حد خوش ہوئے، میں نے انہیں بتایا کہ میں ایک میگزین شائع کرنا چاہتا ہوں اور ''چودھویں صدی'' اُس کا نام رکھوں گا اُنہوں نے یہ سنتے ہی مجھے کہا کہ آپ اس دیہاتی علاقے میں رہ کر اتنی عمدہ سوچ رکھتے ہو میں تمہارے ساتھ ہر طرح سے تعاون کروں گا اُنہوں نے اپنی ہی اُس بیٹھک میں ایک کمرہ کھول کر مجھے کہا کہ اس کمرے کو اپنا دفتر بنا لو اور مجھے کہا کہ اگر اس علاقے سے ایک میگزین شروع کرو تو یہ پورے علاقے کے لئے ایک خوشخبری ہوگی آج ۸۱ سال ہونے کو ہے میں چوہدری دسوندھی خاں کے اُس فراغ دلانہ رویے کے اخلاص کو برابر محسوس کرتا ہوں اگرچہ میں وہاں قیام کے دوران یہ میگزین شروع تو نہ کر سکا مگر بعد میں اس کا اجراء بھی اسی تحریک ہی کا حصہ تھا۔

س: ''چودھویں صدی'' کے لئے آپ کے ساتھ علمی و قلمی معاونین کون تھے؟

ج: احسان دانش میرے پرچے کے نگران، ہمارے ایک ساتھی محمد اکرم ایڈیٹر اور میں خود اُس کا مینجنگ ایڈیٹر تھا یہ میگزین رائج الوقت سائز کے اعتبار سے 23x36/4 پر چھپتا تھا۔ زمانہ قدیم کی لیتھو مشین ایک ایک رنگ کر کے اُسے چھاپتی تھی تصویر چھاپنے کے

Marfat.com

لئے سپیشل بلاک بنوانا پڑتا تھا اور پندرہ روزہ میگزین کی سالانہ ممبر شپ فیس فقط پانچ روپے ہوا کرتی تھی یہ وہ زمانہ تھا جب 23x36 سائز کا اچھا کاغذ صرف 23 روپے میں ایک رم ملتا تھا جس کی اس وقت قیمت 1500 روپے کے لگ بھگ ہے۔

گورنر مغربی پاکستان نے میرے میگزین ''چودھویں صدی'' کو خراجِ تحسین پیش کیا

س: آپ کا یہ پرچہ کس حد تک مقبول ہوا؟

ج: مقبول تو بہت ہوا اس زمانے میں کافی زیادہ اُس کی اشاعت تھی۔ ۱۹۵۷ء میں آڈٹ بیورو سرکولیشن کی رپورٹ کے مطابق اُس کی اشاعت آٹھ ہزار تھی اور محکمہ اطلاعات کے ڈائریکٹر شان الحق حقی نے میرے میگزین ''چودھویں صدی'' کو سرکاری اشتہارات کی اشاعت کے لئے منظور کیا تھا۔ اُس کا اندازہ آپ اس امر سے لگائیے کہ اُس زمانے کے گورنر مغربی پاکستان اختر حسین نے مجھے ۱۴ مارچ ۱۹۵۸ء کو ایک سرکاری لیٹر میں لکھا:

> ''کسی زبان کے رسائل و جرائد کی خوبیٔ طباعت اور کثرتِ اشاعت جہاں ان کی مقبولیت کی دلیل ہے وہیں اُس زبان کے بولنے والوں کے حسنِ مذاق کا ثبوت بھی ہے۔ رسالہ ''چودھویں صدی'' کے چند شمارے جو میری نظر سے گزرے ہیں انہیں دیکھ کے مجھے بڑی مسرت حاصل ہوئی ہے یقیناً یہ اُردو کے ان چند رسائل میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے جن کا نصب العین اُردو زبان کی وساطت سے علم و فن کی خدمت ہے اور جن کو ظاہری اور باطنی خوبیوں سے آراستہ کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔''

لیکن اس کے باوجود میں چار سال سے زیادہ اس پرچہ کو جاری نہ رکھ سکا۔

س: ''نئے زاویے'' کے نام سے بھی آپ نے میگزین شروع کیا؟

ج: میں نے ''نئے زاویے'' کے نام سے ایک اَدبی پرچہ شروع کیا تھا وہ بھی کچھ

Marfat.com

عرصہ بعد بند کرنا پڑا دراصل میرے خیالی پروگرام بہت زیادہ ہوتے تھے اُن کو زیادہ دیر تک دوام نصیب نہیں ہوا البتہ مقبول اکیڈمی پورے تسلسل کے ساتھ ایک طویل عرصے سے اپنے کام میں مصروفِ جہد ہے اور اپنے ہدف پر تمام تر توجہ مرتکز کر کے اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہنوز ''سفر جاری ہے۔''

س: آپ نے ''پی آئی بی سی'' کا کیا چکر چلایا؟

ج: دراصل سوچ بچار اور مختلف معاملات میں تفکر اور تدبر میرا شبانہ روز معمول تھا اُس زمانے میں ایک محکمہ ''پی آئی ڈی سی'' ہوا کرتا تھا جس کا اصل نام ''پاکستان انڈسٹریل ڈیویلپمنٹ کارپوریشن'' تھا غالباً آج بھی موجود ہے۔ میں نے اس زبانِ زد خاص و عام نام سے فائدہ اٹھانے کی فکر کی اور میں نے اُس سے ملتا جلتا ایک نام ''پی آئی بی سی'' سوچا جس کے لیے میں نے ایک کمپنی ''پاکستان انٹرنیشنل بزنس کارپوریشن'' رجسٹرڈ کروائی جس کا مخفف ''پی آئی بی سی'' تھا میں نے اسی نام سے پریس لگایا پھر میں نے اس نام کو خوب کیش کروایا۔

میں نے ''پی آئی ڈی سی'' کے نام سے ملتا جلتا نام رکھ کر ''پی آئی بی سی''
کمپنی رجسٹرڈ کرائی اور اس سے فائدہ اٹھایا

س: آپ کو رسالے کے لئے کیا مراعات حاصل تھیں؟

ج: سرکاری طور پر اخباری کاغذ کا کوٹہ بھی ملتا تھا اور منظور شدہ اشتہارات بھی لیکن یہ انتہائی مشکل اور ادق کام تھا جس کے لئے میں اپنے آپ کو موزوں نہ بنا سکا۔

س: ازدواجی زندگی کا آغاز کب ہوا؟ شادی کب، کہاں ہوئی اور بچے کتنے ہیں؟

ج: میری پہلی شادی ۱۹ سال کی عمر میں اپنی امی جان کے حکم اور خواہش پر ہوئی تھی لیکن بدقسمتی سے نباہ نہ ہو سکا اور اپنی امی جان ہی کے حکم سے دوسری شادی کی۔ اللہ تعالیٰ

Marfat.com

نے مجھے دو بیٹے اور ایک بیٹی سے نوازا۔ میرا بیٹا ظفر مقبول ۳۰ اگست ۱۹۵۸ء کو پیدا ہوا جبکہ دوسرا بیٹا ارشد مقبول ۱۵ نومبر ۱۹۵۹ء کو پیدا ہوا اور میری بیٹی شہنیلا ۲۹ جولائی ۱۹۶۱ء کو پیدا ہوئی۔ میرے تینوں بچے، داماد اور ایک بہو سارے ایم بی بی ایس ڈاکٹرز ہیں اس پر میں اللہ کا بہت شکر گزار ہوں۔ میری اہلیہ ایک نیک سیرت، خدمت گزار اور فراغ دل خاتون ہیں اُنہوں نے میرے والدین کی خدمت اپنے ہی والدین کی طرح کی جس کی وجہ سے میں اس سے بے حد مسرور ہوں اللہ تعالیٰ کا شکر ہے ہماری ازدواجی زندگی بہت خوشگوار گزری ہے اور گزر رہی ہے۔

س: حج وعمرہ کی سعادت؟

ج: الحمدللہ میں نے تین مرتبہ حج اور بہت مرتبہ عمرہ کی سعادت حاصل کی۔ ۱۹۸۶ء میں اپنی اہلیہ سمیت پہلے حج کے لئے حاضری ہوئی جبکہ ۲۰۰۲ء میں دوسری مرتبہ اپنی اہلیہ سمیت حج کے لئے حاضری کا موقع نصیب ہوا اور پھر تیسری دفعہ ۲۰۰۶ء میں حج کی سعادت حاصل ہوئی۔ مجھے اس حوالے سے اپنے بچپن کا زمانہ خوب یاد آتا ہے کہ جب میں ایک نعت

میرے مولا بلا لو مدینے مجھے

بڑے شوق سے سنا کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے میری اس خواہش کو حقیقت کا روپ عطا فرمایا اور میں نے جاگتی آنکھوں سے دیارِ محبوب ﷺ کے جلوؤں سے اپنے دل ودماغ اور آنکھوں کو پُرنور پایا۔

ملک کے نامور ناشرین کی صف میں مجھے کھڑا کر دینے میں علامہ اقبال کے کلام اور میری ماں کی دُعاؤں کا بہت بڑا حصہ ہے

س: آپ کی کتابیں؟

ج: اگر تو بطورِ ناشر پوچھ رہے ہیں تو میں نے ایک ہزار سے زیادہ کتابیں مقبول اکیڈمی

Marfat.com

کے پلیٹ فارم سے شائع کیں اور اگر میری ذاتی تصانیف و تالیفات مقصود ہیں تو ابھی تک جو کتابیں مرتب کرنے کا اعزاز مجھے حاصل ہے اُن میں میری خودنوشت ''سفر جاری ہے'' کا پہلا ایڈیشن ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا اب اُس کا تیسرا ایڈیشن پریس میں جانے والا ہے۔ اس کے علاوہ ''پذیرائی''، ''اہل قلم کے خطوط''، ''رہنمائے حج و عمرہ''، ''صلوعلیہ وآلہٖ''، ''خطبہ حجۃ الوداع (بعض معلوماتی مضامین کے ساتھ'' اور ''پیغمبر عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم'' چھپ چکی ہیں ،جبکہ ''قرآنی دعائیں'' اور ''شناسائی'' اگلے ماہ اپریل ۲۰۱۰ء تک چھپ جائیں گی۔ ان کے علاوہ چار کتابیں طباعتی مراحل میں ہیں۔

س: مقبول اکیڈمی کا قیام کب، کہاں اور کیسے عمل میں آیا؟

ج: اپنی لاہور آمد کے ساتھ ''چودھویں صدی'' کا اجراء عمل میں آیا اس کے بعد میں نے نامور ادیب رئیس احمد جعفری کی مشاورت سے ''مقبول اکیڈمی'' کے نام سے کام شروع کر دیا اور ۱۹۵۸ء میں ''آزادی ہند''، اور رئیس احمد جعفری کے ناولوں سے کتابوں کی اشاعت شروع کر دی بعد میں ''تمدنِ عرب''، ''تمدنِ ہند'' اور دینی کتابوں کی اشاعت بھی ہوئی۔ ''سیرتِ ابن ہشام'' چھاپی اور پھر اللہ تعالیٰ نے میری مدد فرمائی آج تک ایک ہزار سے زیادہ چھوٹی بڑی کتابیں شائع کر چکا ہوں میں اب بھی سوچتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ ناتواں سے اشاعت و ابلاغ کا کس قدر وقیع کام لیا ہے۔

س: کن کن شخصیات کی کتابیں آپ نے شائع کیں؟

ج: میرے ساتھ جن ادیبوں، قلمکاروں، صحافیوں، کالم نگاروں اور شعراء نے تعاون کیا یا جن کی کتابیں میں نے شائع کیں ان میں بڑے بڑے نام آتے ہیں مثلاً چند یہ ہیں رئیس احمد جعفری، احسان دانش، محمد احسان الحق سلیمانی، میرزا ادیب، اے حمید، ڈاکٹر طارق عزیز، ڈاکٹر انور سدید، علی سفیان آفاقی، طارق اسمٰعیل ساگر، حفیظ تائب، ڈاکٹر صفدر محمود، شعیب بن عزیز، امجد اسلام امجد، ڈاکٹر وحید قریشی، مولانا حامد علی خان، سید قاسم محمود، عبدالعزیز خالد، ڈاکٹر علی محمد خان، اظہر جاوید، ظفر علی راجا، قمر نقوی نقشبند، ڈاکٹر اللہ بخش ملک، راجا

Marfat.com

رشید محمود، ڈاکٹر سکین علی حجازی، قاضی ذوالفقار احمد، ساغر صدیقی، رحمان مذنب، ناصر نقوی، سید واجد رضوی، ابوالامتیاز ع س مسلم، غلام الثقلین نقوی، پروفیسر رفیع اللہ شہاب، ڈاکٹر ایم ایس ناز، حمید کاشمیری، زاہد حسین انجم، ڈاکٹر اختر شمار، اعتبار ساجد، پروفیسر عبدالعلیم صدیقی، منصور احمد بٹ، پروفیسر عثمان علی، ستار طاہر، خالد محمود، پروفیسر رشید احمد گوریجہ، ایم اسلم، یونس ادیب، مولانا محمد بخش مسلم، سید علی ناصر زیدی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، پروفیسر حسن عسکری، ڈاکٹر برہان احمد فاروقی، منشا یاد، پروفیسر جمیل آذر، بدر منیر، پروفیسر تنویر حسین، جوگندر پال، ڈاکٹر ریاض محمود، سعید بدر، محمد ایوب خان، علامہ عبدالستار عاصم، پروفیسر محمد مظفر مرزا، پروفیسر نذیر احمد تشنہ، اسرار زیدی، امجد پرویز، حمید اختر، آصف علی بھلی، جاوید اختر بھٹی، خواجہ محمد زکریا، شیخ ریاض احمد، غفور شاہ قاسم، مجیب الرحمٰن شامی، محمد عالم مختار حق، عباس خان، محیط اسمٰعیل، سید شبیر حسین شاہ زاہد، طارق شاہین، مناظر عاشق ہرگانوی، مرزا خلیل احمد بیگ، علی احمد فاطمی، کیول دھیر، انیس یعقوب، امین راحت چغتائی، انوار فیروز، سرفراز احمد بھٹی، ڈاکٹر سلیم اختر، عشرت رحمانی، مفتی غلام سرور قادری، کلیم اختر، گوہر ملسیانی، محشر بدایونی، ڈاکٹر معصوم شرقی، ڈاکٹر سید معین الرحمان، صابر آفاقی، شفیع ہمدم، خواتین میں سے بلقیس ریاض، ثریا خورشید، ادا جعفری، سلمیٰ اعوان، عمرانہ مشتاق، امینہ عنبرین، زبیدہ سلطانہ، شبہ طراز، ہاجرہ مسرور، صائمہ نورین بخاری، عنبرین تبسم شاکر، عذرا اصغر، شبانہ یونس، رضیہ فصیح احمد اور نشاط فاطمہ۔

س: آپ کی کامیابی میں سوچ اور عملی جدوجہد میں کسی غیبی ہاتھ کا عمل دخل بھی ہے؟

ج: بالکل، میں سمجھتا ہوں کہ ایک عوامی سطح سے اٹھ کر ملک کے نامور ناشرین کی صف میں مجھے کھڑا کر دینے میں علامہ اقبال کے کلام اور میری ماں کی دعاؤں کا بہت بڑا حصہ ہے جو میری کامیابی میں میری محنت سے بھی زیادہ موثر ہے۔

لائبریریوں کے فنڈز میں اضافہ کیا جائے

Marfat.com

س: اکثر ناشرین کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ قلم کاروں کے حقوق غصب کرتے ہیں مصنفین کو رائلٹی کی رقم دینے میں لیت ولعل سے کام لیتے ہیں اور اُن کی عزت نفس مجروح کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ بطورِ ناشر آپ کا رویہ اپنے لکھنے والوں کے ساتھ کیسا ہے؟

ج: میں اپنے منہ میاں مٹھو کیا بنوں؟ میں نے اپنی زندگی میں قلمکار، مصنف یا ادیب تو کیا کسی بھی شخص سے بدعہدی کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی میں نے کسی قلمکار کی حوصلہ شکنی کی ہے البتہ مجھے کچھ قلم کاروں سے شکوے ضرور ہیں کچھ تو ایسے بھی ہیں جو پیسے لے کر کھا گئے کچھ نے مسودہ دیا کمپوزنگ کرائی وہ بھی واپس نہ کی اور نہ ہی اس کے پیسے دیئے اور میں ہوں کہ دوستی، رواداری کو دیکھ رہا ہوں میرا اصول ہے کہ جس سے جو معاہدہ طے پا گیا صورت کچھ بھی ہو میں اُس پر ہمیشہ کاربند رہنے کی پوری کوشش کرتا ہوں یہی وجہ ہے کہ مارکیٹ میں اس حوالے سے میرے بارے میں مثبت انداز سے ایک خاص تصور ہے۔
بعض قلم کار بھی بہت زیادہ زیادتی کرتے ہیں اور ناشرین کو دھوکہ دینے سے بھی باز نہیں آتے خود میرے پاس ایک شاعر نے اپنا مجموعہ چھاپنے کے لئے دیا اُس پر ملک کی نامور شاعرہ محترمہ یاسمین حمید صاحبہ کا فلیپ لکھا ہوا تھا میں نے شاعر صاحب پر اعتماد کیا کتاب چھپنے کے بعد محترمہ نے شکوہ کیا کہ اس کتاب پر میری طرف سے غلط فلیپ منسوب کر دیا گیا ہے جو میں نے نہیں لکھا۔ اب میرے پاس اُن سے معذرت کرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہ رہا اور اُس شاعر کی آئندہ کوئی کتاب شائع کرنے سے میں نے توبہ کر لی۔ بعض مصنفین اپنی کتابوں کی ''مقبولیت'' کے متعلق بڑی سخت غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ شاید ناشر اُن کی کتابیں دھڑا دھڑ چھاپ کر بیچے جا رہا ہے اور خوب نفع کما رہا ہے اس حوالے سے بھی مجھے کئی مرتبہ تجربوں سے گزرنا پڑا میں اپنے اُن مصنفین کی سادہ لوحی پر دل ہی دل میں مسکراتا ہوں مگر رواداری کے پیشِ نظر چپ رہنا میری مجبوری بن جاتی ہے۔

س: آپ کی شائع کردہ کتابیں دنیا بھر کی لائبریریوں کی زینت بنی ہیں، اس کا

Marfat.com

سبب کیا ہے؟

ج: دراصل کتاب کی اشاعت سے پہلے میں معاشرہ میں موجود علمی خلا کو محسوس کرتا ہوں اور پھر ضرورت کا ادراک کر کے اُس موضوع کے مطابق لٹریچر کی تیاری واشاعت کا اہتمام عصری تقاضوں کے مطابق کرتا ہوں جو لائبریریوں اور دیگر اداروں کے علاوہ ہر ذی علم و ذی شعور انسان کی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ مقبول اکیڈمی کی شائع کردہ کتابیں ساری دنیا کی لائبریریوں کی زینت ہیں لیکن جس قدر اس معاشرہ کو کتاب کی ضرورت ہے اُس قدر لائبریریوں کے پاس کتابیں خریدنے کے لئے فنڈز نہیں ہیں۔ گورنمنٹ کو چاہیے کہ وہ صحت مند کتابوں کی اشاعت پر خصوصی توجہ مرتکز کرے اور لائبریریوں کے بجٹ میں اضافہ کیا جائے اور کتاب کے فروغ کے لئے عملی اقدام اٹھائے جائیں۔

رائٹر تحقیق اور ناشر مقدار کے بجائے معیار کو پیشِ نظر رکھے تو معاشرہ بدل سکتا ہے

س: ایک رائٹر اور ایک ناشر کو آپ کیا پیغام دیں گے؟

ج: رائٹر تحقیق اور سچائی کو سامنے رکھ کر دیانت داری سے لکھے تا کہ قاری کو اس کی کتاب سے نفع ہو اور اسے علم حاصل ہو اگر یہ بات پیشِ نظر رکھ کر کتاب لکھی جائے تو وہ اس قلم کار کے لئے صدقۂ جاریہ بن جائے گی اور ناشر تعداد اور مقدار کے بڑھانے کی فکر نہ کرے بلکہ ساری توجہ معیار پر مرتکز کرے اپنے رائٹرز سے حسن سلوک اور دیانت داری سے پیش آئے۔ کسی بھی موضوع کا ناشر ہو اسے چاہیے کہ اسلام اور اصلاح معاشرہ کے موضوع پر کچھ نہ کچھ ضرور شائع کرے تا کہ دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت بھی سنور جائے۔

Marfat.com

ماہنامہ فلک رنگ لاہور

ملاقات: علامہ عبدالستار عاصم

بے شمار علمی، ادبی، اسلامی، تاریخی، سائنسی اور بچوں کی خوبصورت باتصویر اور معیاری کتابیں شائع کرنے والے ادارے مقبول اکیڈمی کے بانی ملک مقبول احمد کا شمار دنیا کے ان بڑے بڑے پبلشروں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز بڑے نچلے درجے سے کیا۔ دن رات جہد مسلسل کی اور آج کتابوں کی دنیا میں اس جگہ پر ہیں جہاں ہر نیا پبلشر اپنے آپ کو دیکھنا چاہتا ہے۔ آج سے قریباً 53 سال قبل انہوں نے ایک علمی ادارہ مقبول اکیڈمی کی داغ بیل رکھی اور اس کے لئے اس دور کے نامور مصنفین کا تعاون حاصل کیا اور ان کی کتابیں اس خوبصورت انداز میں شائع کیں کہ ان مصنفین کا ملک صاحب کے ساتھ عمر بھر کا تعلق پیدا ہو گیا۔ ملک مقبول احمد کے اس ادارے سے اب تک ایک ہزار سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جن کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ پاکستان سمیت دنیا کی ہر بڑی سے بڑی لائبریری میں ان کی شائع کردہ کتب موجود ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ان کے ادارے کی شائع کردہ کتب لاکھوں کے قریب طلبا و طالبات، ادیب، شاعر، محقق، علماء اور عام قارئین مطالعہ کر چکے ہیں۔

ملک صاحب ایک کامیاب ناشر ہیں ان کی زندگی کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ انہوں نے اشاعتی کاروبار میں پوری ایمانداری سے کام لیا اور مصنفین کا اعتماد کبھی مجروح نہیں ہونے دیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج مقبول اکیڈمی کو ایک ایمپائر کا درجہ حاصل ہے۔

Marfat.com

ملک مقبول احمد وطن عزیز کے واحد پبلشر ہیں جنہوں نے اپنی خودنوشت "سفر جاری ہے" لکھ کر فن طباعت واشاعت کے رموز واسرار منکشف کیے۔ اس لحاظ سے یہ ایک نادر سوانح حیات ہے جس پر عہد حاضر کے ممتاز دانشوروں نے تعریف وتحسین کے مضامین رقم فرمائے ہیں۔ ان لوگوں میں چیف جسٹس آف پاکستان (ر) شیخ ریاض احمد، ممتاز مؤرخ ڈاکٹر صفدر محمود، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر وزیر آغا، روزنامہ ایکسپریس کے ممتاز کالم نگار حمید اختر، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ممتاز تجزیہ نگار چیف ایڈیٹر روزنامہ پاکستان مجیب الرحمان شامی ڈاکٹر انور سدید، امجد اسلام امجد، پروفیسر جمیل آذر، محمد منشاء یاد، اے حمید، جوگندر پال، پروفیسر علی احمد فاطمی، ڈاکٹر طارق عزیز، اظہر جاوید، ڈاکٹر مسکین علی حجازی، سید قاسم محمود، طالب ہاشمی، سعید بدر، ابوالامتیاز ع س مسلم، علی سفیان آفاقی، پروفیسر محمد مظفر مرزا، محمد آصف بھلی پروفیسر اعتبار ساجد، ظفر علی راجا، میرزا ادیب، عذرا اصغر، بلقیس ریاض، صائمہ نورین، پروفیسر تنویر حسین، کنول عاصم، عمرانہ مشتاق چیف ایڈیٹر روزنامہ سماء جیسی عظیم شخصیات شامل ہیں۔

ملک مقبول احمد کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ انسان دوست ہیں۔ اللہ نے انہیں ایسی فطرت عطا کی ہے کہ جو انسان بھی ان سے ایک دفعہ مل لیتا ہے ان کا ہی ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان کی تعریف کرنے والوں میں ڈاکٹر مفتی غلام سرور قادری شامل ہیں۔ تو ملک کے واحد نظریاتی اخبار "نوائے وقت" کے مدیر جناب مجید نظامی بھی شامل ہیں۔ ملک مقبول احمد نے اپنی زندگی کس طرح گزاری، اشاعتی میدان میں کون کون سے تجربات حاصل کیے اور کامیابیوں نے ان کے قدم کس طرح چومے، آیئے ان کا احوال ان کی زبانی سنیں۔ ایک انٹرویو کے ذریعے ہم اپنے قارئین کو ان کے تجربات سے روشناس کراتے ہیں۔

Marfat.com

س: ملک مقبول احمد صاحب! آپ نے مقبول اکیڈمی کا آغاز کس طرح کیا؟

ج: میں اپنی سوانح عمری میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں کہ مجھے اَدب سے لگاؤ طالب علمی کے زمانے میں ہی پیدا ہو چکا تھا۔ میں نے ''چودھویں صدی'' کے نام سے ایک اَدبی پرچہ بھی نکالا جس کی سرپرستی جناب احسان دانش فرماتے تھے۔ ادبی پرچے کی اشاعت کا تجربہ کامیاب نہ ہوا تو میں نے کتابوں کی اشاعت کا پروگرام بنالیا۔ مقبول اکیڈمی کا قیام میری شعوری کاوش تھی۔ رسالہ ''چودھویں صدی'' کی ناکامی نے میرے سامنے ایک چیلنج رکھ دیا تھا اور میں نے اس چیلنج کو سر دھڑ کی بازی لگادی۔

س: مقبول اکیڈمی سے آپ نے سب سے پہلے کون سی کتاب شائع کی؟

ج: رئیس احمد جعفری اس زمانے کے ایک مقبول مصنف تھے۔ ان کے اسلامی اور معاشرتی ناول طلبا و طالبات میں بہت معقول تھے۔ میں نے ان سے رابطہ کیا تو انہوں نے کشادہ دلی سے میرے ساتھ تعاون کیا۔ وہ اس میدان کے شناور تھے۔ اپنے اشاعتی تجربات سے بھی انہوں نے مجھے مُستفیض کیا۔ انہیں دنوں مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب ''انڈیا ونز فریڈم'' شائع ہوئی تھی جو متنازعہ ہوگئی تھی۔ رئیس احمد جعفری نے اس کتاب کا آزادی ہند کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا اور اس کی اشاعت کے لئے میرے ادارے کو منتخب کیا۔ ''آزادی ہند'' کے پہلے تین ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ رئیس احمد جعفری کے ناولوں کے بعد ''آزادی ہند'' کی اشاعت نے مقبول اکیڈمی کو مضبوط بنیاد فراہم کی۔

س: آپ نے رئیس احمد جعفری اور ابوالکلام آزاد کی کتابوں کا ذکر کیا ہے، لیکن آپ کے ادارے سے چھپنے والے مصنفین کی تعداد تو بہت زیادہ ہے۔ آپ نے اتنے نامور ادیبوں کا تعاون کس طرح حاصل کیا؟

Marfat.com

ج: سچی بات یہ ہے کہ رسالہ ''چودھویں صدی'' اگرچہ تجارتی لحاظ سے ناکام ہو گیا تھا لیکن ادبی لحاظ سے میرے لئے بہت منفعت بخش ثابت ہوا۔ اس پرچے نے ہی مجھے ادب کی پہچان کا شعور عطا کیا۔ احسان دانش جب مضامین منظور فرما کر بھیجتے تو میں انہیں غور سے دیکھتا اور جو مضامین مسترد کر دیتے انہیں زیادہ توجہ سے پڑھتا کہ یہ کیوں مسترد ہوئے ہیں۔ اکثر اوقات احسان دانش صاحب سے بحث ہوتی تو وہ اچھے اور برے مضامین پر تنقیدی نظر بھی ڈالتے اور میری رہنمائی کرتے۔ پھر مقبول اکیڈمی قائم ہوئی تو مجھے رئیس احمد جعفری کا تعاون حاصل ہو گیا۔ وہ عوام کے مطالعہ کا رخ پہچانتے تھے۔ میں نے بیشتر مصنفین سے ان کے مشورے سے رابطہ کیا۔ ان کی ایک بات مجھے اب بھی یاد ہے۔ کہتے تھے کہ مصنف شہرت کا بڑا طلبگار ہوتا ہے لیکن روپیہ پیسہ اس کی بنیادی ضرورت ہے۔ اگر آپ اس کا معاوضہ بروقت پیش کر دیں گے تو وہ آپ کے لئے اچھی کتاب لکھے گا۔ جعفری صاحب کی اس شخصیت کو میں نے ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ بیشتر ناشر اسی سے مات کھا جاتے ہیں کہ وہ مصنف کے حقوق کا پاس نہیں کرتے اور معمولی فائدے کے لئے مصنف کھو دیتے ہیں۔

س: کیا آپ کی کامیابی پاپولر کتابیں چھاپنے کی وجہ سے تھی؟

ج: جی ہاں! یہ کسی حد تک درست ہے لیکن بہت جلد مجھے احساس ہو گیا کہ پاپولر ناولوں کے ساتھ ایسی کتابوں کو فوقیت دینی چاہیے جو بے شک آہستہ آہستہ فروخت ہوں لیکن ان کا حلقہء اثر وسیع ہو۔ فروخت کی آہستہ روی کو سر کرنے کے لئے میں نے زیادہ مصنفین کی کتابیں چھاپنے کا طریق اختیار کیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنی کتابوں پر تبصروں کو بھی اہمیت دی۔ کسی اچھے اخبار میں تبصرے کی اشاعت سے کتاب کو غیر معمولی شہرت مل جاتی ہے۔ اور اس کا ایڈیشن جلدی بک جاتا ہے۔ تاہم تبصرہ کتاب کے حقیقی

Marfat.com

اوصاف پر مبنی ہونا چاہئے۔ اور قاری کو کتاب خرید کر پڑھنے کے بعد طمانیت ہونی چاہئے کہ اس نے ایک اچھی کتاب خریدی ہے۔ دوسری بات یہ کہ تبصرے سے مصنفین کو بھی طمانیت ملتی ہے کہ ان کی کتابیں پڑھی جارہی ہیں اور ادب میں ان کا مقام تسلیم کیا جارہا ہے۔ میں اپنے ادارے کی منفعت کے مقابلے میں مصنف کی طمانیت کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔ میں فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ مقبول اکیڈمی کی کتابوں پر جتنے تبصرے چھپتے ہیں اتنے تبصرے کسی اور ادارے کی کتابوں پر نہیں چھپتے۔

س: آپ کے خیال میں کون سی کتابیں زیادہ پڑھی جاتی ہیں؟

ج: اَدبی کتابوں میں سے نوجوان زیادہ تر رومانوی شاعری کی کتابیں زیادہ پسند کرتے ہیں۔ جس شاعر کی غزل کالج یا یونیورسٹی کے مشاعرے میں کامیاب ہو جائے، اس کی کتاب کی مانگ بھی بڑھ جاتی ہے۔ اس کے بعد ناول کے قاری بھی زیادہ ہیں۔ لیکن اچھے ناول کی تشہیر کا اہتمام ضروری ہے۔ عوام کی ایک بڑی تعداد کی ضرورت دینی اور مذہبی کتابیں ہیں۔ تاہم اس قسم کی کتابوں کی اشاعت میں احتیاط لازم ہے کہ قارئین کے بنیادی عقائد کو ٹھیس نہ پہنچے۔ علمی و ادبی کتابوں کے قارئین کم ہیں لیکن علم و دانش کے فروغ کے لئے ان کی اشاعت بھی ضروری ہے۔ ایسی کتابیں زیادہ تر لائبریریوں میں چلی جاتی ہیں اور ان سے طلبا استفادہ کرتے ہیں۔ ایم۔اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالوں کے لئے بھی اب اس قسم کی کتابوں کی مانگ پیدا ہو رہی ہے لیکن اس ضرورت کو لائبریریاں ہی پوری کرتی ہیں۔ اشاعت کتب میں قرآن حکیم کو سب کتابوں پر فوقیت حاصل ہے۔ اب قرآن کے متن کے ساتھ ترجمے کو بھی اہمیت مل رہی ہے اور پڑھنے والوں کو عربی زبان سے متعارف کرانے کے لئے متن اور ترجمہ کئی کئی رنگوں میں چھاپا جاتا ہے۔

Marfat.com

س:　لائبریریوں کی اہمیت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

ج:　لائبریریاں علم کے روشن میناروں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کوئی صاحب علم لائبریریوں کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا۔ لائبریریوں کو انسانی تاریخ وتمدن اور علم ودانش کے ہر دور میں ایک اہم مقام حاصل رہا ہے۔ اور یہ علمی ادبی خدمت کے علاوہ عوام کی سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور صنعتی فلاح و بہبود میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ جو لوگ کتاب خرید نہیں سکتے وہ لائبریری سے استفادہ کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے لائبریری وہ خزینہ ہے جو علم کا ماخذ ہے اور خیر کی تقسیم مفت کرتا ہے۔

س:　مقبول اکیڈمی کے آغاز سے اب تک آپ کو کن اہل قلم سے قربت حاصل رہی۔ میرا مطلب ہے کہ مقبول اکیڈمی کو پبلشنگ ایمپائر بنانے میں کن مصنفین کا زیادہ حصہ ہے؟

ج:　میں رئیس احمد جعفری کا ذکر اوپر کر چکا ہوں یہ ناول اور افسانے کی مقبولیت کا دور تھا چنانچہ اے حمید، میرزا ادیب، قمر نقوی، سید قاسم محمود، رشید امجد، بلقیس ریاض، عذرا اصغر، ہاجرہ مسرور اور رضیہ فصیح احمد کی کتابیں زیادہ شائع ہوئیں۔ پھر سفرناموں کا دور آ گیا۔ اور مقبول اکیڈمی نے علی سفیان آفاقی، اے حمید، بلقیس ریاض کی کتابیں پیش کیں۔ ادبی تنقیدی کتابوں میں ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر طارق عزیز، ڈاکٹر صفدر محمود، مسکین علی حجازی، اسرار زیدی، ڈاکٹر انور سدید، اعتبار ساجد، ڈاکٹر علی محمد خان، عبدالعزیز خالد، پروفیسر جمیل آذر، پروفیسر تنویر حسین کی کتابیں مقبول ہیں۔ اسی طرح مقبول اکیڈمی نے ہر صنف ادب کی کتابیں شائع کی ہیں۔ ان میں طنز و مزاح، خاکہ نگاری، آپ بیتی، سفرنامہ، انشائیہ وغیرہ سب شامل ہیں۔ شاعری کے مجموعے بہت زیادہ ہیں، سب شعرا کے نام گنوانا ممکن نہیں۔

س:　اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ آپ پہلے ناشر تھے۔ اب ادیب اور مصنف بھی بن

Marfat.com

گئے ہیں، اس کی تفصیل کیا ہے؟

ج: معاف کیجئے میں ادیب یا دانشور نہیں ہوں بلکہ بہت معمولی آدمی ہوں۔ یہ محض خون لگا کر شہید بننے والی بات ہے کہ بچوں کی خوشنودی کے لئے اپنی خودنوشت ''سفر جاری ہے'' لکھی اور پھر اس کے حوالے سے مزید کتابیں نکلنا شروع ہو گئیں۔ ''پذیرائی''، ''اہل قلم کے خطوط'' اور ''شناسائی'' سفر جاری ہے کا ہی تسلسل ہے۔ اس کے علاوہ میں نے لوئی کوہنی کی کتاب ''نیا علم شفا بخشی'' کی تلخیص کی ہے۔ ''پیغمبر عالم ﷺ''، ''رہنمائے حج عمرہ''، ''خطبہ حجۃ الوداع''، ''صلوعلیہ وآلہ'' مرتب کر کے شائع کی ہیں اور اپنے میگزین ''چودھویں صدی'' کی ایک فائل سے تین کتابیں ''ارمغان غزل''، ''ادبی مضامین'' اور ''گمشدہ افسانے'' بازیافت کر کے شائع کر رہا ہوں۔ ان کے علاوہ کچھ تبلیغی اسلامی کتب کا پروگرام میرے ذہن میں ہے اگر اللہ نے توفیق دی تو اشاعت اسلام سے متعلق کچھ مزید کتابیں شائع کر کے بلا قیمت تقسیم کرنے کا ارادہ ہے (انشاء اللہ) لیکن یہ سب شوق کے مرحلے ہیں۔ ادیبوں کی باوقار صنف میں شامل کریں تو میں سب سے آخر میں کھڑا ہوں۔

س: آپ تدریس سے بھی وابستہ رہے؟

ج: جی ہاں، تقریباً دو اڑھائی سال کی ملازمت کے بعد میں نے استعفیٰ دے دیا تھا۔

س: کیا آپ کے بچے بھی آپ کے کام میں شامل ہوئے؟

ج: میرے تینوں بچے اللہ کے فضل و کرم سے ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں لیکن یہ اشاعتی کاروبار سے وابستہ ہیں۔ اور ''مقبول بکس'' کے نام سے صدیق ٹریڈ سنٹر گلبرگ، مین بلیوارڈ اقبال ٹاؤن اور لنک روڈ ماڈل ٹاؤن لاہور اپنی صلاحیتوں کے مطابق الگ اپنا اپنا کاروبار شروع کر رکھا ہے۔ یہ سب علم و ادب کی خدمت میں میرے ساتھ شامل ہیں۔

Marfat.com

گویا نشرو اشاعت کی خدمت اگلی نسل میں چلی گئی ہے۔

س: آپ کی خودنوشت ''سفر جاری ہے'' کو بڑی شہرت ملی، اس کی کوئی خاص وجہ؟

ج: یہ میری پہلی تصنیف ہے جو میں نے اپنے پوتے پوتیوں اور نواسیوں کی فرمائش پر لکھی، میں کوئی ادیب یا دانشور نہیں ہوں لیکن اللہ کے فضل و کرم سے میری اس کتاب کو بہت پذیرائی ملی۔ پاک و ہند کے قریباً ایک سو دانشوروں نے اس پر اپنے تاثرات لکھ کر مجھے ارسال کئے۔ جنہیں میں نے اپنی دوسری کتاب ''پذیرائی'' میں شائع کیا۔

س: ''سفر جاری ہے'' اور ''پذیرائی'' کے علاوہ بھی کوئی کتاب آپ نے مرتب کی ہے؟

ج: ان کے علاوہ ''اہل قلم کے خطوط'' اور ''پیغمبر عالم ﷺ'' مرتب کر کے شائع کی ہیں۔ ''پیغمبر عالم ﷺ'' کے علاوہ ''رہنمائے حج عمرہ''، ''خطبہ حجۃ الوداع'' میں نے تالیف کی ہیں اور یہ اسلامی، تبلیغی کتب بلا قیمت تقسیم کر رہا ہوں۔

س: کسی ادیب نے کوئی کتاب آپ پر لکھی؟

ج: ''سفر جاری ہے'' سے متاثر ہو کر پروفیسر جمیل آذر صاحب جن سے آج تک میری ملاقات نہیں ہو سکی ''راہ نوردِ شوق'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ جسے لاہور کے ایک نامور ادارے نے شائع کیا ہے۔ اس کے علاوہ اسرار زیدی، ڈاکٹر انور سدید وغیرہ نے میرے اور میری کتابوں کے متعلق مضامین اپنی کتابوں میں شامل کئے ہیں۔

س: لوگوں میں کتاب کے مطالعہ کا شوق کم ہو گیا ہے، اس کا سبب کیا ہے؟

ج: ایک تو ہمارے ہاں شرح خواندگی کم ہے، دوسرا مہنگائی کی وجہ سے لوگوں کی قوت خرید جواب دے چکی ہے۔ ٹی وی اور انٹرنیٹ کی وجہ سے اب کسی کے پاس کتاب پڑھنے کا وقت نہیں ہے۔ کاغذ کی گرانی میں بیحد اضافے نے کتابوں کی قیمتوں میں جو اضافہ کیا ہے اس سے بھی مطالعہ کے شوقین حضرات کی حوصلہ شکنی ہوئی ہے۔

Marfat.com

س: نوجوان نسل میں کتاب بینی کے لئے کیا تجویز دیں گے؟

ج: اچھی کتاب انسان کی بہترین دوست ہے۔ کتابوں کا مطالعہ انسان کی شخصیت کونکھارتا ہے۔ اوراس سے روح کوتازگی اور دماغ کو وسعت حاصل ہوتی ہے۔ آج سے پندرہ بیس سال قبل لوگ کتابیں پڑھا کرتے تھے۔ لیکن آج کے نوجوان کی ترجیحات بالکل بدل چکی ہیں اور کتابوں کی جگہ کمپیوٹر، ٹی وی، انٹرنیٹ اور موبائل نے لے لی ہے۔ اہل مغرب کے پاس یہ سب کچھ بہت پہلے سے ہے لیکن وہ شوق سے کتابیں پڑھتے ہیں۔ ٹی وی اور انٹرنیٹ وغیرہ کتاب کانعم البدل نہیں ہے۔

س: کتاب کلچر کے فروغ کے لئے کیا تجاویز دیں گے؟

ج: ٹی وی، انٹرنیٹ کتاب کی دوری کی اہم وجہ ہیں۔ اگرچہ انٹرنیٹ، کیبل کتاب کا نعم البدل کبھی نہیں ہوسکتا اور نہ ہی کتاب کی کمی کو پورا کرسکتا ہے۔ اساتذہ اور والدین کو چاہئے کہ پرائمری کی سطح پر بچوں کو کتب بینی کی طرف راغب کریں، والدین بچوں کو ایک دو گھنٹے سے زیادہ ٹی وی دیکھنے کی اجازت نہ دیں اور اس کے ساتھ ساتھ گھر میں مطالعہ کا ماحول پیدا کریں۔ اچھی سٹوری بک بچے کو پڑھنے کے لئے دیں۔ اس سے بچے میں مطالعے کا رجحان پیدا ہوگا، اور بچپن سے ہی اس میں کتاب پڑھنے کی عادت پختہ ہوگی۔ سکولوں میں کلاس لائبریری کا طریقہ رائج کیا جائے۔ سکولوں کالجوں میں ہفتہ وار بزم ادب کا انعقاد کیا جائے اور اساتذہ طالب علموں کو اچھی کتابیں پڑھنے کی ترغیب دیا کریں۔ پرائمری سطح پر طلبا کو قصے کہانیوں کی باتصویر کتابیں مطالعے کے لئے دی جائیں۔

ہر چھ ماہ یا ہر سال کتب کی نمائش کا اہتمام کیا جائے اور خصوصی رعایت کے ساتھ کتاب فروخت کی جائے تاکہ عوام میں کتب بینی کا شوق اُجاگر ہو۔ چھوٹے پیمانے پر گھروں میں نجی لائبریریاں بنانے کے رجحان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ حضرت علیؑ کا

Marfat.com

ارشادِ گرامی ہی ''وہ گھر ویرانے سے بدتر ہے جن میں کتابیں نہ ہوں۔''

بعض ہائی سکولوں میں جہاں کتابوں کی تعداد زیادہ ہے لائبریری نظام قائم ہے۔ لیکن مڈل اور پرائمری سکولوں میں یہ نظام قائم نہیں۔ کتابیں الماری میں بند کر دی جاتی ہیں۔ بالعموم یہ کتابیں طلباء کی دسترس میں نہیں آتیں، نتیجہ یہ ہے کہ کتاب کے مطالعے کا ذوق کم ہوتا جا رہا ہے اور طلبا کی علمی قابلیت بھی اسی تناسب سے زوال پذیر ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ بچوں کو پرائمری درجے سے ہی کتاب، رسالے اور اخبار سے مانوس بنایا جائے۔ اور لائبریری میں بیٹھ کر مطالعہ کرنے کا ایک خاص پیریڈ روزانہ مختص کیا جائے۔ جس میں اساتذہ طلباء کو نئی اور اچھی کتابوں سے متعارف کرائیں اور طلباء میں لکھنے کا شوق اجاگر کرنے کے لئے مختلف موضوعات پر مقابلے کرائے جائیں۔

س: ملک صاحب موجودہ حالات کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

ج: وطن عزیز انتہائی نازک دور سے گزر رہا ہے۔ آئے روز بم دھماکوں نے معمولاتِ زندگی کو ختم کر کے رکھ دیا ہے۔ رہی سہی کسر بجلی کے بحران اور لوڈ شیڈنگ نے پوری کر دی ہے۔ مہنگائی ہے کہ کہیں رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ اس جدید دور میں انسان کا زندہ رہنا مشکل سے مشکل تر ہو گیا ہے۔

س: ملک کے مسائل کس طرح حل ہو سکتے ہیں؟

ج: پاکستان دنیا میں شاید واحد ملک ہے جو ''تھنک ٹینک'' کے بغیر چل رہا ہے جبکہ ملک میں اعلیٰ صلاحتیں رکھنے والے دانشوروں کی کمی نہیں اور یہ سب ملک کی ترقی کے آرزومند ہیں اور ملکوں کی برادری میں پاکستان کو بلند مقام پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ بدقسمتی سے انہیں پیش بینی کا موقعہ ہی نہیں دیا جاتا ہے۔ حکومتیں انہیں فاصلوں پر رکھتی ہیں، میرے خیال میں چاروں صوبوں اور آزاد کشمیر قبائل علاقہ جات سے ایسے محب وطن

Marfat.com

دانشوروں پر مشتمل ایک ''تھنک ٹینک'' قائم کیا جائے جس کے سربراہ جناب مجید نظامی اور عبدالستار ایدھی ہوں۔ یہ ''تھنک ٹینک'' سو افراد پر مشتمل ہونا چاہیے اور اس میں تمام مکاتب فکر کی نمائندگی ہونی چاہئے۔ یہ ''تھنک ٹینک'' آج کے مسائل پر مثبت انداز میں غور و فکر کرے اور مستقبل میں رونما ہونے والے حالات کو بھی پیش نظر رکھے۔ اس کی سفارشات کو عوام کی حمایت حاصل ہو اور پھر ایوان بالا اس کی تجاویز کو عملی جامہ پہنائے تو جس طرح جاپان اور چائنہ نے معاشی ترقی کی ہے اسی طرح پاکستان بھی ہر شعبے میں ترقی کر سکتا ہے۔

Marfat.com

ملک کے نامور ناشر اور ادیب

ملک مقبول احمد سے ایک مکالمہ

پروفیسر تنویر حسین

سیرِ چمن کو نکلیں تو قسم قسم کے پھول مرکز نگاہ بنتے ہیں۔ پھولوں کے رنگ مختلف اور ان کی خوشبوئیں مختلف۔ کہیں نسرین ہے اور کہیں نسترن، کہیں دائے بیل ہے اور کہیں موگرا۔ کہیں سوسن اپنی چھب دکھلاتا ہے اور کہیں نیلوفر اپنا حسن اپنے ہونٹوں سے بیان کرتا ہے۔ گلِ سرخ ہی کی مثال دیکھئے۔ نجانے اس کے کتنے رنگ ہیں۔ اتنی حسین و جمیل کائنات شاید بے رنگ ہی رہتی۔ اگر اللہ تبارک وتعالیٰ انسان کو تخلیق نہ کرتا۔ جس طرح ایک درخت کے پتے دوسرے درخت کے پتوں سے مختلف ہوتے ہیں، اسی طرح انسان اپنی عادات، اپنے خصائل اور اپنی نفسیات کے حوالے سے مختلف ہوتے ہیں۔ ایک دھیمی طبیعت کا مالک ہوتا ہے اور دوسرا رعب و دبدبے والا۔ کوئی نرم خو اور صلح جو ہوتا ہے اور کوئی سخت طبع۔ کچھ لوگ اپنی شخصیت کو دوسروں سے فاصلے پر رکھتے ہیں یعنی کم آمیز ہوتے ہیں اور کچھ دوسروں سے جلد بے تکلف ہو جاتے ہیں اور گھل مل جاتے ہیں۔ کسی کو اپنی تنہائیوں سے پیار ہوتا ہے اور کسی کو بزم آرائیوں سے۔ آج میرا مکالمہ جس شخصیت سے ہونے والا ہے، اس کی شخصیت کے اسیر تو اس عہد کے سبھی ادیب و شاعر ہیں۔

ہم ہوئے ، تم ہوئے کہ میر ہوئے
اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

یہ شخصیت وطن عزیز کے ایک اہم اشاعتی ادارے ''مقبول اکیڈمی'' کے

Marfat.com

پروپرائیٹر جناب ملک مقبول احمد کی ہے۔

ملک مقبول احمد کے چہرے سے وجاہت اور شرافت ٹپکتی ہے۔ اُن کی آنکھیں اتنی خوبصورت ہیں کہ اب بھی بہت حسینائیں ان میں ڈوب کر جانبر نہیں ہوسکتیں۔ قد آور شخصیت ہیں۔ اکثر سفید اور اجلا لباس زیب تن کرتے ہیں۔ یہ لباس ان کے جسم پر بہت پھبتا ہے۔ ملک صاحب من کے بھی اتنے ہی اجلے ہیں، جتنے تن کے۔ آج معاشرہ انحطاط پذیر ہے۔ انسانوں کے ظاہری اور باطنی اوصاف میں تضاد دکھائی دیتا ہے۔ ظاہر باطن کی یکسانیت کا مقابلہ ہوتو ملک صاحب یہ مقابلہ حسن ظاہر و باطن جیت جائیں گے۔

ذوق بھی پایا تو کتابوں کا، کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ عطر فروش کے پاس بیٹھنے سے اور کچھ نہیں خوشبو تو جاں کو معطر و معنبر کرے گی، اسی طرح دھونکنی دھونکنے والے کی صحبت اختیار کی جائے تو دھواں لازمی آئے گا۔ ملک مقبول احمد کتابوں میں رہتے بستے ہیں۔ ان کے زیست کرنے کا چلن کتاب سے عبارت ہے۔ جس طرح کسی نے غزل کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ غزل میں صنفِ نازک کے بارے میں باتیں کی جاتی ہیں، اس کے حسن و جمال کی تعریف کی جاتی ہے۔ اس میں صنفِ نازک سے عشق و محبت کا ذکر اذکار ہوتا ہے۔ بعینہٖ ملک صاحب کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتابوں کے بارے میں باتیں کرتے ہیں، کتابوں کی باتیں کرتے ہیں، کتابوں کے لباس کے بارے میں فکر مند رہتے ہیں۔ کتابوں کو نئے نئے چہرے عطا کرنے میں مگن رہتے ہیں۔ غرض کتابوں کے حسن و جمال کو نکھارنے میں محو رہتے ہیں۔ کتابوں سے ملک صاحب کا عشق شیریں فرہاد، سسی پنوں، ہیر رانجھا اور سوہنی مہینوال جیسا سچا عشق ہے۔ کتابوں کے عشق نے ملک صاحب کے من اتنا مُشک مچایا کہ وہ خود بھی مصنف ہو گئے۔ ''سفر جاری ہے'' کے نام سے ایسی ''آپ بیتی'' لکھی کہ بڑے بڑے ادباء و شعراء ان کے قلم کی سحر آفرینی

Marfat.com

سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

جناب ملک مقبول احمد صاحب کی بہت خوبیوں میں ایک خوبی کا میں نے قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔ ملک صاحب ''وقت'' کو ''عطیہ خداوندی'' اور نعمت عظمیٰ گردانتے ہیں۔ ملک صاحب نے ساری زندگی اپنے کام کی طرف بھرپور توجہ دی، جس کا صلہ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے انہیں ایک بہت بڑے ادارے کی صورت میں دیا۔ عمر کے اس حصے میں آ کر ملک صاحب نے جوانی والی ''پھڑلو''، ''پھڑلو'' سے آزادی حاصل کر لی ہے۔ وہ اکثر بتاتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد کو کھانے کمانے کے بہترین ذرائع سے نوازا ہے تو انہیں اب اپنا وقت یادِ الٰہی میں گزارنا چاہیے۔ ملک صاحب پانچ وقت کے نمازی ہیں اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرتے ہیں۔ مقبول اکیڈمی اردو بازار دس بجے کے قریب آتے ہیں اور ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد اپنے دوست ڈرائیور کو ''باگاں کرول موڑ'' کا اذن دیتے ہیں۔ ملک صاحب نے دن بھر کو مختلف اوقات میں تقسیم کر رکھا ہے۔ کاروبار، عبادت، اہل خانہ، اعزا و اقربا اور دوست احباب سب کے لیے وقت نکالتے ہیں۔ ہم نے بہت سے ناشرین کا رویہ دیکھا ہے کہ بات بے بات دوسروں کا منفی تذکرہ یعنی اپنی زبان کو خواہ مخواہ غیبتوں سے آلودہ کرتے نظر آتے ہیں۔ کوئی ترقی کے زینے طے کر رہا ہو، کسی قسم کی کاروباری کامیابی حاصل کر رہا ہو، اس کو بغیر تمہید اور سیاق و سباق کے موضوع سخن بنا لیتے ہیں اور اس کے ایسے ایسے لتے لیتے ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ ملک مقبول احمد صاحب اس بہت بڑی معاشرتی برائی سے کوسوں دور رہتے ہیں۔ ان کی محفل میں بہت سے شاعر ادیب اور دیگر احباب اپنے اس من پسند موضوع پر دوغزلے اور سہ غزلے کہتے دکھائی دیتے ہیں لیکن ملک صاحب اس کڑے وقت کو نہایت صبر، سلیقے اور دانش مندی سے گزارتے ہیں کہ ان کی اس غیبت فری خوبی پر رشک آتا ہے۔

Marfat.com

ذیل میں ملک کے نامور ناشر اور مصنف جناب ملک مقبول احمد صاحب سے ہونے والی گفتگو قارئین کی نذر ہے۔

پروفیسر تنویر حسین: ملک صاحب! آپ برسہا برس سے لاہور میں مقیم ہیں۔ کیا آپ اور آپ کے والدین اسی شہر کے رہنے والے ہیں یا آپ کا آبائی علاقہ کوئی اور ہے؟

ملک مقبول احمد: میرے والد محترم مرحوم و مغفور کا اسمِ گرامی حاجی ملک لال دین تھا۔ میں نے اعوان قبیلے میں آنکھ کھولی۔ میرا تعلق شہر اقبالؒ سیالکوٹ کے ایک گاؤں ''دیووال'' سے ہے۔ یہ گاؤں جموں کشمیر کی سرحد پر واقع ہے۔

پروفیسر تنویر حسین: آپ کی زبان پر کشمیر کا نام آیا۔ آپ کا گاؤں اس جنت نظیر وادی کی سرحد پر تھا۔ کیا آپ کو کبھی کشمیر جانے کا اتفاق ہوا؟

ملک مقبول احمد: اس جنت نظیر وادی کی سیر کا ارمان تو میرے دل کے نہاں خانوں میں موجود ہے۔ اللہ کرے کہ ہندو غاصب اور ظالم فوج اس وادی سے نکل جائے تو کشمیریوں کو یو۔ ایس۔ او کی قراردوں کے مطابق اپنی قسمت کا فیصلہ خود کرنے دیا جائے تو اس جنت نظیر وادی کی سیر و سیاحت کا خواب پورا ہو سکتا ہے۔ ہمارے گاؤں سے جموں کے پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں دعوتِ نظارہ دیتیں تو آنکھیں ان مناظر سے مسحور تو کر سکتا تھا لیکن انہیں بیان کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔ یہ کائنات کا حسن تھا۔ میرے لیے یہ ایک طلسمی فضا تھی۔ جی میں آتا کہ کاش انسان کے پر ہوتے اور وہ ان دور بہت دور اور ان دیکھی سرزمینوں کی سیر کر لیتا۔

پروفیسر تنویر حسین: آپ کے والد صاحب کس پیشے سے وابستہ تھے۔ آپ اپنی ابتدائی تعلیم اور دیگر تعلیمی مراحل سے اپنے قارئین کو آگاہ کیجئے۔

ملک مقبول احمد: دھرتی کا سینہ چیر کر اناج اُگانا ہمارے خاندان کے حصے میں آیا۔

Marfat.com

میرا تعلق پنجاب کے ایک دیہات سے ہے۔ دیہاتوں میں کم وبیش سب لوگ پیشۂ زراعت سے وابستہ ہوتے ہیں۔ بہرحال میرے والد محترم نے اپنی زندگی کے بیش قیمت مہ وسال سرکاری ملازمت کی نذر کیے۔ ہمارا گھر کھلی فضا میں واقع تھا۔ اپنے چوبارے پر بیٹھنا مجھے اتنا مزا دیتا تھا کہ وہ مزا اور لطف بلخ اور بخارے کی سیر سے زیادہ تھا۔ میں جس طرف نگاہ اُٹھاتا، کھیتوں میں ہری بھری فصلوں کی چادریں ہوا کے دوش پر لہراتی دکھائی دیتیں۔ میری تعلیم کے لیے میرے والدین نے لوئر مڈل سکول باجڑہ گڑھی کا انتخاب کیا۔ یہ سکول سیالکوٹ سے ظفروال جانے والی سڑک کے کنارے واقع ہے۔ سکول کا سبق مجھے بآسانی ازبر ہو جاتا اور میں اپنے اساتذہ کو فرفر سبق سنا بھی دیا کرتا۔ اس کے ساتھ ساتھ میری من موجی قسم کی طبیعت تھی۔ پابندی کا کوڑا میری آزاد طبع کو پسند نہ تھا۔ اس لیے میں اپنی تعلیمی ساعتوں میں سے کچھ وقت تفریح طبع کے لیے بھی نکال لیتا تھا۔ سکول سے چھٹی کر لینا میرے لیے چنداں مشکل نہیں تھا۔ ہمارا گھرانہ علاقے اور گاؤں بھر میں ایک معزز گھرانہ تھا۔ میرے چچا جان اور تایا جان ایسی معتبر اور معزز ہستیاں تھیں کہ لوگ ان سے اپنے ذاتی چھوٹے موٹے مسائل کے حل کے لیے مشورے لیتے۔ اس طرح گاؤں میں وہ توقیر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے۔

اس دور میں مڈل جماعت ایک اہم جماعت ہوتی تھی۔ ہر سکول کے اساتذہ کی خواہش ہوتی تھی کہ اُن کے سکول کے طلبہ مڈل کے امتحان میں زیادہ نمبروں سے کامیابی حاصل کریں۔ اس لیے اساتذہ اپنے طلبہ کو اپنی اولاد سمجھ کر اُن پر شہتوت، کیکر اور ٹاہلی کے ڈنڈے توڑتے۔ اس سے مراد اساتذہ کا طلبہ پر تشدد نہیں بلکہ بچوں کو محنت سے پڑھانا ہے۔ جس طرح آج کل ہر سو ٹیوشن سنٹر کھمبیوں کی طرح اُگ آتے ہیں، ان دنوں ٹیوشن کلچر موجود نہیں تھا۔ اساتذہ رات گئے تک اپنے طلبہ کو بغیر کسی صلے اور ستائش کے پڑھانے

Marfat.com

میں محو نظر آتے۔ وہ اپنے طلبہ سے کہا کرتے کہ منڈی میں ''سونا'' لے کر جانا ہے یعنی امتحان کے لیے بچوں کو بہترین تیاری کرانی ہے۔ میں ان اساتذہ کو اب بھی خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں، جنہوں نے ہماری تعلیم و تربیت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

میں نے ورنیکلر مڈل سکول رسول پور بھلیاں سے پاس کیا۔ 1947ء میں میں نے پٹوار کا کورس کرنے کے لیے گوجرانوالہ میں داخلہ لیا لیکن میرے ضمیر سے آواز آئی کہ اس محکمہ میں رشوت لینے کے سوا چارہ کوئی نہیں۔ محکمہ جنگلات میں ملازمت کرنے میں یہی رشوت کا عنصر اور عذر مانع ہوا۔ میرے والد صاحب کے ایک دوست جو وزیر آباد میں تعینات تھے، نے محکمہ جنگلات میں ملازمت کرنے اور اس کے گوناگوں ذرائع آمدن کے سبز باغ دکھائے لیکن رشوت ستانی سے فطری نفرت نے مجھے ان سبز اور پھل دار درختوں سے دور ہی رکھا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا مجھ پر خاص کرم ہے۔

اب منشی فاضل کا آسمان سامنے تھا۔ اس آسمان کو چھونے کی ٹھان لی اور کتابوں کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ میرے احباب نے مجھے یہ شعر بہ تکرار سنانا شروع کر دیا۔

پڑھے فارسی بیچے تیل
دیکھو قدرت کے یہ کھیل

میں اپنی دھن میں مست فارسی کی کتابوں کے مطالعے میں کھویا رہا، میں نے منشی فاضل کی سند تو حاصل نہ کی لیکن فارسی زبان کی شدھ بدھ مجھے ہو گئی۔ انہی دنوں گورنمنٹ نارمل سکول نارووال میں داخلے کا اشتہار شائع ہوا۔ میں نے درخواست کی کشتی نارووال کی طرف روانہ کر دی۔ مجھے نارمل سکول میں داخلہ مل گیا۔ میں نے جے وی ٹیچر کا کورس مکمل کر لیا اس کے بعد میرا تقرر بطور اول مدرس (ہیڈ ماسٹر) گورنمنٹ پرائمری سکول موضع کلوئے میں ہو گیا۔ آتش اس وقت جوان نہیں، نوجوان بلکہ لڑکا تھا۔ اس لیے اپنے

Marfat.com

شاگردوں کو پڑھاتے ہوئے میں ان کا اُستاد کم اور دوست اور ہم عمر زیادہ لگتا تھا۔ علامہ اقبالؒ کی شاعری سے عشق کا سلسلہ انہی سہانے دنوں کی یادگار ہے۔ میں نہایت جوش اور جذبے کے ساتھ اپنے گاؤں سے دوسرے گاؤں بذریعہ سائیکل پڑھانے جایا کرتا تھا۔ میری زبان پر علامہ اقبالؒ کے اشعار جاری رہتے اور ان اشعار کے لیے سائیکل کے چلنے کی آواز ساز کا کام دیتی۔ جب سائیکل نشیب سے فراز کا رخ کرتی یعنی کوئی چڑھائی کا مشکل مقام آتا تو میں سائیکل کے پیڈلوں پر زور دیتے ہوئے اپنے آپ سے اقبالؒ کے لہجے میں یوں مخاطب ہوتا:

تو شاہیں ہے ، پرواز ہے کام تیرا
تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں

پروفیسر تنویر حسین: بچپن کا زمانہ بڑا خوبصورت زمانہ ہوتا ہے۔ اس عمر میں کیا آپ اپنے بچپن کو آواز دیتے ہیں؟ کیا گاؤں کی یاد اب بھی آتی ہے۔

ملک مقبول احمد: اس عمر میں جب میں چشمِ تصور میں اپنے بچپن کو دیکھتا ہوں تو ایک ٹھنڈا میٹھا اور سہانا دور نظروں میں گھومنے لگتا ہے۔ میں اپنی بے جی (والدہ محترمہ) کو اب بھی اپنی آنکھوں کے سامنے چکی پیستے، چاول چھڑتے، اور بھینسوں کا دودھ دوہتے دیکھتا ہوں۔ جب میرے ذہن میں بے جی کا خیال آتا ہے تو میں ان کے سامنے اتنا ہی چھوٹا ہو جاتا ہوں۔ میری بے جی میرے لیے میرے من پسند کھانے میٹھے چاول، حلوہ اور پوڑے تیار کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ گاؤں کی دیگر سوغاتیں، السی کی پنیاں، ماش کی دال کا حلوہ اور سوجی کی برفی بھی کھانے کو ملتیں۔ آج جب ہم نئی نسل کو برگر، شوارمے اور تکے کباب کھاتے دیکھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ آج خالص اور فائدہ مند چیزوں سے منہ موڑے بیٹھے ہیں۔ صبح چاٹی کی لسی پینے کو ملتی تو روح کو تازگی نصیب ہوتی۔ دن بھر میں کئی مرتبہ لسی،

Marfat.com

شربت اور ستو پیتے۔

ہمارے گاؤں کے ساتھ کنوئیں تھے۔ یہاں لڑکے بالے، نوجوان اور بوڑھے خود نہاتے اور اپنے مویشیوں کو بھی نہلاتے۔ خواتین پانی بھرنے بھی آتیں اور کپڑے بھی دھوتیں۔ کنوئیں کے آس پاس آموں کے درختوں کے جھنڈ تھے۔ لڑکے آموں پر سنگ باری کیا کرتے۔ ہم کھیتوں سے تربوز اور خربوزے توڑ توڑ کر کھاتے۔ ان تربوز اور خربوزوں کی خاص مہک میں اب بھی محسوس کرتا ہوں۔

پروفیسر تنویر حسین: آج کل بچے جگہ جگہ کرکٹ کھیلتے نظر آتے ہیں۔ آپ کے بچپن میں کون کونسے کھیل ہوا کرتے تھے؟

ملک مقبول احمد: ہمارے بچپن میں گُلی ڈنڈا، بنٹے (کینچے) اور اخروٹ کھیلنے کا رواج تھا۔ لُکن میٹی (چھپن چھپائی) کا وقت سرِ شام کھانے کے بعد شروع ہو جاتا تھا۔ ہم سب دوست شام کے کھانے کے بعد فارغ ہو کر اکٹھے ہو جاتے اور ''لُکن میٹی'' کھیلتے۔ گاؤں میں کھلی کھلی حویلیاں ہوا کرتی تھیں۔ ہم کسی حویلی میں جا کر چھپ جایا کرتے تھے اور تلاش کرنے والے کئی کئی گھنٹے ہمیں تلاش کرنے میں ناکام رہتے۔ چاندنی راتوں میں ''کوکلا چھپاکی'' کھیلتے۔ آج شہر کی زندگی کتنی بدل گئی ہے بلکہ اب تو ہر طرف دھماکوں کا خوف ہے۔ اس کے علاوہ ''والی بال، فٹ بال، ہاکی اور رگڑ بچ'' جیسے کھیل بھی کھیلے جاتے میلوں میں کشتیوں اور کبڈی کا انعقاد اہتمام سے کیا جاتا۔ کئی کئی دن پہلے ڈھول کی آوازیں سماعتوں کو میلے کی آمد آمد کی نوید سناتیں۔

پروفیسر تنویر حسین: ملک صاحب! آج نئی نسل کمپیوٹر اور انٹرنیٹ سے مستفید ہو رہی ہے۔ اس کے علاوہ نئی نسل کی تفریح کے لیے ان گنت چیلنجز ہیں۔ آپ کے بچپن میں تفریح کے کیا سامان تھے۔ ذرا نئی نسل کو بتایئے؟

Marfat.com

ملک مقبول احمد: بندر اور ریچھ کے تماشے دکھانے والے تو لاہور کے گلی کوچوں میں کبھی کبھار اب بھی نظر آ جاتے ہیں۔ بندر کے سسرال جانے کا سفر تا حال جاری ہے اور اپنی ناراض بیگم کو منا کر لانے میں وہ اب بھی سرگرم دکھائی دیتا ہے۔ اس دور میں مشہور گانے والے ٹولیوں کی صورت میں آتے۔ ان کے آنے کی خبر گرم ہوتی تو اِرد گرد کے لوگ برسات کے بادلوں کی طرح امڈ آتے۔ یہ گلوکار ساری ساری رات اپنے فن سے محفل کو گرماتے۔ لوگ ان سے اپنی پسند اور فرمائش سے ''لوک گیت، ماہیے، ٹپے'' وغیرہ سنتے۔ رات گزرنے کے ساتھ محفل کا اوج وعروج دیدنی ہوتا۔ ایک سماں سا بندھ جاتا۔ گانے والوں کی حوصلہ افزائی اور ان کے صلے کا اہتمام ''ویلوں'' سے کیا جاتا۔ نئی نسل کے لیے ''ویل'' کا لفظ بھی اجنبی ہے۔ ویل سے مراد شادی بیاہ یا کسی خوشی کی تقریب میں گانے بجانے والوں کو خوش ہو کر روپے دینا ہوتا ہے۔

گاؤں میں سب سے بڑی تفریح جیسے آج کل سینما اور سٹیج ڈراما ہے، ''راس'' تھی یہ ایک طرح کا ڈراما یا ناٹک ہی ہوتا تھا۔ اس ناٹک میں جو کردار کام کرتے تھے، وہ ''راس دھاریے'' کہلاتے تھے۔ ان ناٹکوں میں عموماً ہیر رانجھا، سسی پنوں اور سوہنی مہینوال کی داستانیں کرداروں کی صورت میں پیش کی جاتیں۔ ہیروئن کا کردار بھی مرد حضرات ہی کرتے۔ مثلاً جب ہیر کا سوانگ رچانے والے لڑکا نسوانی آواز میں جذباتی مکالمے بولتا تو بچے، بوڑھے اور جوان اپنے دل تھام کر رہ جاتے۔ پھر ان کرداروں پر نوٹوں کی بارش شروع ہو جاتی۔ یہ ناٹک متواتر چلتے رہتے۔ راس دھاریہ جب کسی سے روپیہ لیتا تو روپے دینے والے کے نام کا اعلان کرتا اور اس کی مدح سرائی کے ساتھ اس کی خوش حالی کی دعا بھی کرتا۔

ہمارے بچپن میں بازی گر اور نٹ بھی اپنے کرتب دکھانے گاؤں گاؤں آتے۔

Marfat.com

یہ بازی گر نظر کو دھوکا دیتے۔ غالب نے کہا ہے

دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

تنے ہوئے رسے پر چلنا، قلابازیاں کھانا، اپنا توازن رکھتے ہوئے بانس اٹھانا اور رسے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلے جانا ان بازی گروں کے بائیں پاؤں کا کام تھا۔

پروفیسر تنویر حسین: ملک صاحب! اپنے سکول کے زمانے کا کوئی دلچسپ واقعہ سنایئے؟

ملک مقبول احمد: میں پڑھائی میں اچھا تھا لیکن سکول سے چھٹیاں کرنے کا چسکا لگ گیا۔ ہمارے سکول (لوئر مڈل سکول باجڑہ گڑھی) کے نزدیک بیری کے چند درخت تھے۔ میرا ایک دوست گیان چند تھا۔ میں اور میرا دوست ان بیری کے درختوں پر بیٹھ کر خوش گپیاں لگاتے، گاؤں کے حالات پر تبصرے فرماتے اور اوٹ پٹانگ منصوبے بناتے۔ ان درختوں پر بیٹھ کر ہم خود کو ''کیموفلاج'' کر لیتے۔ اس طرح ہم تک رسائی حاصل نہ کی جاسکتی۔ ایک روز میرے والد صاحب میری تعلیمی کارکردگی کی رپورٹ لینے سکول آ پہنچے۔ میری پناہ گاہ تو بیری کا درخت تھا، جہاں میں اپنے جگری یار کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اپنے والد صاحب کو سکول کی طرف جاتے دیکھ کر خود کو ایک کھیت میں چھپا لیا تھا۔ سکول میں ہم دونوں کی عدم موجودگی پر والد صاحب فوراً گھر واپس ہو لیے۔ گیان چند کا سامنا والد صاحب سے ہوگیا۔ والد صاحب نے گیان چند کے ساتھ مجھے تلاش کرنا شروع کر دیا جب گیان چند کی نظر مجھ پر پڑی تو اس نے مجھے پکڑوا دیا۔ حیران کن بات ہے کہ والد صاحب نے مجھ سے اتنی بات بھی نہ کہی کہ تم کہاں تھے؟ میری دھلائی کا فریضہ میری پیاری ''بے جی'' ہی کو انجام دینا پڑا۔ ''بے جی'' کے تربیت کرنے کا انداز آج بھی پیار کی صورت میں یاد آتا ہے۔

Marfat.com

پروفیسر تنویر حسین: جس طرح آج کل والدین یہ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے ڈاکٹر، انجینئر بنیں، ایم۔ بی۔ اے اور سی۔ ایس۔ ایس وغیرہ کریں۔ آپ کے والدین آپ کے مستقبل کے بارے میں کیا سوچتے تھے؟

ملک مقبول احمد: جب میں ورنیکلر مڈل کے امتحان میں کامیاب ہوا تو میری یہ خواہش اور کوشش تھی کہ میں ہائی سکول میں داخلہ لوں۔ ہمارے گاؤں کے قرب وجوار میں کوئی ہائی سکول نہیں تھا اور والدین مجھے اپنی نگاہوں سے دور کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ ان دنوں دیہات میں ورنیکلر مڈل کرنے کے بعد پٹواری بننے کے کورس کو نہایت پرکشش سمجھا جاتا تھا۔ پٹواری کے اختیارات بہت وسیع ہوتے تھے، اس لیے اس پیشے میں تنخواہ کے علاوہ بالائی آمدن کے مواقع زیادہ تھے۔ والد صاحب کو ان کے دوست احباب نے یہ مشورہ دیا کہ وہ اپنے بیٹے کو پٹوار سکول میں داخلہ لے دیں۔ میں نے والد صاحب کے آگے سرِ تسلیم خم کیا اور گوجرانوالہ پٹوار سکول میں داخلہ لے لیا۔ جب میں نے پٹوار سکول میں بڑے بڑے رجسٹروں جمع بندیوں، کھاتوں، زمین کی پیمائش، فصلوں کے حساب کتاب اور مالیے وغیرہ کے تعین میں اپنی دلچسپی کا کوئی سامان نہ پایا تو اس سے کنارہ کش ہو گیا۔

پروفیسر تنویر حسین: جب آپ کو سکول میں معلمی کی ملازمت ملی تو اس دور میں آج کی طرح سفارش اور رشوت کا عمل دخل کتنا تھا؟

ملک مقبول احمد: اس دور میں سفارش اور رشوت جیسی معاشرتی برائیوں کا وجود تک نہیں ہوتا تھا۔ جو طلبہ معلمی کا کورس کر لیتے، ان کے نام اور پتے ضلعی انسپکٹر تعلیم کے دفتر میں پہنچ جاتے۔ جب ضلع میں کسی جگہ اسامی خالی ہوتی تو فہرستوں کے مطابق تربیت یافتہ اساتذہ کو تعینات کر دیا جاتا۔ جب میں نے معلمی کا کورس مکمل کر لیا تو اس کے ایک سال بعد میرا تقرر گورنمنٹ بورڈ ''پرائمری سکول'' کلوے ضلع سیالکوٹ میں ہو گیا۔

Marfat.com

پروفیسر تنویر حسین: معلمی سے ادارت تک کا سفر کیسے طے ہوا۔ گاؤں کے بچوں کو تعلیم دیتے دیتے رسالہ نکالنے کا خیال کیسے آیا؟

ملک مقبول احمد: ہمارے گاؤں کے پاس ایک مشہور گاؤں ''وِرک'' ہے۔ چودھری دسوندھی خاں اپنے علاقے کے ذیلدار تھے۔ ان کا تعلق اس گاؤں سے تھا۔ چودھری صاحب بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ اس لیے ان کے چاہنے والوں کا حلقہ کافی وسیع تھا۔ میں سکول آتے جاتے ان سے ملاقات کا شرف ضرور حاصل کرتا۔ میں جب ان سے ملتا، وہ نہایت شفقت آمیز لہجے میں میرا حال احوال پوچھتے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ شجرِ سایہ دار ہیں، جن کی چھتر چھاؤں میں میں دو گھڑی ستا لیتا ہوں۔ ایک روز میں ان کے پاس بیٹھا تو میرے دل کی بات ہونٹوں پر آ گئی۔ میں نے چودھری صاحب سے کہا کہ میں اس ملازمت سے اپنا مستقبل وابستہ کرنے کا خواہاں نہیں ہوں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں کوئی بڑا کام کرنے کا عزم اپنے دل میں رکھتا ہوں۔ ان کے استفسار پر میں نے بتایا کہ میرا ارادہ ایک رسالہ نکالنے کا ہے۔ میں نے رسالے کا نام ''چودھویں صدی'' بھی بتایا۔ چودھری صاحب جب میرے ان خیالات سے آگاہ ہوئے تو ان کی خوشی ان کی باتوں سے ظاہر ہونے لگی۔ ان کی خوشی کا اظہار علامہ اقبالؒ کے اس شعر کے مصداق تھا۔

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

چودھری صاحب نہ صرف میرے خیالات سے خوش ہوئے بلکہ انہوں نے میرے اس منصوبے کی عملی معاونت کے لیے اپنی بیٹھک بھی میرے سپرد کر دی۔

پروفیسر تنویر حسین: آپ اپنے رسالے ''چودھویں صدی'' کے بارے میں بتائیے کہ آپ کے ساتھ کن لوگوں نے کام کیا۔ ایڈیٹر کون تھے؟ پرچہ کیسا تھا؟

Marfat.com

ملک مقبول احمد: میرے لیے یہ اعزاز کی بات تھی کہ میرے پرچے کے نگران ملک کے نامور شاعر احسان دانش تھے۔ محمد اکرم اس کے ایڈیٹر تھے۔ میں مینجنگ ایڈیٹر تھا۔ ہمارا رسالہ 23x36/4 پر طباعت پذیر ہوتا۔ لیتھو مشین ایک ایک رنگ چھاپتی۔ تصویر چھاپنے کے لیے الگ سے بلاک تیار کروانا پڑتے۔ پندرہ پندرہ میگزین کی سالانہ ممبرشپ فیس صرف پانچ روپے ہوتی تھی۔ ہمارے پرچے کی اشاعت آٹھ ہزار تھی۔ محکمہ اطلاعات کے ڈائریکٹر معروف علمی ادبی شخصیت شان الحق حقی نے میرے رسالے کو سرکاری اشتہارات کے لیے منظور فرمالیا۔ اس پرچے کی مقبولیت کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ گورنر مغربی پاکستان جناب اختر حسین نے ایک سرکاری مراسلے کے ذریعے میرے پرچے کو چند رسائل میں ایک ممتاز حیثیت کا حامل رسالہ قرار دیا۔

پروفیسر تنویر حسین: ''چودھویں صدی'' کتنے عرصے تک نکلتا رہا؟ کیا اس کے علاوہ بھی آپ نے کوئی رسالہ نکالا؟

ملک مقبول احمد: چودھویں صدی تین چار سال تک جاری رہا۔ اس کے بعد میں نے ''نئے زاویے'' سے ایک ادبی پرچے کی داغ بیل ڈالی۔ میرے تخیلات کا توسن سرپٹ دوڑتا رہتا تھا۔ یہ میرے تخیل کی ایک زقند تھی۔ یہ پرچہ بھی زمانے کی سرد گرم ہوا کے تھپیڑوں کی تاب نہ لاتے ہوئے بند ہو گیا۔

پروفیسر تنویر حسین: اب آتے ہیں آپ کے اس منصوبے کی طرف جس کے ذہن میں آتے ہی آپ نے زندگی کی ایک بڑی شاہراہ پر قدم رکھا۔ آپ کے یقین محکم، حوصلے اور شب و روز محنت نے آپ کے ادارے ''مقبول اکیڈمی'' کو پاکستان کے چند معتبر اور مشہور پبلشنگ اداروں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ اپنے قارئین کو اس ادارے کے قیام اور اس کی ترقی کی کہانی سنائیے؟

Marfat.com

ملک مقبول احمد: آپ نے میری شب و روز محنت کا تذکرہ کیا ہے۔ میں اپنے ادارے کے قیام اور اس کی ترقی میں اپنے پروردگار ہی کا کروڑ ہا رب شکر ادا کرتا ہوں۔ یہ صرف اللہ سبحانہ تعالیٰ کا مجھ پر کرم ہے ورنہ مجھ جیسے بہت سے لوگ دن رات محنت مشقت کرتے ہیں لیکن ان کے لیے اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ بہرحال جب میں نے اپنے ادارے کے قیام کا ارادہ باندھا تو میں نے اپنے ملک کے بڑے بڑے اداروں کا جائزہ لیا۔ ان کے کاروباری طریقوں سے واقفیت حاصل کی۔ کسی نئی منزل کی طرف گامزن ہونا آسان نہیں ہوتا۔ ہزار طرح کے خوف، وسوسے خاص کر کاروبار میں گھاٹے کے خدشات، انسان کے ارادوں کو متزلزل کرتے ہیں۔ بہرحال میں نے ان اوہام اور وسوسوں کو قریب نہ پھٹکنے دیا۔ کاروبار شروع کرتے ہوئے مجھے کسی قسم کا خوف بھی لاحق نہ ہوا۔ میں رزقِ حلال کے لیے تگ و دو کر رہا تھا۔ ویسے کسی قسم کی مقابلہ آرائی یا دوسروں کو نیچا دکھانا میرے پروگرام میں شامل نہیں تھا۔ بلکہ میں بڑے اداروں کی کامیابی اور ان کی ترقی کو اپنے لیے ایک مثال سمجھتا تھا۔ اشاعتی دنیا ایک سمندر ہے۔ اس سمندر کی غواصی کے ذریعے لعل و یاقوت حاصل کرنے کے ایک سو ایک طریقے موجود تھے لیکن میں نے ان کتابوں کی اشاعت کو ترجیح دی، جن سے قارئین کے قلوب و اذہان منور ہوں۔ میں اپنی کتابوں کی اشاعت سے اپنی دنیا ہی نہیں، اپنی عاقبت و آخرت بھی سنوارنے کا متمنی تھا۔

پروفیسر تنویر حسین: آپ نے اپنے ادارے ''مقبول اکیڈمی'' کی بنیاد رکھتے ہی کس مصنف کی کتابیں شائع کیں؟

ملک مقبول احمد: آپ کا یہ سوال بڑا اہم ہے۔ ایک ناشر کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ مارکیٹ کے حوالے سے یہ اندازہ لگائے کہ کون سی کتابیں قارئین پسند فرماتے ہیں

Marfat.com

اور کس مصنف کی مارکیٹ ویلیو ہے۔ ان دنوں بہت بڑے ناول نگار، مصنف اور ادیب جناب رئیس احمد جعفری بہت زیادہ پڑھے جانے والے مصنف تھے۔ قارئین رئیس احمد جعفری کے ناولوں کا انتظار کیا کرتے تھے۔ رئیس احمد جعفری کے دل میں ملک اور قوم کا درد بھرا ہوا تھا۔ وہ مسلمان قوم کے سچے خیر خواہ تھے۔ وہ مسلمانوں کو ترقی اور خوش حالی کے آسمانوں پر دیکھنا چاہتے تھے۔ میں نے اپنے اشاعتی منصوبے کے لیے ان سے مشاورت کا پروگرام بنایا۔ ان کا قیام ٹیگور پارک میکلوڈ روڈ لاہور میں تھا۔ ملاقات کے دوران میں نے اپنا مدعا بیان کیا۔ رئیس احمد جعفری بڑے اعلیٰ ظرف انسان تھے۔ ان کی شرافت ونجابت مثالی تھی۔ وہ شہرت کی جس کہکشاؤں کو چھور ہے تھے، مجھ جیسے کم مایہ انسان کو شرفِ ملاقات بخشنا اور میری استدعا کو وقعت سے نوازنا بہت بڑی بات تھی۔ انہوں نے پہلی ہی ملاقات میں چند مسودوں کا وعدہ کر لیا۔ لطف کی بات یہ تھی کہ اس وعدے کو نبھایا بھی۔ جب میں جناب رئیس احمد جعفری سے حوصلہ افزا ملاقات کر کے اپنے گھر لوٹا تو خوشی سے میرے پاؤں زمین پر نہیں لگ رہے تھے۔ میری کیفیت کچھ اس طالب علم کی سی تھی، جو گزٹ میں اول آنے کی خبر پڑھ لے اور دوسروں کو یہ خبر بتانے کے لیے بے تاب و بے قرار ہو۔

رئیس احمد جعفری جس پائے اور مرتبے کے مصنف تھے، ان کی کتابیں شائع کرنا کسی اعزاز اور فخر سے کم نہ تھا۔ انہوں نے طباعت کے لیے اپنے دو ناول عطا کیے۔ میں نے بہت ہی کم عرصے میں ان ناولوں کو نہایت خوبصورت گیٹ اپ کے ساتھ شائع کر دیا۔ میں نے ان ناولوں کی قیمت پڑھنے والوں کی قوتِ خرید کے مطابق رکھی۔ ناول بازار میں آئے تو ایک غوغا بلند ہوا۔ قارئین کی ایک بڑی تعداد نے ان ناولوں کو ہاتھوں ہاتھ خرید لیا۔ ان ناولوں کے اعلیٰ معیار پر داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے گئے۔ قلیل مدت میں ان ناولوں کی فروخت نے میرے ادارے کو استحکام بخشا۔ جب میں رئیس احمد جعفری

Marfat.com

صاحب کے در دولت پر حاضر ہوا تو انہوں نے سروقد کھڑے ہو کر میری پذیرائی کی اور میری پہلی اشاعت کی کامیابی پر مبارک باد دی۔ میں نے اپنی اس کامیابی کو خدا کی طرف سے بہت بڑی عنایت اور غیبی امداد سمجھا۔

رئیس احمد جعفری بہت بڑے ادیب اور فن کار تھے۔ کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی زبان لکھتے۔ وہ عوام کے بہت بڑے نباض تھے۔ مصنف وہی کامیاب ہوتا ہے، جسے عوام کے ذہن، اس کی نفسیات اور اس کی دلچسپی کا خیال ہو۔ رئیس احمد جعفری ایسے ہی مقبول و معروف مصنف تھے۔ ان کے ناولوں کے پلاٹ دلچسپ و عجیب اور وکھری ٹائپ کے ہوتے تھے۔ ان کی کہانی میں دریا کی سی روانی ہوتی تھی۔ ان کے ناولوں میں یہ خوبی ہوتی تھی کہ اگر اسے پڑھنا شروع کریں تو پڑھنے والے کو کھانے پینے کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ وہ ناول ختم کر کے ہی دم لیتا تھا۔ ان کے ناولوں میں روحانی چاشنی بھی پڑھنے والوں کو اپنی جانب کھینچتی۔ یہی وجہ تھی کہ کالجوں کے لڑکے اور لڑکیاں جوان اور بوڑھے ان کے ناولوں کے گرویدہ تھے۔ رئیس احمد جعفری صاحب کے ناولوں کی فوری فروخت نے مجھے مالی دولت کے ساتھ ساتھ اعتماد کی دولت بھی عطا کی۔

جب مولانا ابوالکلام آزاد کی خودنوشت انڈیا ونز فریڈم (India Wins Freedom) زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی تو انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ اس کتاب کا اردو ترجمہ شائع ہونا چاہیے۔ ان کا مشورہ بروقت تھا۔ میں نے ترجمہ کرنے کا قرعہ انہی کے نام نکالا۔ انہوں نے ترجمہ شروع کر دیا۔ میں نے ترجمے کے ساتھ ساتھ کتابت بھی شروع کرا دی۔ کتاب مع ترجمہ و کتابت ایک ماہ کے اندر اندر منصۂ شہود پر آ گئی۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن بہت جلد ختم ہو گیا۔ اس طرح یکے بعد دیگرے یعنی ایک ماہ میں تین ایڈیشن مارکیٹ میں آئے۔ اس کتاب میں رئیس احمد جعفری نے مولانا

Marfat.com

ابوالکلام آزاد کی ان باتوں کے جوابات بھی فراہم کیے تھے، جو باتیں انہوں نے ملک پاکستان کے خلاف تحریر کی تھیں۔ اس کتاب پر تبصروں کی آندھی بھی چڑھی۔ کتاب کے حق میں اور کتاب کے مخالف۔ بہر حال تندی باد مخالف نے اس کتاب کو اونچا اڑانے میں بہت مدد دی۔

بہر حال یہ کتاب ایسی سدا بہار کتاب واقع ہوئی ہے کہ یہ اپنی اشاعت اول ہی سے برابر قارئین تک پہنچ رہی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد قدرت اللہ شہاب، جناب ہاشم رضا، مولانا حامد علی خان، چودھری محمد علی، مشتاق احمد گورمانی، ممتاز دولتانہ، (گورنر مغربی پاکستان) اور خان عبدالقیوم خان جیسی شخصیات نے مدح وستائش کے خطوط ارسال کیے۔ مولانا کوثر نیازی بہ نفس نفیس میرے ہاں تشریف لائے اور تبصرے کے لیے دو کتابیں لے گئے۔

''آزادی ہند'' کی اشاعت نے ''مقبول اکیڈمی'' کو شہرت کے پَر عطا کیے۔ اس سے قبل میں سوچا کرتا تھا کہ کامیابی کا راستہ تلاش کرنے کے لیے کون سا طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کامیابی کی مبارک باد دینے کے لیے کراچی کے شیخ شوکت علی اینڈ سنز کے مالک شیخ شوکت علی اور اقبال سلیم گاہندری، (نفیس اکیڈمی) اس ناچیز کے دفتر شاہ عالمی تشریف لائے۔ ان لوگوں نے میری ہمت بندھائی اور میں مزید جوش وجذبہ اور ذوق وشوق کے ساتھ معیاری کتب کی شاعت میں مصروف ومگن ہوگیا۔ پھر رئیس احمد جعفری کی قائداعظم اور اُن کا عہد، خلیفہ ہارون الرشید اور ان کا عہد، خطبات قائداعظم، خون کی ہولی، شہاب الدین غوری، تغلق، یزید اور یورش جیسی کتابیں شائع کیں۔

انہی دنوں کا واقعہ ہے کہ ایک دن میں احسان دانش صاحب سے ملاقات کے لیے حاضر ہوا۔ انہوں نے ایک نادر ونایاب کتاب ''تمدن عرب'' کا تذکرہ کیا۔ یہ بڑی

Marfat.com

کتاب باتصویر تھی۔ میں نے پانچ سو روپے میں یہ نادر کتاب احسان دانش صاحب سے خرید لی۔ یہ کتاب نواب حیدرآباد کی زیر سرپرستی طبع ہوئی تھی اور اس کا اردو ترجمہ سید علی بلگرامی نے کیا تھا۔ جب اس کتاب کی اشاعت کا مرحلہ آیا تو مجھے اپنے وسائل کم دکھائی دیئے۔ میں نے اس کتاب کی اشاعت کے لیے قرض حسنہ لینے کی مہم کا آغاز کر دیا۔ کچھ لوگوں نے اس کارِ خیر کے لیے قرض دینا مناسب سمجھا۔ کچھ نے آٹے میں نمک کے برابر مدد فرمائی۔ معاً میرے ذہن میں ایک قلمی دوست ملک اللہ داد صاحب کا خیال آیا، جو سلطان خیل (میانوالی) میں مقیم تھے۔ ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، صرف مراسلت ہی کے ذریعے دوستی کا رشتہ استوار تھا۔ جب اللہ داد صاحب نے مجھے اپنے سامنے پایا تو خوشی اور حیرت کے ملے جلے جذبات ان کے چہرے پر ہویدا ہو گئے۔ انہوں نے میری خاطر مدارت میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور میرے حاضر ہونے کی وجہ دریافت فرمائی۔ جب میں نے اپنی پریشانی کو مناسب الفاظ میں بیان کیا تو انہوں نے از راہ ہمدردی اور کمال مہربانی سے پانچ ہزار روپے کی خطیر رقم مجھے تھما دی۔

میں ملک اللہ داد کے احسان کو آج بھی یاد کرتا ہوں۔ انہوں نے کبھی اس رقم کی واپسی کا تقاضا تک نہ کیا۔ میں نے ہی خود ان کی امانت واپس کی۔ اس کے بعد میں نے اسلامی کتب کی مبارک اشاعت کی طرف دھیان دیا۔ ''تمدن عرب' کے بعد ''تمدنِ ہند'' ''سیرت ابن ہشام'' اور ''عبرت نامہ اندلس'' چھاپیں۔

پروفیسر تنویر حسین: آپ نے تاریخی ناول بھی بہت سے شائع کیے ہیں۔ کس مصنف کے ناول شائع کیے؟

ملک مقبول احمد: محمد سعید صاحب کے ناول ''مقبول اکیڈمی'' نے شائع کیے۔ محمد سعید بہت پڑھے لکھے اور صاحب طرز ناول نگار تھے۔ وہ اپنے موضوع پر کامل دست گاہ رکھتے

Marfat.com

تھے۔ان کے ناول اسلامی موضوعات پر حرف آخر کہلانے کے مستحق ہوتے تھے۔ان کے قارئین ان کے ناولوں کا بے چینی سے انتظار کرتے تھے۔ عام ناول نگاروں کی طرح وہ اسلامی واقعات میں ملاوٹ نہیں کرتے تھے۔وہ اصل اور سچے اسلامی واقعات کے تانے بانے سے ناول مکمل کیا کرتے۔ اُن کا اسلوب بیان ایسا انوکھا اور منفرد ہوتا تھا جو انہیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز کر دیتا۔ان کے ناولوں میں زہرۃ الروم، اطلس، مدینۃ الیہود، پاکستان کا شالن گراڈ، تیمور، ہمایوں، القاہرہ، الجزائر، استنبول، صقلیہ، اور بحری عقاب زیادہ مشہور ہیں۔ میرے اوران کے درمیان دوستی جیسا پاکیزہ رشتہ استوار تھا۔

پروفیسر تنویر حسین: آپ کا ادارہ لائبریریوں کو کتب سپلائی کرنے میں بہت اچھی شہرت رکھتا ہے۔آپ اس لائن کی طرف کیسے آئے؟

ملک مقبول احمد: یہ 1961ء یا 1962ء کی بات ہے۔میں اپنے دفتر واقع شاہ عالم مارکیٹ بیٹھا تھا۔اردو بازار کے ایک نامور ناشر عبدالحمید نظامی نے میرے دفتر میں قدم رنجہ فرمایا۔ انہوں نے نفسیات اور بچوں کی کتابیں تین تین سو کی تعداد میں خریدیں۔ میرے لیے اتنی کتابوں کی بیک وقت فروخت نہ صرف حیرانی کا باعث تھی بلکہ کچھ کچھ پریشانی کا بھی۔ میں نے سوچا کہ کتابوں کی اتنی کثیر تعداد نظامی صاحب کہاں فروخت کریں گے۔ آخر گنجلک ڈور کا سرا ہاتھ آ گیا اور مجھ پر کھل گیا کہ محکمہ تعلیم کی لائبریریوں کو کتابیں سپلائی کی جاتی ہیں۔

اخبارات میں لائبریریوں کو کتب کی فراہمی کے لیے ٹینڈر شائع ہوتے تھے۔ مجھے ایک نیا میدان ہاتھ آیا تو محکمہ تعلیم کے ٹینڈروں میں قسمت آزمائی کا آغاز کر دیا۔ میں نظامی صاحب کو اس سلسلے میں اپنا محسن سمجھتا ہوں کہ ان کی وساطت سے میرے لیے آگے بڑھنے کا ایک نیا راستہ بن گیا۔ میں جب بھی کتابوں کی فراہمی کے سلسلے میں ٹینڈر داخل

Marfat.com

کرتا تو اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑا کر دعا ضرور کرتا۔

پروفیسر تنویر حسین: آپ پہلے ناشر تھے "سفر جاری ہے" نے آپ کو بحیثیت ادیب متعارف کرایا۔ اس کتاب پر ریکارڈ تبصرے ہوئے۔ اتنی شہرت کا تصور آپ کے ذہن میں کبھی آیا تھا؟

ملک مقبول احمد: میں اللہ تعالیٰ کا ایک عاجز سا بندہ ہوں۔ میں نے اپنے بچوں کی خوشی کے لیے "سفر جاری ہے" لکھی تھی۔ مجھے یہ بھی علم نہیں تھا کہ دوست احباب اس کتاب کو تحسین کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔ میری اس کتاب پر بیرون ملک بھی تبصرے ہوئے۔ یہ تبصرے اتنے زیادہ تھے کہ ان پر مبنی ایک کتاب "پذیرائی" شائع ہوئی۔ "اہل قلم کے خطوط" اور "شناسائی" میری آپ بیتی ہی کی مختلف شاخیں ہیں۔ میں نے لوئی کوہنی کی کتاب "نیا علم شفا بخشی" کی تلخیص بھی کی ہے۔ "پیغمبر عالم ﷺ"، "رہنمائے حج"، "خطبہ حجۃ الوداع"، "صلوعلیہ وآلہٖ" اور "قرآنی دعائیں" مرتب کی ہیں۔ اب گزرے دور کو آواز دے رہا ہوں اور اپنے پرچے "چودھویں صدی" کی ایک فائل سے تین کتابیں "ارمغان غزل"، "گلشن ادب" اور "گم شدہ افسانے" ترتیب دے کر شائع کر رہا ہوں۔ کچھ اسلامی کتابیں دینی خدمت کے طور پر شائع کر کے بلا قیمت تقسیم کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اگر بطور ادیب میری پہچان ہوئی ہے تو یہ سب اللہ تبارک تعالیٰ کی کرم نوازی ہے۔ میں اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر کروں کم ہے۔

پروفیسر تنویر حسین: پروفیسر جمیل آذر صاحب نے آپ پر ایک کتاب لکھی ہے؟

ملک مقبول احمد: میں اس لحاظ سے خوش قسمت ہوں کہ میری معمولی سی ادبی کاوش کو پاکستان کے بڑے بڑے ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور قلم کاروں نے سراہا اور پروفیسر جمیل آذر صاحب نے "سفر جاری ہے" کے حوالے سے "راہ نوردِ شوق" تصنیف کی۔ میں پروفیسر جمیل آذر صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے بندۂ ناچیز پر پوری

Marfat.com

کتاب تحریر کی۔

پروفیسر تنویر حسین: ملک صاحب! آپ کے کتنے بچے ہیں۔ان کی تعلیم کے بارے میں بتائیے۔وہ کیا کیا کام کرتے ہیں؟

ملک مقبول احمد: مجھے اللہ سبحانہ تعالیٰ نے دو بیٹوں اور ایک بیٹی سے نواز رکھا ہے۔ میرے تینوں بچے ایم۔بی۔بی۔ایس ڈاکٹر ہیں۔

بڑے بیٹے کا نام ڈاکٹر ظفر مقبول ہے۔انہوں نے سنٹرل ماڈل سکول سے میٹرک اور گورنمنٹ کالج (اب گورنمنٹ کالج یونیورسٹی) سے ایف۔ایس۔سی کی ایف۔ایس۔سی کے بعد انہوں نے علامہ اقبال میڈیکل کالج میں داخلہ لیا۔ظفر مقبول بہت دھیمے مزاج کا انسان ہے۔ہر کسی سے نہایت اخلاق اور انکسار سے بات کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ایک بیٹی اور ایک بیٹا عطا کیا۔اللہ اسے اور اس کے بچوں کو صحت، تندرستی اور لمبی زندگی عطا کرے (آمین)

میرے چھوٹے بیٹے کا نام ڈاکٹر ارشد مقبول ہے۔انہوں نے بھی سنٹرل ماڈل سکول اور گورنمنٹ کالج لاہور سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی۔انہوں نے تعلیم حاصل کرنے کے بعد جنرل ہسپتال میں ملازمت کی۔ان کی بیگم بھی ڈاکٹر ہیں۔ڈاکٹر ارشد مقبول نے ہسپتال کی ملازمت کو خیر باد کہا اور میرے اشاعتی کاروبار میں مصروف ہو گئے۔ ڈاکٹر ارشد کو اللہ تعالیٰ نے دو بیٹیوں اور ایک بیٹے بابر مقبول سے نوازا ہے۔اللہ تعالیٰ میرے بچوں کو دین و دنیا کی دولت عطا کرے اور خوش حالی اور سکون سے نوازے (آمین)

میری بیٹی شہنیلا مقبول بھی ایم۔بی۔بی۔ایس ڈاکٹر ہیں۔ڈاکٹر عبدالوحید میرے داماد ہیں۔پہلے وہ ملازمت کرتے تھے لیکن اب وہ مقبول بکس ماڈل ٹاؤن لنک روڈ پر کتابوں کے کاروبار سے وابستہ ہیں۔نہایت درویش منش انسان ہیں۔ملنسار اور

Marfat.com

خوش اخلاق ہیں۔اللہ تعالیٰ انہیں اوران کے بچوں کوسلامت رکھے۔(آمین)

پروفیسر تنویر حسین: آپ کا ایک شوروم تو اردو بازار میں ہے۔اس کے علاوہ آپ کے شوروم کہاں کہاں واقع ہیں؟

ملک مقبول احمد: ماڈل ٹاؤن لنک روڈ،اس پر میرے داماد ڈاکٹر میاں عبدالوحید بیٹھتے ہیں۔صدیق ٹریڈ سنٹر گلبرگ، مین بلیورڈ اقبال ٹاؤن میں مقبول بکس کے نام سے شوروم ڈاکٹر ارشد مقبول کے زیرانتظام ہیں۔دیال سنگھ مینشن مال روڈ پر مقبول اکیڈمی کے نام سے ایک بڑا شوروم ہے۔اس کی نگرانی بھی ڈاکٹر ارشد کرتے ہیں۔

پروفیسر تنویر حسین: یہ تمام تاثر معاشرے میں پایا جاتا ہے کہ ناشرین اپنے مصنفین کی کتابیں چھاپتے چلے جاتے ہیں اور رائلٹی ادا نہیں کرتے آپ اپنے مصنفین کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں؟

ملک مقبول احمد: اگر میں اپنی تعریف میں کچھ عرض کروں گا تو لوگ کہیں گے کہ اپنی تعریف تو ہر کوئی کرتا ہے اور کر سکتا ہے۔میں نے کسی مصنف / ادیب کے ساتھ کوئی ایسا سلوک نہیں کیا۔جس سے اسے کوئی تکلیف ہو۔میں مصنف کے ساتھ جو معاہدہ کرتا ہوں۔کوشش کرتا ہوں کہ اسے نبھاؤں اگر میں بعض مصنفین کی شکایات کروں تو یہاں ایک دفتر درکار ہوگا اس لیے میں کسی کی غیبت نہیں کرنا چاہتا۔

پروفیسر تنویر حسین: پہلے گورنمنٹ کی لائبریریوں کے لیے کتابیں خریدی جاتی تھیں۔آج کل حکومت نے بھی ہاتھ کھینچ لیا ہے۔آپ اس بارے میں کیا فرمائیں گے۔

ملک مقبول احمد: کتابی صنعت کو سہارا دینے کا سب سے بڑا ذریعہ سرکاری لائبریریاں ہیں۔کالج سکول کی لائبریریاں ہوں یا سرکاری اداروں کی۔جب حکومت ہی لائبریریوں کے لیے کتابیں نہیں خریدے گی تو مصنفین کتابیں لکھنے سے گریز کریں گے اور

Marfat.com

ناشرین مصنفین کے مسودات قبول کرنے سے کترائیں گے۔حکومتوں کو چاہیے کہ وہ علم دوستی کا مظاہرہ کریں اور ہو سکے تو مصنفین اور ناشرین کو کتابیں شائع کرنے کے لیے مالی معاونت کریں۔اچھی کتابیں لکھنے والے مصنفین اور اچھی کتابیں شائع کرنے والے ناشرین کو انعامات دینے چاہیں۔

پروفیسر تنویر حسین: آپ تو بہتر جانتے ہیں کہ اب کتاب دوستی کم ہو گئی ہے۔لوگوں میں مطالعے کا رجحان بہت کم رہ گیا۔اس کی وجہ؟

ملک مقبول احمد: آپ نے اصل مسئلے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ہمارے ملک میں خواندگی کی شرح انتہائی کم ہے۔ دوسرے ہمارے بچوں میں کتابیں خریدنے کی عادت نہیں رہی۔نئی نسل انٹرنیٹ، کمپیوٹر اور موبائل کے ساتھ ہی کھیلتی رہتی ہے۔اسے شاید یہ علم نہیں کہ یہ چیزیں اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہیں لیکن کتاب کی جگہ نہیں لے سکتیں۔کتاب انسان کو خوشی کے وہ لمحات فراہم کرتی ہے، جو کسی اور ذریعے سے حاصل نہیں ہو سکتے۔کتاب بہترین دوست کا کردار ادا کرتی ہے۔علم میں اضافہ کرتی ہے۔شخصیت کو نکھارتی ہے۔ ہمارے نظام تعلیم نے بچوں پر کورس کی کتابوں کا اتنا بوجھ لاد دیا ہے کہ وہ سکول جاتے ہوئے ''کبڑے عاشق'' کا کردار ادا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔اس کے علاوہ مطالعے کا جو وقت ہوتا تھا، اس میں اکیڈمیوں اور ٹیوشن سنٹروں میں امتحانات کی مشکلات حل کروائی جاتی ہیں۔بچوں کے پاس زائد مطالعے کے لیے وقت نہیں رہا۔اساتذہ کو چاہیے کہ کلاسوں کے اندر بچوں کو مارکیٹ میں آنے والی اچھی کتابوں سے متعارف کروائیں۔

والدین کو چاہیے کہ وہ بچوں کو کتابیں خرید کر دیں اور دن میں ان کے مطالعے کے لیے ایک آدھ گھنٹہ مقرر کریں۔ہم سب نے مل جل کر اپنے بچوں کو کتاب کے مطالعے کی طرف واپس لانا ہے۔

Marfat.com

کاغذ کی ہوش ربا گرانی نے ناشرین کو کتابیں مہنگی کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ گورنمنٹ کے سکولوں میں اول تو لائبریریوں کا وجود ہی نہیں۔ اگر کہیں ہے تو بچوں کو کتابیں اشو نہیں کی جاتیں۔ اسی طرح کالجوں میں بھی طلبہ کو آسانی سے کتابیں اشو نہیں کی جاتیں۔ سکولوں، کالجوں کی لائبریریوں میں علم کے خزانے کو تالے لگا کر رکھا جاتا ہے۔ لائبریریوں میں کتابوں کا مطالعہ زیادہ تر دیمک ہی کے حصے میں آتا ہے۔ لائبریریوں میں ایک پیریڈ مطالعے کے لیے مختص ہونا چاہیے۔ اساتذہ اپنے طلبہ سے پوچھیں کہ انہوں نے ایک ہفتے کے اندر اندر کس کتاب کا مطالعہ کیا ہے۔ کتابوں پر تبصرے کروائے جائیں۔ ان کے حوالے سے سوالات اور جوابات کے مقابلہ جات کروائے جائیں۔ بچوں کو وقتاً فوقتاً کتابیں تحفے میں دی جائیں۔

پروفیسر تنویر حسین: عبید ابوذری نے کہا تھا

ہوتے ہیں مرے ملک میں ہر روز دھماکے
رہتی ہے مرے ملک میں شبرات مسلسل

ملک مقبول احمد: یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارا پیارا وطن پاکستان دھماکوں کی لپیٹ میں ہے۔ ہم کہیں بھی محفوظ نہیں ہیں۔ مارکیٹیں، مسجدیں، اور صوفیاء کے مزار، غرض کوئی جگہ محفوظ نہیں۔ نہتے اور بے گناہ عوام اپنی جانوں سے ہاتھ دھوتے چلے جا رہے ہیں۔ ہماری حکومتوں کو چاہیے کہ وہ ایسی پالیسیاں وضع کریں کہ جس سے ملک خوشحال ہو۔ غیروں کے آگے کشکول پھیلانے سے مسائل حل نہیں ہوں گے۔ دوسروں کے کہنے پر اپنے ملک کو بارود کا ڈھیر نہ بنائیں۔ ہمارے ملک میں اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک لوگوں کی کمی نہیں۔ سب سے پہلے کالا باغ ڈیم تعمیر کرنا چاہیے۔ قانون پر فوری عمل درآمد ہونا چاہیے اور غریب کو انصاف ملنا چاہیے۔

☆......☆......☆

Marfat.com

Marfat.com

مشاہیر کی آراء

Marfat.com

Marfat.com

خودنوشت
''سفر جاری ہے''
مشاہیر کی آراء

''ملک مقبول احمد کی سوانح حیات یہ ثابت کرتی ہے کہ عقلِ سلیم اور دانش کا تعلق کالج یا یونیورسٹیوں کی ڈگری پر منحصر نہیں بلکہ یہ اللہ کا عطیہ ہوتا ہے۔''

چیف جسٹس آف پاکستان (ر)
شیخ ریاض احمد

''ان کا اسلوب نہایت دلچسپ ہے، ان کی زبان و بیان اور طرزِ تحریر پر ادبی رنگ غالب ہے جو ان کے اعلیٰ ذوق کی عکاسی کرتا ہے۔''

ڈاکٹر صفدر محمود (مؤرخ پاکستان)

''یہ کتاب محض آپ بیتی نہیں بلکہ اس میں جگ بیتی اور کتاب کی کہانی بھی شامل ہے۔ اس کتاب کی اشاعت پر ملک مقبول احمد کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔''

ڈاکٹر وحید قریشی

''ملک مقبول احمد نے اپنی آپ بیتی لکھ کر اہلِ نظر کے سامنے اپنی زندگی کی کہانی پیش کر دی ہے اور فیصلہ زمانے کی تیز نگاہی پر چھوڑ دیا ہے۔''

ڈاکٹر وزیر آغا

اس کتاب میں مصنف نے اپنی بھرپور جدوجہد کو بڑی خوبصورتی سے رقم کرنے کا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔''

حمید اختر

''خود آگہی ایک ایسی منزل ہے جہاں صرف وہ ہستیاں پہنچ پائیں جو ہمت و استقلال کا پیکر تھیں اس منزل پر پہنچنے والی ان ہستیوں میں ''سفر جاری ہے'' کے مصنف ملک مقبول احمد شامل ہیں۔''

جسٹس (ر) عباس خان

''مقبول صاحب نے اپنے حالات، مشاہدات اور تجربات ایسے انداز میں لکھے ہیں، کہ دلچسپی برقرار رہتی ہے، یہ جیون کتھا بہت سے لوگوں کے لئے باعث نفع وافادہ ہوسکتی ہے۔''

خواجہ محمد زکریا

''سفر جاری ہے'' ایک اعلیٰ پائے کی کتاب ہے اور ملک مقبول احمد کی کہانی ہر شخص کی کہانی بن سکتی ہے ہر شخص کو آگے بڑھا سکتی ہے اور کامیابی کا چہرہ دکھا سکتی ہے۔''

مجیب الرحمٰن شامی

''اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں زیب داستان سے کام نہیں لیا گیا۔ لیکن اس میں افسانے جیسی لطافت موجود ہے۔''

ڈاکٹر انور سدید

''یہ گوناگوں شخصی مشاہدات اور تجربات کے ساتھ ساتھ اس دور کے ادیبوں اور ادبی فضا کا احوال اور منظر نامہ بھی بن گئی ہے، جس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔''

امجد اسلام امجد

Marfat.com

''بحیثیت مجموعی ''سفر جاری ہے'' اردو سوانح نگاری میں ایک اچھا اضافہ ہے اور اس پیش کش میں جس اہتمام کو مدنظر رکھا ہے وہ قابل تحسین ہے۔''

ڈاکٹر رشید امجد

''یہ کتاب دلچسپ واقعات، لطیف جذبات، حسین تخیلات سے مالا مال ہے، اس کتاب کا ہیرو زاہد خشک نہیں وہ زندگی کی تمام رعنائیوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔''

پروفیسر جمیل آذر

''کتاب کے مطالعہ کے دوران میں بعض جملوں نے مجھے چونکا دیا، ایسے جملے کوئی عام نثر نگار، جب تک اس کے اندر تخلیق کی شمع روشن نہ ہو، ہرگز نہیں لکھ سکتا۔''

محمد منشا یاد

واہ کیا کتاب لکھی ہے آپ نے، اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ پھر میں کیا لکھوں گا تو میں آپ سے ضرور کہتا کہ اس طرح کی ایک آپ بیتی میری بھی لکھ دیجئے۔''

اے حمید

''مجھے آپ کی خودنوشت بہت پسند آئی، واقعی آپ عزم وہمت کی قابل تقلید مثال ہیں۔ مصاف زندگی میں ایسی عمدہ مثال بننا بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔''

ڈاکٹر علی محمد خان

''اپنی شخصیت اور علم پروری کی داستان ملک مقبول احمد نے جمالیاتی ذوق کی آئینہ داری کے ساتھ سنائی ہے۔ جس میں بہت کچھ سیکھنے جاننے کا گونا گوں برق تجلی ہے۔''

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

''سفر جاری ہے'' اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ ایک سیدھی سادی زندگی کا بے ریا بیان ہے جو مطالعہ کے دوران دل میں اترتا چلا جاتا ہے اور مزہ یہ ہے کہ اپنے کھلے پن میں بھی ٹھکانے سے دور پار کہیں کھو نہیں جاتا۔''

جوگندر پال

''اس کے پس پردہ تجربات، نیک و بد، خیر وشر، محبت وعمل کی ایسی لطیف داستان پوشیدہ ہے کہ قاری لاشعوری طور پر معرفت کی دنیا میں گم ہوتا چلا جاتا ہے۔''

پروفیسر علی احمد فاطمی

''سفر جاری ہے'' میں ملک مقبول احمد نے دیہی زندگی کی منظر کشی اس مہارت سے کی ہے کہ پریم چند اور سدرشن کے افسانوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔''

ڈاکٹر طارق عزیز

''سفر جاری ہے'' میں اظہار کی زبان سادہ اور معصوم ہے، معلوم ہوا کہ مصنف شعر فہم بھی ہیں۔ اچھے شعر برمحل استعمال کئے گئے ہیں۔''

اظہر جاوید

''سفر جاری ہے'' ایک خودنوشت سوانح حیات ہی نہیں، ایک ادبی، تہذیبی اور ثقافتی دستاویز بھی ہے۔''

ڈاکٹر یونس جاوید

''یہ داستان حیات ہر ذی شعور کے لئے راستی اور حق شعاری کا ایک انمول خزانہ رکھتی ہے۔''

پرتو روہیلہ

''آپ کے مشاہدہ میں گہرائی، ظرف میں وسعت اور انداز بیان میں دلکشی ہے، سفر جاری ہے سعی پیہم اور جہد مسلسل کی داستان ہے۔''

ڈاکٹر مسکین علی حجازی

Marfat.com

''سفر جاری ہے'' کا مطالعہ شروع کیا تو تحریر کے طلسم نے ایسا اسیر کیا کہ ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی، سچی بات تو یہ ہے کہ کسی بھی ادب پارے کا حسن روح کو مس کر جائے تو مدتوں سرشار رہتا ہوں۔''

ڈاکٹر غفور شاہ قاسم

''ملک مقبول کی ادبی سرگزشت کی خوشبو ادب پرور گہوارہ لاہور کے کونے کونے میں محسوس کی جا رہی ہے۔''

ڈاکٹر ریاض محمود

''ہمیں اپنے ایک دوست کی لکھی ہوئی اچھی اور دلچسپ کتاب پڑھنے کو ملی اور یہ کتاب چھپ کر کتابوں کی اشاعتی تاریخ کا ایک حصہ بن گئی۔''

سید قاسم محمود

''سفر جاری ہے'' ملک مقبول احمد کی خودنوشت آپ بیتی ہے، جو انہوں نے بڑی سادگی اور بے تکلفی سے ایسے دلچسپ انداز میں بیان کی ہے کہ قاری کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔''

طالب ہاشمی

''سفر جاری ہے'' کے آئینہ خانے میں بہت سی معلومات ایک تسلسل کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ یوں اسے ایک مکمل خودنوشت سوانح عمری کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ بلاشبہ اسے فن خود نوشت سوانح عمریوں میں ایک حسین اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔''

پروفیسر نذیر احمد تشنہ

''سفر جاری ہے'' بیک وقت کلیدِ کامیابی بھی ہے اور اپنے دائرے کے اندر تاریخ بھی، اور آئندہ نسل کے لئے خضرِ راہ بھی۔''

ابو الامتیاز ع س مسلم

''سفر جاری ہے'' دلچسپ، معلومات افزا، متنوع اور کارآمد کتاب اور اہلِ ذوق کو مطالعہ کی دعوت دیتی ہے۔''

سعید بدر

''سفر جاری ہے'' ملک مقبول احمد کا ایک گراں قدر علمی، ادبی کارنامہ ہے یہ کتاب بلاشبہ اردو کے سوانحی ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ اس سے کوئی بھی ادبی مؤرخ صرف نظر نہیں کر سکتا۔

پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ

''سفر جاری ہے'' کسی پاکستانی ناشر کی پہلی خود نوشت سوانح ہے۔ جو میرے مطالعہ میں آئی ہے۔ میں ملک مقبول احمد کو اس اعزاز پر مبارک باد دیتا ہوں۔''

پروفیسر سجاد نقوی

''سفر جاری ہے'' سے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے سیکھنے کے لئے بھی بہت کچھ ہے، آخر زندگی صرف اچھا شعر کہنے یا اچھا افسانہ لکھنے کا نام ہی تو نہیں ہے، اچھا انسان بن کے کھانے کا نام بھی تو ہے۔''

ڈاکٹر منصور احمد باجوہ

''ایک شخص کے پتھر سے ہیرا بننے کی کہانی ہے، خود نوشت کا ہر صفحہ ان کے کثرت مطالعہ و مشاہدہ کا آئینہ دار ہے۔''

علی سفیان آفاقی

''اس کتاب میں ملک مقبول احمد کو کبھی بارگاہ ایزدی میں دیکھا، کبھی بارگاہ رسالت مآبؐ میں، کبھی عشق کے کارزار میں اور کبھی رزم گاہ حیات میں ان کا نظارہ کرتا رہا۔ اور میری نگاہیں چکا چوند ہوتی رہیں۔''

سید واجد رضوی

Marfat.com

''سفر جاری ہے'' کوئی مافوق الفطرت تصنیف نہیں ہے بلکہ ایک جیتی جاگتی جدو جہد کرتی زندگی کی کم و بیش نصف صدی سے زیادہ عرصے کی کامیابیوں اور ناکامیوں کی دیومالا ہے۔'' **اسرار زیدی**

''یہ خودنوشت پڑھنے والے کو ایک اچھا اور کامیاب انسان بنانے میں بھی یقیناً مددگار ثابت ہوگی، جو بڑے ادب کی ایک بڑی خوبی ہے۔''

اکبر حمیدی

''سفر جاری ہے'' بظاہر ایک غیر ادیب کا تخلیقی اثاثہ ہے، ہر زندہ تخلیق کی طرح اس میں ایک بھری پُری زندگی اپنی تجسیم سے اپنا اثبات کرنے میں کامیاب رہی ہے۔ **پروفیسر منور عثمانی**

''جس طرح بے روگ صداقتوں و رسچائیوں کو واضح طور پر لکھا گیا ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب ہر طبقہ کے افراد کے مطالعہ کے لئے ازبس ضروری ہے۔'' **پروفیسر مظفر مرزا**

''یہ ایک ایسے انسان کی سرگزشت ہے جو اپنی خداداد صلاحیتوں، غیر رسمی مطالعہ، مشاہدہ اور پیہم کوشش، محنت اور لگن سے ''اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے'' کی عملی تفسیر بن گیا۔''

پروفیسر عبد العلیم صدیقی

''ملک مقبول احمد نے جو کہا وہ اس لئے سچ ہے کہ وہ افسانے نہیں لکھتے، ڈرامے نہیں بناتے ان کے نزدیک زندگی ایک سچائی ہے اور وہ اسے سچائی کے ساتھ بسر کرتے ہیں۔'' **جاوید اختر بھٹی**

''جتنی دلیری سے آپ نے سفر جاری ہے لکھی ہے یہ صرف آپ ہی کا اعزاز ہے ایسی سیدھی سادی اور پرخلوص کتاب لکھنے پر مبارک باد ہی پیش کی جاسکتی ہے۔'' **محمد ایوب خان**

''یہ عطا نہیں تو کیا ہے کہ ''سفر جاری ہے''، ملک مقبول احمد کی اوّلین کتاب ہے، مگر اس میں کچا پن لاکھ کوشش سے بھی نہیں ملتا، تسلسل فکر کہیں کج نظمی کا شکار نہیں ہوتا ہے۔'' **جان کاشمیری**

''امید ہے ملک مقبول احمد کی یہ کاوش پذیرائی حاصل کرے گی اور بہت سے لوگوں کے لئے راہنما کتاب ثابت ہوگی۔'' **زاہد حسین انجم**

''یہ کتاب مسلسل جہاد اور تجبیر مسلسل کی عملی تصویر ہے، اس کے مطالعہ سے قاری کے دل میں امید کی کرن اور امنگ جنم لیتی ہے۔''

ڈاکٹر اللہ بخش ملک

''یہ خودنوشت سچائی، سادگی، سلاست اور کردار کی منہ بولتی تصویر ہے۔'' **اعتبار ساجد**

''سفر جاری ہے'' غریب و سادہ بھی ہے اور رنگین بھی، اسلوب نگارش میں رومان کا رنگ بھی ہے اور تلخی حیات کا آہنگ بھی۔'' **ظفر علی راجا**

''سفر جاری ہے''، مشعل راہ ہوگی، میرے جیسے ان بے شمار لوگوں کے لئے جو اپنے زور بازو سے کچھ کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔'' **انیس یعقوب**

''میں سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب اردو کی اہم خودنوشتوں میں شمار کی جاسکتی ہے کہ اس میں ایک مکمل خود نوشت کی تمام صفات موجود ہیں۔''

ڈاکٹر اختر شمار

Marfat.com

"یہ ایک اعلیٰ پائے کی آپ بیتی ہے، اس میں رومان بھی ہے اور سچی زندگی کی عکاسی بھی۔ اس وجہ سے یہ آپ بیتی دل میں اترتی ہے اور قاری کو ساتھ لئے چلتی ہے۔" **پروفیسر عثمان علی**

"سفر جاری ہے" ایک غیر معمولی دستاویز ہے، جس سے رعنائی خیال، عمق فکر اور سادہ بیانی کے ساتھ ماضی کی یاد آفرینی دل میں اتر جاتی ہے۔"

نقشبند قمر نقوی

"بچپن، جوانی اور عملی زندگی کی جدو جہد کو انتہائی ذمہ داری سے خوبصورت پیرائے میں ضبط تحریر میں لایا گیا ہے۔" **ناصر نقوی**

"سفر جاری ہے" فنِ کتاب سازی کی دشوار گزر راہوں کی نشان دہی کرتی ہے۔" **بشیر موجد**

"سفر جاری ہے" میں ناول کی چاشنی موجود ہے، لفظوں کی بندش اور جملوں کی ترتیب وساخت نے کتاب کو اتنا دلچسپ بنا دیا ہے کہ شروع کرنے کے بعد مکمل کیے بغیر چھوڑنا ممکن نہیں رہتا۔"

عذرا اصغر

"سفر جاری ہے" میں زندگی کی تمام رنگ، شوخ، پھیکے، ہلکے، گہرے اپنی تمام تر رعنائیوں سمیت دیکھنے کو ملتے ہیں۔" **شبہ طراز**

"ایک ایسے اشاعتی ادارے کے مالک کی یہ خود نوشت جس کا اشاعتی قبلہ نوائے وقت کے الفاظ میں درست ہے، کئی حیثیتوں میں ایک ممتاز کتاب ہے۔" **حافظ صفوان محمد چوہان**

"ان کے انداز نگارش پر ادبی رنگ چھایا ہوا ہے، بیان سادہ ہے، طرز تحریر میں دل گرفتگی اور قاری کو جذب کر لینے کی صلاحیت موجود ہے۔" **باقی احمد پوری**

"یہ ایک بے حد کھلے دل و دماغ کے سادہ مزاج، محبت کرنے والے اور زندگی کی ہر آزمائش سے خوشبو اور رنگ کشید کرنے والے شخص کی داستان ہے۔" **سلمیٰ صدیقی**

"سفر جاری ہے" نئی نسل خصوصاً وہ نوجوان جو اپنی دنیا آپ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے مشعل راہ اور درس گاہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

علامہ عبد الستار عاصم

"سفر جاری ہے" ایک دلچسپ اور کامیاب تخلیق ہے اور دوسری خودنوشت سوانح عمریوں سے مختلف ہی نہیں منفرد بھی ہے۔ **پروفیسر اشفاق رشید**

"سفر جاری ہے" میں مصنف نے کٹھن آزمائشوں میں اپنے اندر کے تخلیق کار کو زندہ رکھا اور اپنی تخلیق میں اپنے کاروباری تجربات کو پُرکاری سے بیان کیا ہے۔ **قاضی ذوالفقار احمد**

ایک اچھی کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اگر آپ اسے پڑھنا شروع کریں تو چھوڑنے کو دل نہ چاہے۔ سفر جاری ہے ایسی ہی ایک منفرد کتاب ہے۔

ثریا کے ایچ خورشید

"سفر جاری ہے" ایک منفرد آپ بیتی ہے مصنف نے اپنی عملی زندگی اور مشکل مرحلوں کی داستان بغیر کسی لگی لپٹی کے بیان کی ہے۔ **بلقیس ریاض**

"زندگی کا اعمال نامہ یا پھر کتاب زیست ۔۔۔ لیکن یہ ایک مضبوط حقیقت ہے کہ مصنف نے منفرد اور انوکھے انداز میں اردو ادب کے قاری کو ایک ادبی دستاویز تحفے میں دی ہے۔" **طارق شاہین**

Marfat.com

''سفر جاری ہے'' ملک مقبول احمد کی پہلی کاوش ہونے کے باوجود ایک معیاری کتاب ہے۔ یہ ان کی زندگی کی کہانی ہے، جس میں رشتوں کی چاشنی بھی ہے اور رشتوں ہی سے ملنے والی حوصلہ شکنی بھی ہے جسے پڑھ کر قاری ان کی ہمت اور کامیابیوں کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ **(شہزاد منیر احمد گروپ کیپٹن (ر))**

ملک مقبول احمد کی آپ بیتی پر سینکڑوں مضامین لکھے جا چکے ہیں۔ کیونکہ ان کے اسلوب میں ڈپٹی نذیر احمد ایسی سچائی خود بولتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور ان کا رومان ...... اے حمید کے ناولوں کی رومانوی یادوں کی طرح سحر انگیز مہک سے لبریز نظر آتا ہے۔

(صائمہ نورین بخاری)

سفر جاری ہے اس اعتبار سے ایک مختلف کتاب ہے کہ اس کتاب کے لکھنے والے کو ادیب ہونے کا کوئی دعویٰ نہیں لیکن کتاب پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ تحریر پر ملک مقبول احمد کی گرفت جتنی مضبوط ہے، لکھنے پر ایسی دسترس کسی بڑے بڑے جغادری ادیب کو بھی کیا حاصل ہوگی۔ **(محمد آصف بھلی)**

ملک مقبول احمد کی خودنوشت میں الفاظ نگینے کی طرح جڑے ہوئے ہیں، ان کی تحریر میں پہاڑی جھرنوں جیسی روانی اور نغمگی ہے، ہمیں اس کتاب سے یہ سبق ملتا ہے کہ انسان کو مشکلات سے گھبرانے کی بجائے عزم و ہمت کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ **(انوار فیروز)**

ایک اچھی کتاب کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ قاری کے ذہن و دل کو پڑھتے ہی فوراً اپنی گرفت میں کر لے ''سفر جاری ہے'' ایک دلچسپ سوانح عمری ہے جو پڑھنے والے کو نہایت چابکدستی کے ساتھ اپنی طرف متوجہ کراتی ہے۔ **(پروین طارق)**

ملک مقبول احمد نے مصلحتوں سے سمجھوتا کرنے کے بجائے جو کچھ محسوس کیا اور جس کا مشاہدہ کیا، انہیں بے کم و کاست صفحہ قرطاس پر منتقل کر دیا ہے۔ ''سفر جاری ہے'' کو بجا طور پر اُردو آپ بیتیوں کے ذخیرے میں بیش قیمت اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

(ڈاکٹر رفاقت علی شاھد)

سفر جاری ہے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں سادگی بھی ہے اور پرکاری بھی، شگفتگی بھی اور روانی بھی، فصاحت بھی اور بلاغت بھی، سحر بھی ہے اور تاثیر بھی۔ مصنف کو منظر نگاری اور واقعہ نگاری کے فن میں بھی ید طولیٰ حاصل ہے۔

(رئیس الدین رئیس (بھارت))

سفر جاری ہے میں ملک مقبول احمد نے اپنے بارے میں وہ سب واقعات، تجربات، جگ بیتی و ہڈ بیتی، خاندانی کوائف و مرحلہ اور ترقی کے تمام کوائف جمع کر دیئے ہیں جو کسی بھی سوانح یا خود نوشت سوانح میں ہونے ضروری خیال کیے جاتے ہیں۔

(پروفیسر سید شبیر حسین شاہ زاھد)

''سفر جاری ہے'' کسی پبلشر کی پہلی خودنوشت ہے۔ اس آپ بیتی پر پروفیسر جمیل آذر جیسے جید ادیب نے ''ہمراہ نور و شوق'' کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب لکھ ڈالی ہے۔ ''سفر جاری ہے'' اردو آپ بیتی میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ **(شفیع ھمدم)**

ملک صاحب نے علم و ادب کے فروغ کو اپنا مشن بنایا اور کامیاب رہے۔ موجودہ عہد میں اردو میں جو سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں ان میں ملک مقبول احمد کی آپ بیتی منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ ''سفر جاری ہے'' ایک ایسا نام ہے، جس کے اندر کئی حقیقتیں سموئی ہوئی ہیں۔ **(صابر آفاقی)**

''سفر جاری ہے'' پڑھ کر میں نے یہی سبق حاصل کیا ہے کہ محنت کبھی ضائع نہیں ہوتی اور زندگی نام ہے، جہد مسلسل کا اور عمل پیہم کا۔ میں نے اس کتاب کو نہ صرف دلچسپ، خوشگوار اور انبساط انگیز پایا، بلکہ ایک راہنمائی کرنے والی تصنیف بھی پائی۔

(عنبرین تبسم شاکر)

''سفر جاری ہے'' ایک ایسی آپ بیتی ہے جس میں حقانیت کے غنچے چٹکتے ہیں اور صداقت کی باد بہاری خرام ہے۔ یہ آپ بیتی تو ایک جگ بیتی ہے جس کے کردار چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں۔ سچ جانیے یہ کئی سیلف میڈ انسانوں کی آپ بیتی ہے۔

(گوھر ملسیانی)

Marfat.com

ملک مقبول احمد ایک سیلف میڈ انسان ہیں انہوں نے زندگی کے نشیب وفراز کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ "سفر جاری ہے" ان کی زندگی کے سفر کی کہانی ہی نہیں بلکہ یہ ایک شخص کے پتھر سے ہیرا بننے کی کہانی ہے۔ کتاب کیا ہے انکشافات کا ایک بوطیقا ہے۔

(ڈاکٹر معصوم شرقی (بھارت))۔

"سفر جاری ہے" میں ملک مقبول احمد نے اپنا زندگی نامہ پیش کیا ہے جو ان کی محنت ومشقت اور عملی زندگی میں کامیابیاں حاصل کرنے کی داستان ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی سوانح افسانے سے کم دلچسپ نہیں۔ **(نوائے وقت)**

مصنف نے قاری پر کہیں بھی اپنی علیت کا بوجھ نہیں ڈالا، جو بات وہ کہنا چاہتے ہیں، وہ انہوں نے بغیر کسی رکھ رکھاؤ کے کہہ ڈالی ہے۔ **قائم نقوی**

"کسی ناشر کی میری نظر سے گزرنے والی یہ پہلی سوانح حیات ہے جو کئی بڑے ادیبوں کی لکھی سوانح حیات پر بھاری ہے۔" **ڈاکٹر کیول دھیر**

ملک مقبول احمد کی اس کتاب کے انداز نگارش نے ناشرین اور مصنفین کے درمیان ایک صحت مند مقابلے کی فضا بھی پیدا کردی ہے۔

پروفیسر تنویر حسین

"سفر جاری ہے" میں مصنف نے گود سے لے کر عہد حاضر تک اپنی عملی زندگی کے تمام تجربات کو مختصر قرطاس پر منتقل کر کے قاری کو ایک انمول تحفہ پیش کیا ہے۔ **کنول عاصم**

"سفر جاری ہے" اس اعتبار سے ایک مختلف کتاب ہے کہ یہ سفرنامہ بھی ہے اور آپ بیتی بھی اسے پڑھ کر پورے عہد کی تہذیبی تاریخ سامنے آجاتی ہے۔

ریحانہ قمر

"سفر جاری ہے" ملک مقبول احمد کے تخلیقی سفر کا بھی آغاز ہے، میری خواہش ہے وہ اس سفر کو جاری رکھیں تاکہ ہم جیسے قارئین کو سچ اور پورا سچ پڑھنے کو ملتا رہے۔ **عمرانہ مشتاق**

"سفر جاری ہے" میں مصنف نے نہ صرف اپنے اردگرد کے ماحول کی عکاسی کی ہے بلکہ اس وقت کے گلے سڑے سماج کا بڑی چابکدستی سے نقشہ کھینچا ہے۔ **قمر یورش**

Malik Maqbool Ahmed has managed to pen a gripping account with utmost candidness. It not only reflects his own personality but also serves as a running commentary on the cultural and literary activities of his times. Ashfaq Naqvi

---

This scribe has witnessed the fact that Malik Maqbool has also got himself educated through the untraditional means as well, through experience and through the company of the literate ones.

Amjad Pervaiz

His memories do not include a record of his achievement — they are a saga of the life and development of an undoubtedly brilliant publisher.

Rabbia Arshad

Marfat.com

''ملک مقبول احمد کی سوانح حیات یہ ثابت کرتی ہے کہ عقل سلیم اور دانش کا تعلق کالج یا یونیورسٹیوں کی ڈگری پر منحصر نہیں بلکہ یہ اللہ کا عطیہ ہوتا ہے۔'' چیف جسٹس آف پاکستان (ر) شیخ ریاض احمد

''ان کا اسلوب نہایت دلچسپ ہے، ان کی زبان و بیان اور طرز تحریر پر ادبی رنگ غالب ہے جو ان کے اعلیٰ ذوق کی عکاسی کرتا ہے۔''
ڈاکٹر صفدر محمود (مؤرخ پاکستان)

''یہ کتاب محض آپ بیتی نہیں بلکہ اس میں جگ بیتی اور کتاب کی کہانی بھی شامل ہے۔ اس کتاب کی اشاعت پر ملک مقبول احمد کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔'' ڈاکٹر وحید قریشی

''ملک مقبول احمد نے اپنی آپ بیتی لکھ کر اہل نظر کے سامنے اپنی زندگی کی کہانی پیش کر دی ہے اور فیصلہ زمانے کی تیز نگاہی پر چھوڑ دیا ہے۔'' ڈاکٹر وزیر آغا

اس کتاب میں مصنف نے اپنی بھرپور جدوجہد کو بڑی خوبصورتی سے رقم کرنے کا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔'' حمید اختر

''خود آگہی ایک ایسی منزل ہے جہاں صرف وہ ہستیاں پہنچ پائیں جو ہمت و استقلال کا پیکر تھیں اس منزل پر پہنچنے والی ان ہستیوں میں ''سفر جاری ہے'' کے مصنف ملک مقبول احمد شامل ہیں۔''
جسٹس (ر) عباس خان

''ایک شخص کے پتھر سے ہیرا بننے کی کہانی ہے، خودنوشت کا ہر صفحہ ان کے کثرت مطالعہ و مشاہدہ کا آئینہ دار ہے۔'' علی سفیان آفاقی

''اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں زیب داستان سے کام نہیں لیا گیا۔ لیکن اس میں افسانے جیسی لطافت موجود ہے۔''
ڈاکٹر انور سدید

''سفر جاری ہے'' ایک اعلیٰ پائے کی کتاب ہے اور ملک مقبول احمد کی کہانی ہر شخص کی کہانی بن سکتی ہے ہر شخص کو آگے بڑھا سکتی ہے اور کامیابی کا چہرہ دکھا سکتی ہے۔'' مجیب الرحمن شامی

''مقبول صاحب نے اپنے [illegible] مشاہدات اور تجربات ایسے انداز میں لکھے ہیں کہ دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ یہ تجربات لوگوں کے لیے باعث نفع ہو سکتے ہیں۔'' [illegible]

''یہ گونا گوں شخصی مشاہدات اور تجربات کے ساتھ ساتھ اس دور کے ادیبوں اور ادبی فضا کا احوال اور منظر نامہ بھی ہے۔ جس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔'' [illegible]

''یہ کتاب دلچسپ واقعات، لطیف جذبات، حسین تجربات سے مالا مال ہے، اس کتاب کا ہیرو زاہد خشک نہیں وہ زندگی کی تمام رعنائیوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔'' [illegible]

''کتاب کے مطالعہ کے دوران میں بعض جملوں نے مجھے چونکا دیا، ایسے جملے کوئی عام نثر نگار، جب تک اس کے اندر تخلیق کی شمع روشن نہ ہو، ہرگز نہیں لکھ سکتا۔'' [illegible]

''واہ کیا کتاب لکھی ہے آپ نے، اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ پھر میں کیا لکھوں گا تو آپ سے ضرور کہتا کہ اسی طرح کی ایک آپ بیتی میری بھی لکھ دیجئے۔'' [illegible]

''اپنی شخصیت اور علم پروری کی داستان ملک مقبول احمد نے جمالیاتی ذوق کی آئینہ داری کے ساتھ سنائی ہے۔ [illegible] میں بہت کچھ سیکھنے جاننے کا گوناگوں برق تجلی ہے۔'' [illegible]

''سفر جاری ہے'' ملک مقبول احمد کا گراں قدر علمی، ادبی کارنامہ ہے۔ یہ کتاب بلاشبہ اردو کے سوانحی ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ اس سے کوئی بھی ادبی مورخ صرف نظر نہیں کر سکتا۔''
پروفیسر [illegible]

''سفر جاری ہے'' میں ملک مقبول احمد نے دیہی زندگی کی منظر کشی اس مہارت سے کی ہے کہ پریم چند اور سدرشن کے افسانوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔'' ڈاکٹر [illegible]

''سفر جاری ہے'' میں اظہار کی زبان سادہ اور معصوم ہے۔ معلوم ہوا کہ مصنف شعر فہم بھی ہیں۔ اچھے شعر برمحل استعمال کیے گئے ہیں۔''
[illegible]

''سفر جاری ہے'' کے آئینہ خانے میں بہت سی معلومات ایک تسلسل کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ یوں اسے ایک مکمل خودنوشت سوانح عمری کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔'' پروفیسر [illegible]

''مصنف کے مشاہدہ میں گہرائی، ظرف میں وسعت اور انداز بیان میں دلکشی ہے۔ سفر جاری ہے سعی پیہم اور جہد مسلسل کی داستان ہے۔'' [illegible]

Marfat.com